ہندوستان میں

شیعیت اور عزاداری

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی

مصنفہ کی دیگر کتابیں

۱۔ نظر نظر کے چراغ
۲۔ موسم بھیگی آنکھوں کا
۳۔ حرف حرف چہرے
۴۔ انوار سہیلی کی کہانیاں
۵۔ ملا وجہی اور انشائیہ
۶۔ سردار جعفری فن اور شخصیت
۷۔ انمول کہانیاں
۸۔ اردو شاعری میں تذکرہ فاطمۃ الزہرہؑ
۹۔ فارسی ادب کا مطالعہ
۱۰۔ میری درس گاہ
۱۱۔ سلام
۱۲۔ کرشن چندر ممبئی اور اردو کہانیاں
۱۳۔ معاصر اردو ناول
۱۴۔ نوائے سروش
۱۵۔ مراٹھی ادب۔ ایک مطالعہ
۱۶۔ علی سردار جعفری۔ ایک مطالعہ
۱۷۔ خواجہ حافظ شیرازی۔ احوال و آثار
۱۸۔ اگلی رت کے آنے تک
۱۹۔ بچوں کے سردار جعفری
۲۰۔ بچوں کے یوسف ناظم
۲۱۔ اردو شاعری پر شیعی اثرات

مدینۃ العلمؐ

اور

بابِ مدینۃ العلمؑ

کی نذر

ہمارے جسم پہ زخموں کے پھول کیوں نہ کھلیں
کہ یہ بنا ہی ہوا خاکِ کربلا کا ہے

رفیعہ شبنم عابدی

باب اول

باب دوم

باب سوم

باب چہارم

آصف جاہی عہد

۲۔ دہلی اور عہد مغلیہ

۳۔ اودھ اور نوابین کا عہد

۴۔ شمالی ہند (اتر پردیش)

جون پور، امروہہ اور نوگانواں سادات (ضلع مراد آباد)
جائس، ضلع بجنور، جلالی ضلع علی گڑھ، بلور، زید پور ضلع بارہ بنکی
جلال پور ضلع فیض آباد، سندیلہ ضلع ہردوئی، گونڈہ، صفی پور،
آگرہ، الہ آباد، بنارس، بہرائچ

۵۔ کشمیر

۶۔ پنجاب و سندھ

۷۔ ہماچل پردیش (شملہ وغیرہ)

۸۔ گجرات اور راجستھان

۹۔ مدھیہ پردیش
(بھوپال، گوالیار، جھانسی اور برہانپور وغیرہ)

۱۰۔ بنگال و بہار
(کلکتہ، پٹنہ، کچھوہ، گیا وغیرہ)

۱۱۔ اڑیسہ
(جھارکنڈ وغیرہ)

۱۲۔ میسور

۱۳۔ مہاراشٹر
(پونہ، اورنگ آباد، ناگپور، کامٹی، احمد نگر، شولاپور، بیجاپور اور ممبئی وغیرہ)

۱۴۔ مدراس

عرضِ ناشر

کرشن چندر پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی ادب کی دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔ وہ نہ صرف ایک مشہور شاعرہ اور ادیبہ ہیں بلکہ ایک نقاد اور محقق بھی ہیں۔ موصوفہ کی تقریباً پچیس (۲۵) کتابیں مختلف موضوعات پر منظر عام پر آ چکی ہیں۔ لیکن ان میں سب سے اہم وہ موضوع ہے جو انھوں نے اپنے مقالے کے لیے آج سے تقریباً ستائیس (۲۷) سال پہلے منتخب کیا تھا۔ اس وقت جب کہ اس موضوع پر کوئی تحریر ہندوپاک میں کہیں نظر نہیں آتی۔ تقریباً ۲۰ سال سے یہ مقالہ اشاعت کا منتظر تھا لیکن اس کی ضخامت کے باعث فوراً منظر عام پر نہ آ سکا۔

حسن پبلی کو خوشی ہے کہ زیر نظر کتاب ''ہندوستان میں شیعیت اور عزاداری'' آپ کے ہاتھوں میں ہے جو ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی کے پی۔ ایچ۔ ڈی کے تحقیقی مقالے کی پہلی جلد ہے۔ یہ تحقیقی مقالہ تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں چار ابواب ہیں اور ہر باب کو پوری ذمہ داری کے ساتھ لکھا گیا ہے جس میں بہت سے مباحث ہیں۔ تاریخ کے ہر پہلو پر نظر رکھی گئی ہے۔ اس کتاب کا موضوع بحث خاص کر ہندوستان میں شیعیت کی ترویج، ترقی اور اس کی تاریخ ہے۔ مصنف نے اسے اپنی انتھک محنت اور کوشش سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے۔ انھوں نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ ہر موضوع پر بحث کی ہے اور قاری کو پورا پورا مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے۔

بہت سے لوگوں کو یہ موضوع ہی بڑا کھٹکتا لگتا تھا لیکن حقیقت سے آنکھیں نہیں موندی جا سکتیں۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی آپ کے سامنے ہے۔ یہ مقالہ تقریباً بیس سال سے معرض التوا میں پڑا ہوا تھا اور یہ سوچ رکھا تھا کہ اتنی ضخیم کتاب جو تقریباً دو ہزار صفحات پر مشتمل ہے ایک بڑا مشکل مرحلہ اسے شائع کرنے میں ہوگا۔ بہت سے لوگوں کے اصرار پر یہ طے کیا گیا کہ اس مقالے کو تین الگ الگ حصوں میں شائع کیا جائے۔ لہٰذا یہ پہلا حصہ ہے جس کا عنوان ''ہندوستان میں شیعیت اور عزاداری'' ہے۔

اختر عابدی

۸ رجون ۲۰۰۳ء

پیش گفتار

غالباً بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی کی بات ہے۔ناچیز برہانی کالج آف آرٹس اینڈ کامرس، ممبئی میں تدریس کے فرائض انجام دے رہی تھی اور پی۔ایچ۔ڈی کے لیے کسی ایسے موضوع کی تلاش میں سرگرداں تھی، جس پر اب تک تحقیقی کام نہ کیا گیا ہو۔اسی دوران ماہ نامہ 'آج کل' اور ماہ نامہ 'کتاب نما' کی وہ بہلو گرانی نظر سے گزری جو اس وقت تک کی ہندوستان بھر کی یونیورسٹیوں میں اردو ادب پر ہونے والی تحقیقی کارگزاریوں کی فہرست پر مشتمل تھی۔ چند عنوانات پر آ کر نظر کچھ ٹھہر سی گئی۔ مثلاً اردو میں سکھوں کا حصہ، اردو میں ہندوؤں کا حصہ، اردو ادب اور وہابی تحریک، اردو ادب اور مارکسزم وغیرہ وغیرہ۔ اچانک ہی ذہن میں ایک کوندا سا لپکا اور خیال آیا کہ ان تمام تحریکات و نظریات کا اثر تو ایک مخصوص عہد اور ادب کے ایک مخصوص سرمایے پر پڑا لیکن وہ عقاید و نظریات، جنھوں نے ابتدا سے تا حال اردو ادب پر اپنے اثرات مرتسم کیے انھیں کیوں نہ موضوع بنایا جائے۔ یہی سوچتے ہوئے ذہن میں ایک عنوان آیا "اردو ادب میں شیعی اثرات" چونکہ موضوع بہت وسیع تھا، لہٰذا اسے سمیٹ کر صرف شاعری تک محدود کر دیا اور ممبئی یونیورسٹی سے استاد محترم ڈاکٹر آدم شیخ کی نگرانی میں 'اردو شاعری میں شیعی اثرات' کے موضوع سے پی۔ایچ۔ڈی کے لیے اپنا نام رجسٹرڈ کیا۔ حالانکہ یہ موضوع بھی کوئی کم وسعت کا حامل نہ تھا۔ ابتدا سے تا حال اردو شاعری پر ان اثرات کا جائزہ لیا جا سکتا ہے اور اس کا اظہار بلا امتیاز مذہب و مسلک اردو شعرا نے بڑی فراخ دلی سے کیا ہے۔ ان میں سے اردو شعرا کے تین گروہ سامنے آتے ہیں۔ ایک تو وہ شعرا جن کا شمار اردو شاعری کے اساتذہ میں ہوتا ہے اور جو بذات خود شیعہ عقائد رکھتے تھے، لہٰذا انھوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے عقائد کا اظہار اپنی شاعری میں کیا جس کی ابتدا قلی قطب شاہ ہی سے ہو جاتی ہے اور پھر ایک طویل فہرست ہے جو سودا، میر، میر حسن، غالب، ناسخ، میر انیس، وغیرہ سے ہوتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ دوسرا گروہ ان مسلمان

شعرا کا ہے جنھوں نے اساتذہ کی تقلید میں ان تمام مضامین کو اپنی شاعری میں داخل کیا جن کا تعلق شیعیت سے رہا۔ تیسرا گروہ ان غیر مسلم شعرا کا ہے، جنھوں نے اردو شاعری میں ان تمام علامات و استعارات کو جو شیعیت اور خاص طور پر کربلا سے اخذ کی گئی تھیں، استعمال کیا اور آج کے اس پُر آشوب دور میں سانحۂ کربلا بطور استعارہ اتنا مقبول ہو چکا ہے کہ گوپی چند نارنگ جیسا نقاد اس پر اظہار خیال کیے بغیر نہ رہ سکا۔

میری خوش قسمتی ہے کہ اس موضوع پر ناچیز کی نظر آج سے ۲۷ سال پہلے یعنی ۱۹۷۶ء ہی میں پڑ چکی تھی۔ اس وقت تک ہندو پاک میں اس موضوع پر کوئی خاطر خواہ تنقیدی و تحقیقی سرمایہ موجود نہ تھا۔ جب اس کام کی ابتدا کی تو مواد اتنا بڑھتا گیا کہ مقالے کو کئی جلدوں میں تقسیم کرنا پڑا۔ بقول پروفیسر سید محمد عقیل (الٰہ آباد) جو اس مقالے کے ریفریز میں سے تھے، "یہ ہندوستان بھر میں اردو میں پی۔ایچ۔ڈی کا طویل ترین مقالہ ہے۔" یہ مقالہ جو تقریباً دو ہزار صفحات پر مشتمل تھا، تلخیص کر کے سولہ سو صفحات پر کر چکی ہوں اس کے باوجود اس کو تین جلدوں میں تقسیم کرنا پڑا۔ پہلی جلد ہندوستان میں شیعیت اور عزاداری کی تاریخ، پر مشتمل ہے۔ دوسری جلد میں اردو شاعری کی وہ تمام اصناف سخن شامل ہیں جو کسی نہ کسی واسطے سے شیعی عقائد و اثرات کی حامل ہیں۔ مثلاً غزل، نظم، مثنوی، واسوخت، ریختی، قصیدہ، رباعیات و قطعات وغیرہ۔ تیسری جلد میں وہ تمام اصناف شاعری شامل ہیں جو براہ راست شیعی عقائد و اثرات سے وجود میں آئی ہیں۔ مثلاً مرثیہ، ہرسیہ، سلام، نوحہ، ماتم، منقبت وغیرہ۔ ان تمام اصناف کا جائزہ قلی قطب شاہ سے لے کر تا حال تمام شعرا کے ہاں لیا گیا ہے۔

مقالہ اتنا طویل تھا کہ ایک ہی جلد میں اسے شائع نہیں کیا جا سکتا تھا اور تین الگ الگ جلدوں میں، مَیں انھیں شائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ حالانکہ چند مخلص حضرات نے اس کی پیش کش بھی کی تھی۔ مثلاً مولانا عقیل الغروی صاحب اور شریف الحسن نقوی صاحب (سابق سکریٹری دہلی اردو اکادمی) اس کی پہلی جلد شائع کرنے کی خواہش ظاہر کر چکے تھے۔ بہر حال مقالہ یوں ہی پس و پیش میں پڑا رہا یہاں تک کے بیس بائیس سال گزر گئے۔ اس دوران میرے اس عنوان سے ترغیب پا کر ہندو پاک میں مختلف لوگوں نے کئی مقالے تحریر کیے جو منظر عام پر بھی آئے۔ کچھ لوگوں نے تو اس غیر مطبوعہ مقالے سے استفادہ کر کے مضامین تحریر کیے اور ڈکار تک نہ لی اور اس کام میں

میری اولیت پسِ پشت چلی گئی۔ مجھے اس کا دکھ نہیں کہ میں اپنے اس کام کو حرفِ آخر بھی تصور نہیں کرتی۔ ظاہر ہے تحقیق کا عمل دشوار گزار بھی ہے، وقت طلب بھی اور ارتقا پذیر بھی۔ اب جو نئی تحقیقات سامنے آئی ہیں اور آتی جا رہی ہیں، ممکن ہے وہ میرے چند تحقیقی نظریات کی تردید کریں۔ بہر حال اس کاوش کو اہلِ علم و ادب تک پہنچانا ضروری محسوس ہوتا تھا۔ تا کہ اپنی خامیوں یا کمیوں سے واقف ہو سکوں۔ اسی غرض سے اس مقالے کی پہلی جلد زیرِ نظر کتاب کی شکل میں آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ مجھے نہیں پتہ، میں کہاں تک اس موضوع سے انصاف کر پائی ہوں۔ اپنے بارے میں صرف اتنا ہی کہوں گی کہ میں نہ کوئی عالمہ ہوں، نہ ذاکرہ۔ اپنے اڑتیس سالہ تدریسی تجربے کے باوجود عمر بھر اپنے آپ کو ادب کی ایک طالبہ ہی سمجھتی رہی ہوں۔ یوں تو مختلف ادبی اصناف پر کم و بیش میری ۲۴ کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں لیکن اس کتاب کی نوعیت ان سب سے الگ ہے کہ اس دشت کی سیاحی ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ میں نے بھی بہت ڈرتے ڈرتے اس وادی میں قدم رکھا ہے۔ اہلِ علم ہی میری اس جرأت کا صحیح اور سچا احتساب کر سکتے ہیں البتہ دو حضرات کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض اولین سمجھتی ہوں ایک خطیب اہلِ بیت مولانا عباس رضوی (مرحوم) جنھوں نے پدرانہ شفقت کے ساتھ اپنی ذاتی لائبریری سے استفادہ کرنے کا موقع عطا فرمایا۔ دوسرے جناب محمود سروش (مرحوم) جن کے ساتھ صرف ایک نشست میں مَیں نے بہت کچھ سیکھا اور ان کے ذخیرۂ کتب سے وہ نایاب کتابیں پڑھنے کو ملیں، جنھیں وہ بہت کم کسی کو عنایت کرتے تھے۔ میں سب سے زیادہ ممنون اپنے شوہر سید حسن اختر عابدی کی ہوں کہ جنھوں نے خانہ داری کی ذمہ داریوں سے مجھے بری کر کے اتنا وقت فراہم کر دیا کہ اس موضوع پر میں اپنی کاوش کا احاطۂ تحریر میں لا سکی۔ برادرم الیاس شوقی کا شکریہ ادا نہ کرنا بھی ناانصافی ہوگی کہ جنھوں نے بڑی لگن کے ساتھ اس کتاب کی اشاعت کی ذمہ داری قبول کی۔

یاد رہے اس کتاب میں صرف اُنہی پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے جن کا تعلق میرے تحقیقی مقالے سے تھا، ورنہ شیعیت اتنی مختصر نہیں کہ چند محدود صفحات میں سما جائے۔

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی
(کرشن چندر پروفیسر و صدر شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی)

باب اول

شیعیت کی ابتدا اور اس کا ارتقا

الف : شیعیت کیا ھے؟

زبان و ادب کی دنیا میں بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو بظاہر بڑے عام، معمولی، آسان اور فرسودہ نظر آتے ہیں لیکن جب ان کی معنویت کی طرف توجہ جاتی ہے تو وہ اپنے اندر خود ایک وسیع و عریض جہان سمیٹے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور جن کا مطلب سمجھانا آسان ہوتے ہوئے بھی بڑا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ لفظ ''شیعیت'' بھی ایسا ہی ہے، بظاہر بڑا سطحی، فرسودہ، عام، پامال لیکن بباطن بہت گہرا، وسیع، پہلو دار اور ہمہ گیر۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ''شیعہ'' اور ''شیعیت'' وہ الفاظ ہیں جن کی تشریح اتنے انداز اور اتنے معنوں میں کی گئی ہے کہ اگر صرف ان تشریحات کو جمع کر لیا جائے تو ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے اور پھر بھی اس کا مطلب تشنہ ہی رہ جائے گا۔ بقول غالبؔ ۔

ہے یہ وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہ ہوا

''شیعہ'' مسلمانوں کا وہ بدقسمت یا خوش قسمت فرقہ ہے جس کے عقائد کے متعلق بے انتہا اور بے شمار نظریات و تصورات کی تشہیر کی گئی ان میں حقائق اور راست گوئی کے علاوہ کچھ غلط بیانیاں،

افترا پردازیاں اور اتہام تراشیاں بھی شامل ہیں۔ اختلافی بحث وتمحیص کا شکار جتنا اس فرقے کو ہونا پڑا شاید ہی مسلمانوں کے کسی اور فرقے کو ہونا پڑا ہو اور آج ظہور اسلام کے چودہ سو برس کی تکمیل پر بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ بہر حال پھر بھی مختلف علماء و ادباء اور مؤرخین و محققین کی تشریحات وتوصیفات کا ذکر کیے بغیر اس لفظ کی ماہیت ونوعیت سے گزرا نہیں جاسکتا۔

شیعوں کے مختلف نام ہیں۔ کوئی انہیں رافضی کہتا ہے، کوئی بدعتی بتلاتا ہے اور کوئی کافر۔ کسی کے ہاں محبت علیؑ شیعیت کی دلیل ہے تو کوئی محبت علیؑ کے ساتھ ساتھ ''بغض معاویہ'' کو شیعیت کی سند قرار دیتا ہے، کوئی علیؑ کی تفضیلیت کو تشیع کا نام دیتا ہے اور کسی کی نظر میں شیخین پر فضیلت دینا شیعیت ہے اور کسی کی نگاہ میں تمام صحابہ پر علیؑ کی فضیلت شیعیت کا ثبوت ہے، غرضیکہ ؎

جتنے منہ اتنی ہی باتیں ہیں بڑھے کیوں نہ جنوں
سب نے دیوانہ بنا رکھا ہے دیوانے کو

۱۔ شیعہ کے لغوی معنی و تشریح:

اس صورت میں یہ لازم ہوجاتا ہے کہ ہم تاریخ ولغت کی روشنی میں اس لفظ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

۱۔ لغوی لحاظ سے لفظ ''شیعہ'' عربی لفظ ''شاع'' اور ''شیاعا'' سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں تقلید کرنا، کسی شخص کا دوست یا اس کا مقلد اس کا شیعہ ہے۔ پیغمبر اسلام نے اس لفظ کو سب سے پہلے امام اوّل حضرت علیؑ کے عقیدت مندوں کے لیے استعمال کیا:

''اے علیؑ! قیامت کے دن تم اور تمہارے شیعہ حق کے راستے پر ہوں گے اور کامیاب ہوں گے'' (اردو ترجمہ)

پھر اس کے بعد یہ لفظ حضرت علیؑ (کے ماننے والوں کے لیے) اصطلاحاً مخصوص ہوگیا:

۲۔ حجۃ الاسلام محمد حسین آل کاشف الغطا اپنی کتاب "اصل الشیعہ واصولہا" میں فرماتے ہیں:

''ارباب لغت بھی اس حقیقت کے حامی ہیں۔ مشہور فرہنگ ''نہایہ'' اور ''لسان العرب'' اٹھا کر دیکھیے۔ شیعہ کے معنی ہی یہ ملیں گے کہ یہ اس فرقے کا

اسم خاص ہے، جو علیؑ اور اولادِ علیؑ کا چاہنے والا اور اس کا پیروی کرنے والا ہو۔

لیکن صرف چاہنا ہی کافی نہیں بلکہ التزام کے ساتھ اقتداء اور اتباع کی خصوصیت ہونا بھی ضروری ہے ورنہ شیعیت کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔

۳۔ محمد طاہر گجراتی مجمع ''بحار الانوار'' جلد اول صفحہ ۲۲۵ پر لغتِ شیعہ میں لکھتے ہیں:

"واصلہ الفرقہ من الناس و یقع علیٰ الواحد وغیرہ بلفظ واحد و غلب علیٰ کل من تولی علیا و اہل بیتہ حتیٰ اختص بہ و جمعہ شیع من المشایعتہ والمتابعتہ والمطادعتہ"

(اور یہ لفظ واقع ہوتا ہے واحد وغیرہ پر بصیغۂ واحد۔ اور غالب ہے یہ لفظ ہر اس شخص پر جو دوست ہو حضرت علیؑ اور ان کے اہل بیت کا، حتیٰ کہ مخصوص ہے اسی کے ساتھ (یعنی اور کسی کو شیعہ نہیں کہہ سکتے) اور اس کی جمع ''شیع'' ہے مشایعہ سے اور معنی پیروی کرنا اور فرماں برداری کرنا ہے۔)

۴۔ عبدالرحیم ابن عبدالکریم صفی پوری "منتہی الادب فی اللغات العرب" جلد ثالث مطبوعہ لاہور، صفحہ ۵۱۳ میں تحریر کرتے ہیں:

"شیعۃ الرجل بالکسر۔ پیروان یاران مرد وگروہ واحد وتثنیہ وجمع و ذکر و مؤنث دروی یکساں است وگروہے از ہواداران علیؑ و فاطمہؑ واولاد ایشاں رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ وھو اسم لھم خاصاً انتہیٰ بلفظہ"

۵۔ مولوی محمد غیاث الدین ''غیاث اللغات'' مطبوعہ کشوری صفحہ ۲۵۸ میں لکھتے ہیں:

''شیعی بالکسر و ہر دو یائے معروف، منسوب بہ شیعۂ علیؑ ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ از اب الالباب انتہیٰ بحروفہ''

۶۔ لغات فیروزی میں تحریر ہے:

''شیعہ قوم گروہ مسلمانوں کا وہ فرقہ ہے جو حضرت علیؑ کو مانتا ہے اور اصحاب ثلاثہ کو نہیں مانتا۔ شیعی منسوب بہ شیعۂ علیؑ۔

۷۔ قاموس میں لکھا ہے:

"شیعہ کسی کے تابعدار اور مددگار کو کہتے ہیں یہ علیؑ اور ان کی اہل بیت کے لیے مخصوص ہو چکا ہے" منجد میں بھی اسی طرح وضاحت کی گئی ہے۔

۸۔ علامہ سید شریف جرجانی اپنی کتاب "تعریفات" صفحہ ۸۸ پر قمطراز ہیں:

"شیعہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے حضرت علیؑ کی پیروی کی جن کا یہ قول ہے کہ حضرت علیؑ بعد رسول اللہ ﷺ امام ہیں اور جن کا اعتقاد یہ ہے کہ امامت حضرت علیؑ اور ان کی اولاد سے باہر نہیں ہے۔ (بحوالہ تاریخ وعقائد شیعہ امامیہ از مولانا فیاض حسین مبارکپوری)

۹۔ مُلا محمد باقر، مصنف "شعلہ طور" کا خیال ہے:

"دوست علیؑ اور خاندان نبی ﷺ وہی ہیں جو ملقب ہیں بہ شیعہ۔ اور آنجناب کو امام وافضل مانتے ہیں اور پیروکار ہیں اس لیے یہ نام ان کے لیے مخصوص ہے اور دوسرے فرقے والے بھی اگرچہ زبانی دعوے محبت اور اطاعت آنجناب کرتے ہیں مگر چونکہ پیروی واطاعت سے باہر ومخالف ومعاند ظاہر ہیں لہٰذا ان پر اس نام کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔"

۱۰۔ جان نومن ہولسٹر اپنی کتاب میں گولڈزہر کے حوالے سے شیعیت کی تشریح یوں کرتا ہے:

"Goldziher has suggested that word translated sect was orignally "Shu,ab" branches which only gradually came to have the meaning of firqaa, division" (Shias of Islam, page no. 3)

گولڈزہر کا خیال ہے کہ اس لفظ (شیعہ) بمعنی فرقہ کی اصل "شعب" (شاخیں) جو دھیرے دھیرے فرقہ یا جماعت کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔

ایک اور خیال یہ بھی ہے:

The Word Shia came from a root "sha,a" (شاع) meaning to follow, to confirm with, to obey, signifying therefore, a group of followers or a party"

(لفظ شیعہ کی اصل شاع ہے جس کے معنی ہیں، پیروی کرنا، معتقد ہونا، تقلید کرنا یا تابعداری کرنا۔ لہٰذا یہ ایک جماعت یا مقلدین کے ایک مخصوص گروہ کی نمائندگی کرتا ہے۔) (ایضاً)

نکلسن کے حوالے سے ہولسٹر آگے چل کر اس لفظ کی وضاحت یوں کرتا ہے:

"The Muslim community had remained more or less united until the death of Uthman but it then became divided into two distinct parties the Shia,at-i-Ali and the Shia,at-i-Muawiya. When Muawiya was recognised as the Khalifa, the Shia,at-i-Ali contracted now to Shia remained. Since then the term Shia has itself came to signify sect.

ملت اسلامیہ حضرت عثمان کی وفات تک کم وبیش متحد تھی لیکن اس کے بعد دو نمایاں گروہوں میں تقسیم ہو گئی ایک شیعیان علیؑ اور دوسرے شیعیان معاویہ۔ جب معاویہ خلیفہ کی حیثیت سے متمکن ہوا تو بقیہ شیعہ سمٹ کر شیعیان علیؑ رہ گئے اور تب سے یہ اصطلاح ایک مخصوص فرقے کی علامت بن گئی۔

(A Litrary History of the Arabs by Nicholson R.A. page 213)

۲۔ شیعہ پیروان علیؑ:

نکلسن کا خیال کہاں تک صحیح ہے۔ نیز یہ سوال کہ حضرت عثمان سے پہلے یہ لفظ رائج تھا یا نہیں اس پر آگے چل کر بحث کی جائے گی، فی الحال تو ہمیں صرف دیکھنا ہے کہ جس کسی نے بھی اس کی تشریح کی ہے، لفظ شیعیت کے معنی پیروی کرنے کے بتائے ہیں اور شیعوں کو پیروان علیؑ ہی سے منسوب کیا ہے یعنی یہ اصطلاح اپنے خصوص کے ساتھ صرف حضرت علیؑ کے پیروؤں کے لیے استعمال ہوتی رہی ہے

چنانچہ جان ہولسٹر ابن حزم کے حوالے سے شیعیت کی تعریف میں رقمطراز ہے:

He, who agrees with the Shi,ites that Ali is the most excellent of men after the Prophet and that he and his descendents after him, are

wortheir of the Imamate than anyone, is a Shi,ite, though he differs from them in all over matters regarding which Muslims are divided in their openions. He, however, who differs from them regarding the above mentioned points, is no Shia,ite.

(وہ جو شیعوں کی اس بات سے اتفاق کرے کہ پیغمبرؐ کے بعد حضرت علیؑ ہی افضل ترین انسان ہیں اور وہ اور ان کی اولاد ہی دوسروں کے مقابلے میں امامت کی مستحق ہے، شیعہ ہے۔ چاہے وہ ان دیگر تمام معاملات میں ان سے قطعی اختلاف رکھتا ہو جن کی وجہ سے مسلمان مختلف نظریوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ وہ جو مذکورہ بالا امور میں ذرا بھی ان سے اختلاف رکھے شیعہ نہیں ہے۔

(Shia of India-by John Hollister, page no. 32)

ابن حزم کے اس نظریے سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ علیؑ اور اولادِ علیؑ کی افضلیت کا اقرار ہی شیعیت ہے چاہے دیگر امور میں کتنا ہی اختلاف پایا جائے اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ شیعوں کا بنیادی عقیدہ محض یہ ہے کہ حضرت علیؑ پیغمبر اسلام کے بعد افضل ترین انسان ہیں اور ان کے بعد ان کی اولاد۔

محمد حسن قہبسی کی کتاب کے فارسی ترجمے "گرایش چند شخصیت بزرگ بہ تشیع" کے صفحہ ۳ پر مترجم محمد اشتہاری اپنے مقدمے میں رقمطراز ہیں:

"شیعہ را از آں جہت شیعہ می گویند، چوں پیرو علیؑ و فرزندانِ پاک او کند و در اسلام در ہمہ سیری، قدم بر می دارد کہ پیامبر عظیم الشان اسلام، اسلام واقعی را در ہماں سیر قرار دادہ آنجا کہ فرمود" من شہر علم، علیؑ درآنِ شہر ست ہر کس کہ خواہاں ورود در یں شہر ست باید از درِ آن وارد شود۔ یعنی اگر ایں در را بروی خود بند د یا سراغ در نرود ہرگز نمی تواند رشہر علم نبوت استفادہ کند" یا فرمود "مثل اہل بیت من ہمانند کشتی حضرت نوحؑ است کہ کسے کہ سوار برآں شود، نجات یابد و کسے کہ تخلف کند، غرق شود"

(شیعوں کو اس وجہ سے شیعہ کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت علیؑ اور ان کے

فرزندانِ پاک کے پیرو ہیں اور اسلام میں اس مسلک کی پیروی اس لیے کرتے ہیں کہ اسلام کے عظیم الشان پیغمبر نے حقیقی اسلام کا مسلک یہی قرار دیا ہے۔ چنانچہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ" میں شہر علم ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہے ہر وہ شخص جو اس شہر میں داخل ہونے کا خواہاں ہے اسے چاہیے کہ وہ اسی دروازے سے داخل ہو یعنی اگر کوئی دروازے کو اپنے اوپر بند کر لیتا ہے یا اس دروازے کا سراغ نہیں پاتا ہے تو ہرگز علمِ نبوت کے شہر سے استفادہ نہیں کرسکتا۔" یا فرمایا "میرے اہلِ بیت کی مثال کشتی نوحؑ کی سی ہے وہ شخص جو اس میں سوار ہوا نجات پائی اور جو اس کے خلاف گیا غرق ہوا")

(گرایش چند شخصیت بزرگ بہ تشیع نوشتہ محمد حسن قہبسی اردو ترجمہ محمدی اشتہار صفحہ ۹۵)

۳۔ شیعہ فرقہ ناجیہ؟

علامہ اطا کی فرماتے ہیں:

"شیعہ آں طائف و گروہ حق جو و حق پرتی است کے بہترین انسان ہاستند و در میان فرقہ ھا فرقہ ای می باشند کہ نجات یافتہ اند و بہ دوستی خدا اور سولؐ و ائمہ اطہار اہل بیت رسولؐ (علیہم الصلوۃ اللہ) متمسک شدہ اند۔ برحسب امکان ائمہ خود را شناختہ و دشمنان آں ہا را نیز می شناسند"

(شیعہ حق پرست و حق جو انسانوں کا وہ گروہ اور جماعت ہیں جو بہترین انسان ہیں اور تمام فرقوں میں وہ ایک فرقہ ہیں جو ناجی ہیں اور خدا، رسولؐ اور ائمہ اطہار اہل بیت رسولؐ پر ایمان لائے ہیں۔ اور اپنی استطاعت کے مطابق آئمہ کو پہچانتے اور ان کے دشمنوں کو جانتے ہیں" (ایضاً)

محمد اشتہادری اور علامہ اطا کی دونوں ہی نے شیعہ کو حقیقی اسلام کا پیرو اور حق پرست و حق جو انسانوں کا گروہ کہا ہے۔ شیعی نقطہ نظر سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ شیعہ اپنے آپ کو اس حق پرست فرقہ امت مسلمہ میں سے سمجھتے ہیں جو رسولؐ کی ایک حدیث کے مطابق ناجی ہے وہ اس بات کا دعویٰ

بھی کرتے ہیں کہ:

"شیعہ کسانی ہستند کہ پیرو سنت جاویدان سرور پیامبران ہستند۔ وہرگز بہ اندازۂ ازیں سنت تجاوز نمی کنند۔ ازآں روز اول اعلان دعوت اسلام تا امروز، متمسک دستگیرۂ محکم اسلام ہستند۔ وہ در راہِ مستقیم اسلام قدم برمی دارند واز آئمہ خود کہ از خطا معصوم می باشند وشکی در صحت قول آنہا ندارند، اخذ عقیدہ می کنند۔"

(شیعہ وہ لوگ ہیں جو ختم المرسلینؐ کی سنت کی پیروی کرتے ہیں اور سنت سے ایک جَو کے دانے کے برابر بھی منحرف نہیں ہوتے اور دعوت اسلام کے اعلان کے روز سے آج تک اسلام کے دامن کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں اور اسلام کی راہِ مستقیم پر گامزن ہیں اور اپنے ائمہ کرام سے جو معصوم ہیں اور جن کے قول کی صحت میں شک کی گنجائش نہیں، عقیدت رکھتے ہیں"۔

غالباً اس میں محمد حسن قمیسی کا اشارہ دعوت عشیرہ کے واقعے کی جانب ہے کہ جب رسول اللہؐ نے پہلی مرتبہ اسلام کی تبلیغ کی اور نصرت کے لیے آواز دی جس پر لبیک کہنے والی آواز حضرت علیؑ کی تھی اور چونکہ شیعہ حضرت علیؑ اور پھر اولاد علیؑ ہی کی پیروی کرتے ہیں لہٰذا وہ اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ صحیح معنوں میں سنت رسول ﷺ کے پیرو ہیں جو ابتدائے اسلام سے آج تک اس کی پیروی کرتے چلے آرہے ہیں۔

۴۔ شیعہ اور قرآن و سنت:

اسی خیال کا اظہار محمد بن مہدی شیرازی یوں کرتے ہیں:

"شیعہ اسلام کو صرف قرآن وسنت کے مطابق جانتے ہیں بادشاہوں کی زندگی کو اسلام کی تفسیر نہیں جانتے اور قرآن کو سنت کے مطابق اسلام کی انفرادی اجتماعی زندگی پر حاوی و حاکم مانتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی نظر میں سیاست و جماعت تمدن ورواسم ومراسم، معیشت ومعاشرت غرضیکہ کوئی چیز بھی مذہب کی گرفت سے آزاد نہیں۔"

("میں کیوں شیعہ ہوا" از علامہ احمد امین انطاکی مترجم مولانا سید غلام

عسکری۔ بار دوم صفحہ ۵۴۔ مقدمہ از علامہ محمد بن مہدی شیرازی)

علامہ محمد بن مہدی شیرازی کے اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ شیعوں کے نزدیک دنیاوی حکومت کی اہمیت نہیں۔ تخت و تاج ان کی نظر میں کوئی وقعت نہیں رکھتے وہ الٰہی حکومت کے قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی حکمرانوں کی زندگی کی انہوں نے کبھی اسلام کو تفسیر نہیں سمجھا۔ بلکہ حاکمانِ وقت سے اکثر شیعوں کے مذہبی اختلافات رہے، اور اس سلسلہ میں انہیں ظلم و ستم کا شکار بھی ہونا پڑا۔ لیکن انہوں نے اپنے مسلک سے ایک انچ بھی ہٹنا گوارا نہیں کیا۔ قرآن اور سنت کا گہرا اثر ان کی انفرادی واجتماعی زندگی دونوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ خاص طور پر شیعوں کی اجتماعی زندگی کو بہت حد تک مستحکم ومضبوط بنادیا ورنہ آج ان کا نام ونشان بھی نہ ہوتا۔ ان کی زندگی کا کوئی پہلو چاہے وہ سیاست ہو رسم ورواج ہو یا طرزِ معاشرت، مذہب کے اثر سے خالی نہیں ہے۔ مذہبی چھاپ قدم قدم پر دیکھی جاسکتی ہے خاص طور پر عزاداری کے مختلف مراسم اس سلسلے میں نظر انداز نہیں کیے جاسکتے جو شیعوں کی زندگی کا ایک لاینفک جزو بن کر رہ گئے ہیں اور سماج میں ان کا امتیازی نشان بھی۔ طرزِ معاشرت، غذا، رہن سہن، لباس وغیرہ بھی شیعی اثرات یا شیعی انداز صاف پہچانے جاسکتے ہیں جو اس قوم کے افراد کو دیگر لوگوں سے ممیز کرتے ہیں۔ نجاست اور پاکیزگی کے سلسلے میں شیعہ جتنی سختی اور پابندی کا ثبوت دیتے ہیں شاید کسی فرقے میں نظر نہیں آتا۔ شیعی نقطۂ نظر سے قرآن کے مطابق تین چیزیں نجس العین قرار دی گئی ہیں۔ کافر، کتا اور سور۔ اسی لیے کافروں اور غیر مسلمانوں سے پرہیز مسلمانوں میں سب سے زیادہ شیعہ فرقے کے لوگ ہی کرتے ہیں اور اسی لیے وہ عیسائیوں اور یہودیوں میں نامقبول رہے ہیں بعض انگریز مصنفوں نے تو اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر پولاک جو ایک عرصے تک شہنشاہ ایران ناصرالدین کے شاہی طبیب کی حیثیت سے ایران میں مقیم رہے، لکھتے ہیں:

"جب کوئی یورپی اتفاقی طور پر بن بلائے کھانے کے وقت کسی ایرانی کے یہاں پہنچ جاتا ہے تو وہ ایرانی بڑی کشمکش میں پڑ جاتا ہے اس لیے کہ اس کی تہذیب وادب اس کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ مہمان کو بغیر ملاقات کیے رخصت کردے اور اگر اندر آنے کی اجازت دے دی تو مشکل میں پڑ جاتا ہے

اس لیے کہ کافر کا ہاتھ جس کھانے پر لگ جائے وہ کھانا نجس ہو جائے گا۔"

پھر ڈاکٹر پولاک لکھتے ہیں:

"یورپی شخص اپنے ساتھ پانی پینے کا گلاس رکھنا نہ بھولے۔ اس لیے کہ کوئی ایرانی اسے اپنا گلاس پانی پینے کے لیے نہ دے گا۔ ایرانیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر برتن جس سے کافر کام لے نجس ہے۔"

یہی وہ باتیں ہیں جنہوں نے بعض مستشرقین کو شیعوں کے خلاف لکھنے پر اکسایا۔

اسی طرح بعض چیزوں کی حلت کے متعلق شیعوں اور دیگر اسلامی قوموں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کوئی شیعہ مشکل ہی سے مردہ مچھلی کھانا پسند کرے گا۔ جب تک مچھلی پانی سے زندہ باہر نہ آئی ہو وہ کبھی بھی نہ خریدے گا۔ تلی شیعوں کے لیے قطعی حرام ہے اسی طرح اور بھی بہت سی چیزیں ہیں۔ یہ حلت ہی کا سوال تھا۔ جس نے سودا سے ہجو یہ نظم لکھوائی۔

ایک مسخرے یہ کہتے ہیں کو احلال ہے

غرضیکہ اس قسم کی بہت سی باتیں ہیں جو شیعوں کی روزمرہ کی زندگی میں دیکھی جاسکتی ہیں اور کہا جاسکتا ہے شیعوں کی معیشت اور معاشرت دونوں ہی مذہب کی گرفت سے آزاد نہیں ہیں شاید اسی لیے وہ قرآن اور سنت کی پیروی کا دعویٰ کرتے ہیں۔

۵۔ شیعہ محبانِ اهل بیت:

علامہ محمد حسن طباطبائی اپنی کتاب "شیعہ در اسلام" میں تحریر فرماتے ہیں:

"شیعہ در اصل لغت بمعنی پیرو می باشند بکسانی گفتہ می شود کہ جانشینی پیغمبر اکرم ﷺ راحق اختصاصی خانوادۂ رسالت می دانند و در معارف اسلام پیرو مکتب اهل بیت میباشند۔"

(شیعہ در اسلام: از استاد علامہ سید محمد حسین طباطبائی صفحہ نمبر ۴)

(شیعہ جس کے معنی پیرو یا مقلد کے ہیں ان لوگوں سے منسوب ہے جو پیغمبر کی جانشینی کو اہل بیت کا مخصوص حق قرار دیتے ہیں اور معارف اسلام

کتاب میں مکتب اہل بیت رسول ﷺ کی تقلید کرتے ہیں۔)

غرضیکہ خود شیعوں کے نزدیک وہی شخص شیعہ کہلانے کا حقدار ہے جو جانشینی رسول ﷺ کے سلسلے میں اہل بیت کا طرفدار ہو اور نہ صرف اس معاملہ میں بلکہ کلی طور پر اہل بیت کی پیروی کرتا ہو۔

مشہور سنی مولوی وحید الزماں خاں بھی کچھ ایسی ہی تشریح فرماتے ہیں:

"اصل میں شیعہ گروہ کو کہتے ہیں اس کا استعمال ان لوگوں کے لیے کیا جاتا ہے جو حضرت علیؑ سے محبت رکھتے ہیں اور آپ کے اہل بیت سے۔ محیط میں ہے کہ شیعہ ایک ایسا فرقہ ہے مسلمانوں کا جو آنحضرت ﷺ کے بعد حضرت علیؑ کو امام جانتا ہے اور کہتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؑ کی خلافت پر نص کر دیا تھا۔ اور ہمیشہ امامت آپ ہی کی اولاد میں رہے گی دوسرے خاندان میں نہیں جاسکتی اکثر شیعہ ہمارے زمانے کے اثنا عشری ہیں اور اہل سنت جماعت بھی اسی معنی کے شیعہ ہیں کہ حضرت علیؑ اور اہل بیت سے محبت کرتے ہیں۔"

اس کے بعد مولانا موصوف رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث کا ذکر کرتے ہوئے یہ ثابت کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے دو ہی فرقے ہیں ایک شیعہ اور دوسرا خوارج فرماتے ہیں:

"مستقدم علی اللہ انت و شیعتك راضیین مرضیین ویقدم علیه عدوك غضباً جمع یده الی عنقه یریهم کیف الاقماح"

آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؑ مرتضیٰ سے فرمایا: "قریب ہے کہ تم اور تمہارے گروہ والے (شیعہ) خوش خوش اللہ کے پاس حاضر ہونگے اور تمہارے دشمن غضبناک سر اوپر اٹھائے آئیں گے۔ قاعدہ ہے کہ جب گردن میں طوق پڑا ہو اور وہ تنگ ہو تو سر اوپر اٹھ جاتا ہے پھر آپ نے اپنے دونوں ہاتھوں کی گردن پر رکھ کر بتلایا یعنی اقماح کے معنی سمجھائے کہ اس طرح سر اوپر اٹھائے ہوئے ان کے سر الل رہے ہونگے۔

جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿انا جعلنا فی اعناقهم اغلالا فهی الی

الاذقان فهم مقمحون﴾ ہم نے ان کے گلے میں ٹھڈیوں تک طوق پہنائے اب ان کے سر الل رہے ہیں او پر اٹھے ہوئے۔

مولوی صاحب کہتے ہیں کہ حدیث شیعہ اور اہل سنت دونوں کی کتابوں میں مروی ہے اور اس میں صاف صراحت ہے کہ شیعان علیؑ و علیؑ ناجی اور مقبول بارگاہ الٰہی ہیں۔ اور مخالفین اور دشمنان علیؑ مبغوض بارگاہ خداوندی اور تباہ ہونے والے ہیں۔ شیعان علیؑ سے جماعت صحابہ اور تابعین مراد ہے اور اسی طرح قیامت تک وہ تمام اہل اسلام جو حضرت علیؑ اور آپ کی اولاد سے محبت اور اخلاص رکھتے ہیں یا اللہ ہمارا حشر بھی شیعان علی مرتضٰی میں کر اور مرتے دم تک ہم کو محبت اہل بیتؑ پر قائم رکھ۔" مولوی صاحب آگے چل کر وضاحت کرتے ہیں۔

"دشمنان علیؑ سے مراد فرقہ خوارج اور نواصب ہیں جو حضرت علیؑ سے بغض رکھتے ہیں یا آپ کی اولاد سے۔ ان کو نجات ملنا مشکل ہے گو وہ کتنی ہی عبادت اور ریاضت کریں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت سے فرمایا: "تم سے وہی محبت رکھے گا جو مومن ہو اور تم سے بغض رکھے گا جو منافق ہو" (بحوالہ ماہ نامہ اصلاح، ماہ ربیع الثانی ۱۳۹۷ھ جلد ۴۲۔ صفحہ ۱۲)

اس حدیث سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ شیعہ علیؑ ایک قدیم فرقہ ہے جس کا ذکر خود آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اسی طرح دشمنان علیؑ دوسرا فرقہ ہے جسے مولوی صاحب نے خوارج کا نام دیا ہے۔

۶۔ شیعہ اور مسئلہ خلافت:

"فجر الاسلام" کا مصنف خلافت کے مسئلہ کو شیعیت کی بنیاد کا سبب قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے:

"خلافت کا مسئلہ وہ پہلا مسئلہ تھا جس کی بنیاد پر مسلمانوں میں اختلاف نے شدت اختیار کر لی تھی۔ مسلمانوں کی آراء اس مسئلہ میں باہم مختلف ہوتی چلی گئیں اور اس اختلاف کی بنیاد پر عصر اول میں اسلام کے اہم فرقوں نے جنم لیا۔ یہ اہم ترین فرقے خوارج، شیعہ اور مرجبہ تھے۔ (فجر الاسلام صفحہ ۲۱۰)

تعجب ہے کہ مصنف فجر الاسلام نے خوارج اور مرجبہ کا ذکر اس ضمن میں [illegible] دونوں فرقوں کا مسئلہ خلافت سے کوئی تعلق نہیں۔ رہ گئے شیعہ تو ان کے متعلق فاضل مصنف آگے چل کر یوں لکھتا ہے:

"شیعیت کا پہلا بیج تو اس جماعت نے بو دیا تھا جس کا رسول ﷺ کی وفات کے بعد یہ خیال تھا کہ اہل بیت رسول آپ کی جانشینی کے زیادہ حقدار ہیں۔ حضرت عباسؓ نے خود بھی حضرت علیؑ سے خلافت کے استحقاق میں کوئی مقابلہ نہیں کیا۔" (ایضاً)

ڈاکٹر امرت لعل عشرت بھی اسی خیال کی حمایت کرتے ہیں:

"سب سے پہلا اور اہم موضوع جو مسلمانوں میں دائمی اختلاف اور باہمی دشمنی کا سبب بنا پیغمبر اسلام کی جانشینی کا مسئلہ تھا جس نے اہل اسلام کو تین مختلف فرقوں میں تقسیم کر دیا۔ شروع شروع میں ان تینوں کی تقسیم سیاسی وجوہ سے ہوئی تھی لیکن آہستہ آہستہ خالص مذہبی رنگ اختیار کر گئی، حضرت کے وصال کے وقت مسلمانوں کے دو گروہ موجود تھے۔ ایک گروہ کا خیال تھا کہ پیغمبرؐ نے اپنا کوئی جانشین مقرر نہیں کیا، امت کو چاہیے کہ مہاجرین یا انصار میں سے کسی ایک کو خلافت کے لیے منتخب کرے۔ چنانچہ شدید اختلافات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق کو پہلا خلیفہ چن لیا گیا....... جو لوگ خلافت کو اختیاری اور انتخابی سمجھتے تھے اور پیغمبر کے بعد حضرت ابوبکر، حضرت عمر۔ حضرت عثمان اور حضرت علیؑ کی خلافت کو جائز خیال کرتے تھے اہل سنت کہلانے لگے۔"

(ایران صدیوں کے آئینے میں۔ صفحہ ۱۲۷)

ڈاکٹر عشرت کے اس بیان سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ "اہل سنت" کا لفظ وفات رسولؐ کے فوراً بعد مسئلہ خلافت کے موقع پر بولا جانے لگا۔ لیکن اس سے ڈاکٹر صاحب کی لاعلمی ظاہر ہوتی ہے، کیوں کہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ اہل سنت کی اصطلاح کا اس وقت تک دور دور تک پتہ نہ تھا۔ یہ تو بہت بعد کی پیداوار ہے (اور کس وقت یہ اصطلاح ایجاد ہوئی اس کا ذکر آگے آئے گا) البتہ یہ کہا جا سکتا ہے

که جو دوسرا گروہ خلافت کے انتخابی و اختیاری ہونے سے انکار کرتا تھا شیعیان علیؑ کہلایا اس کا ذکر خود ڈاکٹر عشرت یوں کرتے ہیں :

"حضرت ابوبکر کی خلافت کے جواز میں جو دلائل پیش کیے گئے تھے ان میں قبیلہ قریش سے نسبت پیغمبرِ اسلام سے رشتہ اور قبول اسلام میں تقدم کو بہت اہمیت دی گئی تھی لیکن حضرت علیؑ میں اس سے بیشتر فضیلتیں پائی جاتی تھیں اور ان کی موجودگی میں کسی اور کا خلافت رسولؐ کے لیے منتخب ہونا ناانصافی تھی۔ رسولؐ کے بہت سے صحابہ کرام سلمان فارسیؓ، جابرؓ بن عبداللہ، عباسؓ بن عبدالمطلب اور عمار بن یاسرؓ وغیرہ نے حضرت علیؑ کی موافقت کی اور اس طرح تاریخ اسلام میں ایک بہت بڑے فرقے کی بنیاد رکھی۔ جس کا ظہور اسی سادہ اعتراض سے ہوا۔ لیکن بتدریج اس کی تعلیمات میں یہ اعتقاد راسخ ہو گیا کہ جانشینی اور امامت کے تعین کا حق امت کو حاصل نہیں، نبوت کی طرح یہ بھی امر الٰہی سے وابستہ ہے اور اس کا حق فقط پیغمبر کے ہاتھ میں ہے۔"

(ایضاً صفحہ ۔۱۲۹۔۱۲۸)

یہ بات بھی غلط ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو تب بھی حضرت علیؑ ہی تینوں حیثیتوں سے مستحق خلافت سمجھے جاتے کیوں کہ قبیلہ قریش سے نسبت یہ تھی کہ وہ خود قریشی تھے، اور پیغمبر اسلام سے ان کا رشتہ دوہرا تھا، چچازاد بھائی کی حیثیت سے بھی اور داماد کی حیثیت سے بھی۔ رہی بات قبول اسلام میں تقدم کی بات تو یہ دعوت عشیرہ سے ہی ثابت ہے۔

۷۔ شیعہ سیاسی فرقہ؟

ڈاکٹر عشرت کے بیان کا لب لباب یہ ہے کہ شیعہ ایک سیاسی فرقہ تھا جو بعد میں مذہبی حیثیت اختیار کر گیا اور اس کے وجود کا اصل سبب مسئلہ خلافت ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس مسئلے نے شیعوں کو نمایاں طور پر دنیا کے سامنے لا کھڑا کیا، لیکن یہ سمجھنا کہ یہ پہلے ایک سیاسی فرقہ تھا بعد میں مذہبی ہو گیا

سراسر غلط ہے۔ اس لیے کہ خلیفہ کا تصور اسلام میں سیاسی قیادت کے ساتھ مذہبی پیشوائی کے ملے جلے اقتدار پر منحصر ہے۔ مسلمانوں کا خلیفہ محض ان کا سیاسی قائد نہیں ہوتا، بلکہ مذہبی پیشوا بھی خیال کیا جاتا ہے۔ لہٰذا شیعوں کا حضرت علیؑ کی حمایت میں کھڑا ہونا محض سیاسی نقطہ نظر لیے ہوئے نہیں تھا بلکہ شروع ہی سے اس میں اس گروہ کا مذہبی عقیدہ کارفرما تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ شیعہ پیروانِ علیؑ پہلے ہی سے تھے اور موافقینِ علیؑ مسئلہ خلافت پر ہو گئے۔ مذہبی عقائد کے مطابق رسولؐ کے بعد حضرت علیؑ ہی ان کے مذہبی پیشوا تھے جنھیں وہ وفات رسولؐ کے بعد اپنا سیاسی حکمراں بھی بنانا چاہتے تھے۔ اس کے برخلاف دیگر خلفائے اسلام مسلمانوں کے پہلے سیاسی حکمراں کی حیثیت سے تاریخ میں ابھرے اور پھر منصب خلافت پر متمکن ہوئے اس کے بعد مذہبی پیشوا کی حیثیت اختیار کر گئے۔ لیکن حضرت علیؑ پہلے مذہبی پیشوا کی حیثیت سے ابھرے اور بہت دیر بعد افق سیاست پر خلیفہ کی صورت میں نمودار ہوئے، لہٰذا شیعہ فرقہ بنیادی طور پر مذہبی ہے نہ کہ سیاسی۔ یوں بھی اگر شیعوں کے اصولِ دین پر نظر کی جائے تو اندازہ ہوگا کہ ان کے ہاں نبوّت کے بعد امامت کا عقیدہ اور تصور نظر آتا ہے نہ کہ خلافت کا۔ امامت ان کے نزدیک الوہی ہے۔ یہی امامت جب سیاست کے میدان میں جلوہ گر ہوتی ہے تو دنیا اسے خلافت چہارم کے نام سے پکارتی ہے۔ شیعیت کے اصول دین میں خلافت کی کوئی اہمیت نہیں، اہمیت امامت کی ہے اور امامت کا تعلق مذہبی عقیدے سے ہے سیاست سے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام حسینؑ اس وقت بھی شیعوں کے امام رہے جب خلافت یزید جیسے فاسق و فاجر کے ہاتھ میں تھی اور امام حسینؑ اور ان کے بقیہ تمام ائمہ کرام ملک و مال اور تخت و تاج سے دور ہوتے ہوئے بھی شیعوں کے لیڈر اور قائد رہے اور شیعوں نے خلفائے وقت کے برخلاف انہیں کے حکم کی تعمیل کی۔ اگر یہ سیاسی فرقہ ہوتا تو سیاست کے بدلتے ہی اس کے نظریات میں ایسی تبدیلی آجاتی جیسے اندرا گاندھی کے زوال کے فوراً بعد بہت سے بگلہ بھگتوں نے کانگریس کا چولا اتار کر جنتا دل کا لبادہ اوڑھ لیا تھا اور اندرا گاندھی کے برسر اقتدار آنے پر پھر وہی عمل دہرایا کیوں کہ سیاست میں "چڑھتے سورج کی پوجا" سب سے اہم اصول سمجھا جاتا ہے۔ اس اصول کا اطلاق شیعوں کی تاریخ میں دور دور تک نظر نہیں آتا۔

سید حسین نصر علامہ طباطبائی کی کتاب "شیعہ در اسلام" کے انگریزی ترجمہ Shi,ite

Islam کے مقدمے میں لکھتے ہیں :

Shi,ism was not brought into existence only by the question of the political succession to the Prophet of Islam, as so many western works claim (although this question was of course of great importance). The problem of political succession may be said to be the element that crystallised the *Shi-ites* into a distinct group and political suppression into later periods, espicially the martyrdam of Imam Husain, only accentuated this tendency of the Shi-ites to see themselves as a seperate community within the Islamic world. The pricipal cause of the coming into being of Shi-ism, however, lies in the fact that this possibility existed within the Islamic relavation itself and so had to be realised. In as much as there were oxoteric and esoteric interpretations from the very begining from which developed the schools of the *Shariha* and *Sufism* in the *Sunni* world, there also had to be an interpretation of Islam which would combine these elements in Shi-ism, for which the Islam is the person, in whole these two aspects of traditional authority are united and in whole the religions life is marked by a sere of tragedy and martyrdom."

(شیعیت محض جانشینی رسولؑ کے سوال پر وجود میں نہیں آئی جیسا کہ بہت سی مغربی تصانیف کا دعویٰ ہے (گو کہ یہ سوال بھی یقیناً بہت اہم ہے) جانشینی کا سوال شیعیت کا اہم جزو خیال کیا جاسکتا ہے جس نے آگے چل کر شیعوں کو ایک امتیازی جماعت اور سیاسی محکومین کی حیثیت سے ممیز کیا خاص طور پر شہادت امام حسینؑ نے شیعی ذہنیت کو عالم اسلام میں اپنے آپ کو ایک علاحدہ گروہ کی

حیثیت سے دیکھنے پر زور دیا شیعیت کے وجود میں آنے کا خاص سبب اس امر میں نہاں ہے کہ یہ امکانات خود ظہور اسلام میں مضمر تھے لہٰذا اس بات کو تسلیم کرنا پڑے گا چونکہ ابتدا ہی سے ظاہری اور باطنی معارف موجود تھے اس لیے سنیوں میں دو نظریاتی دبستانوں نے جنم لیا ایک دبستان شریعت دوسرا دبستان تصوف اس کا ایک اور تشریحی مفہوم بھی تھا جو شیعیت کی صورت میں پیدا ہوا جس میں دونوں عناصر کا امتزاج موجود تھا کیونکہ امام وہ شخص ہے جس میں یہ دونوں خصوصیات پائی جاتی ہوں۔ مجموعی طور پر اس کی مذہبی زندگی ایک المیہ اور شہادت سے نمایاں ہوتی ہے)۔

۸۔ شیعہ فرقہ سبائیہ :

شیعیت کے متعلق ایک غلط خیال یہ بھی پایا جاتا ہے کہ اس کا بانی عبداللہ بن سبا نامی ایک یہودی تھا جو مسلمان ہو گیا تھا اور اسی لیے شیعیان پنجتن پاک کو بہت سے لوگوں نے سبائیہ بھی کہا ہے۔ (طبری جلد: ۵ صفحہ نمبر: ۱۵۴/۱۵۲)

چنانچہ تاریخ اسلام جلد اول میں مولانا شاہ اکبر نجیب آبادی فرماتے ہیں :

"آنحضرت کے عہد مبارک میں بھی منافقوں کے ہاتھوں سے مسلمانوں کو بارہا ابتلاء میں مبتلا ہونا پڑا اور اب عہد عثمانی میں بھی ایک منافق یہودی مسلمانوں کی ایذا رسانی کا باعث ہوا۔ عبداللہ بن سبا کی مسلم کش کوششوں کا زبردست پہلو یہ تھا کہ اس نے بنوامیہ کی مخالفت میں یک لخت اور یکا یک تمام قبائل کو برانگیختہ اور مشتعل کر دیا جس کے لیے اس نے حضرت علیؑ کرم اللہ وجہہ کی حمایت و محبت کو ذریعہ اور بہانہ بنایا۔"

(تاریخ اسلام جلد اوّل۔ صفحہ ۴۶۳)

'تحفۂ اثنا عشریہ' میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی بھی ابن سبا ہی کو شیعہ فرقہ کا بانی قرار دیتے ہیں اور ایسے ہی اسلامی مورخوں سے حوالہ لے کر ڈاکٹر ولسن کہتے ہیں :

"شیعہ مذہب نے مجوسیت سے زیادہ یہودیت سے اثر قبول کیا کیونکہ اس فرقے کا بانی عبداللہ بن سبا یہودی الاصل تھا۔"

بعض لوگ اس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :

"صنعاء یمن کا ایک یہودی تھا جو خلافت حضرت عثمان میں اسلام لایا اور مسلمانوں میں گھل مل گیا بلاد اسلامیہ کوفہ، بصرہ، شام اور مصر وغیرہ میں جا کر اس نے پروپیگنڈہ کیا کہ جس طرح حضرت عیسیٰ دوبارہ دنیا میں آئیں گے اسی طرح ہمارے پیغمبر بھی دوبارہ تشریف فرما ہوں گے۔ علیؑ بن ابی طالب رسول اللہ ﷺ کی وصی ہیں، حضرت عثمان غاصب ہیں ان سے جنگ کرنا واجب ہے تا کہ حق حقدار کو واپس مل جائے۔ تھوڑے ہی دنوں میں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد اس کی پیرو ہوگئی جن میں صحابہ کبار بھی موجود تھے اور جلیل القدر تابعین بھی، جیسے ابوذر، عمار، یاسر محمد بن ابی حذیفہ، عبدالرحمٰن بن عدیس محمد بن ابی بکر، صعصعہ ابن صوحان، مالک اشتر رضی اللہ عنہ وغیرہ" (ماہ نامہ "نگار" مئی ۱۹۶۰ء۔ مضمون عبداللہ ابن سبا۔ از رضا قاسم عثار صفحہ ۱۸)

یہ سب باتیں بالکل بے بنیاد لگتی ہیں پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر عبداللہ بن سبا شیعہ فرقہ کا بانی ہوتا تو آج تک وہ اس فرقے میں مقبول و محترم ہوتا جیسا کہ ہر فرقے کے بانی کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ اور اس کی یاد بھی منائی جاتی لیکن شیعوں کے یہاں اس کی مقبولیت واحترام سے متعلق ہلکا سا نشان بھی نہیں ملتا الٹا اس سے نفرت کا اظہار کیا جاتا رہا ہے جو کوئی بھی فرقہ اپنے بانی سے نہیں کر سکتا۔

لہٰذا شیعوں اور شیعوں کے صادق امام کا عبداللہ بن سبا پر لعنت بھیجنا اس بات کا ثبوت ہے کہ شیعیت کا سبائیت سے دور کا بھی تعلق نہیں عقائد کے اعتبار سے بھی شیعہ نہ حضرت علیؑ کو خدا مانتے ہیں اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے بعد کسی کی نبوت کو تسلیم کرتے ہیں جیسا کہ سبا کا نظریہ بتاتا ہے۔ خود اہل سنت میں سے بعض مؤلفین کا کہنا ہے :

"مذہب شیعہ بدعت ابن سبا سے ہے پس وہ وہم اور مذہب شیعہ سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ جو شخص ابن سبا کی منزلت کو دیکھے گا کہ کس طرح شیعہ

اس سے اور اس کے اقوال واعمال سے برأت کرتے ہیں اور شیعہ علماء بلا خوف ابن سبا پر طعن کرتے ہیں تو وہ سمجھ جائے گا کہ یہ قول صحیح نہیں ہے۔" (خطوط شام از محمد علی کرد۔ جلد ۶۔ صفحہ ۲۵۱)

اس کے باوجود ابوسعید بزمی اس بات پر مصر ہیں کہ :

"بدقسمتی سے حضرت علیؑ کے زمانے میں ایک نومسلم یہودی عبداللہ بن سبا نے الوہی امامت کے عقیدے کو سب سے پہلے اہل اسلام کے کان میں پھونکنا شروع کیا۔ یہ عقیدہ یہودی مذہب میں پایا جاتا ہے اور اس لیے اس نے کچھ تو اپنے سابق مذہب کے اثرات کے تحت اور کچھ دیگر سیاسی اغراض کے پیش نظر اس عقیدے کی تبلیغ شروع کر دی اور حضرت علیؑ کی ذات کے ساتھ وہ صفات منسوب کرنا شروع کیں جو ہندوؤں میں رام چندر جی یا یہودیوں میں عزیز کے ساتھ منسوب کی جاتی ہیں۔" (نگار جولائی ۱۹۳۷ء۔ صفحہ ۲۷۔۲۶)

شیعیت کو یہودیت یا مجوسیت سے ملانے کی کوشش نئی نہیں ہے لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہودیت میں اب بھی بہت سے عقائد ایسے ہیں جنہیں مسلمان بعینہ یا بصورت دیگر اپنائے ہوئے ہیں جیسے طواف کعبہ ختنہ اور قربانی یہودیوں میں بھی موجود ہے اور ہمارے ہاں بھی۔ آخر انہیں یہودیت کا نام دے کر مذہب سے خارج کیوں نہیں کر دیا جاتا؟ دوسری بات یہ ہے کہ بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ عبداللہ ابن سبا ایک یہودی تھا جو بعد میں مسلمان ہو گیا اور اس کے پیش نظر کچھ سیاسی اغراض تھے (لیکن وہ کون سے سیاسی اغراض تھے اس پر کوئی معترض روشنی نہیں ڈالتا) کیا عبداللہ بن سبا خود مسلمانوں کا سیاسی لیڈر بننا چاہتا تھا؟ یا پھر حضرت علیؑ کو لیڈر بنانا چاہتا تھا؟ اور اگر ایسا تھا تو سوال یہ اٹھتا ہے کہ اس کی نگاہ اس سلسلے میں صرف حضرت علیؑ ہی پر کیوں پڑی جبکہ اس زمانے میں اور بھی صاحب احترام صحابہؓ موجود تھے؟ کیا الوہی امامت کا عقیدہ کسی اور کی ذات سے منسوب نہیں کیا جا سکتا تھا؟ اور اگر نہیں تو کیوں؟ یا پھر حضرت علیؑ ہی کے ساتھ منسوب کیا جا سکتا تھا تو کیوں؟

آگے چل کر بزمی صاحب ہندو مذہب کو بھی درمیان میں لے آتے ہیں اور رام چندر جی کا حوالہ دیتے ہیں۔ حالانکہ اگر تاریخ اسلام اور رامائن کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی

کہ رام چندر جی او۔ عنرت علی کے کردار میں کوئی مماثلت نہیں ہے۔

رامائن رام چندر جی کو حضرت علیؑ کی طرح نہ اتنا شجاع بتاتی ہے نہ صاحب حرب اور نہ اس درجہ صاحب علم کہ وہ دعویٰ کر سکتے کہ "اس زمین اور آسمان کے درمیان جو کچھ ہے مجھ سے پوچھ لو" وہ حضرت علیؑ کی طرح صاحب ذوالفقار بھی نہ تھے۔ ان کی فتح کا سہرا زیادہ تر ہنومان جی، ان کی واندر سینا اور راون کے بھائی کو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رام چندر جی کے کردار کے متعلق خود ہندوؤں میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے اور جنوبی ہند کا ایک بہت بڑا طبقہ ان کی عظمت سے انکار کرتا ہے جبکہ حضرت علیؑ کے بدترین دشمن بھی ان کی بلندیٔ کردار کے معترف تھے۔ تاریخ اسلام ایسی ہزاروں گواہیوں سے بھری پڑی ہے۔ لہٰذا عبداللہ بن سبا کے متعلق بزمی صاحب کا یہ بیان قابل قبول نظر نہیں آتا کیونکہ عبداللہ بن سبا نہ خود سیاسی لیڈر بن سکا نہ مذہبی پیشوا بلکہ تاریخ کا ایک ناقابل یقین اور جھوٹا کردار بن کر رہ گیا۔

ضرورت تو اس بات کی ہے کہ ابن سبا کی حقیقت جاننے کے لیے یہ تحقیق کی جائے کہ اس قصے کی ابتدا کیونکر ہوئی۔ اس کے راوی کون کون ہیں؟ اور کن کن سندوں سے قصہ بیان کیا گیا ہے۔

تحقیق کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ اس قصے کے بیان میں :

ا۔ علامہ سید رشید رضا مدد المنار (مصر) اپنی کتاب "السنة والشیعه" میں تاریخ کامل (ابن اثیر) کو ماخذ بتاتے ہیں۔

۲۔ مورخ ابوالفدا (۷۳۲ھ) بھی تاریخ کامل ہی کا حوالہ دیتا ہے اور تاریخ کامل کا مولف ابن اثیر (۷۳۱ھ) طبری کے حوالے سے یہ قصہ بیان کرتا ہے، اس کے علاوہ فرید وجدی (دائرۃ المعارف)، ڈاکٹر سید حسن ابراہیم حسن (تاریخ الاسلام) نکلسن (تاریخ ادب عربی) ڈونلڈسن (عقیدۃ الشیعہ) وغیرہ کے ہاں بھی طبری کا حوالہ ملتا ہے۔

۳۔ خود طبری نے ابن سبا کے قصے کو فقط ایک شخص سیف بن عمر تمیمی برجمی کوفی کے وسیلہ سے بیان کیا ہے۔

۴۔ ابن عساکر نے بھی طبری کی طرح سیف ہی کا حوالہ دیا ہے۔

(نگار مئی ۱۹۶۰ عبداللہ ابن سبا از رضا قاسم مختار صفحہ ۱۹۔۲۰)

مختصر یہ کہ راویان قصہ ابن سبا کا خاکہ کچھ اس طرح مرتب کیا جا سکتا ہے۔

سلسلہ قصہ ابن سبا
- سیف بن عمر تمیمی التونی ۱۷۰ھ
  - طبری التونی ۳۱۰ھ
    - ابن اثیر التونی ۶۳۰ھ
      - سید رشید رضا (السنة والشیعه)
    - میر خواند التونی ۹۰۳ھ
      - احمد امین (فجر الاسلام)
      - ڈاکٹر حسن ابراہیم (تاریخ الاسلام السیاسی)
      - فرید وجدی (دائرۃ المعارف اسلامیہ)
    - ابن کثیر التونی ۷۷۴
    - مستشرقین
      - فان فلوتن
      - نکلسن تاریخ الادب
      - ڈونالڈسن (عقیدۃ الشیعہ)
  - ابن عساکر التونی ۵۵۷ھ

ظاہر ہے کہ تمام راویان قصہ کا ماخذ سیف بن عمر تمیمی ہے اور سیف بن عمر کی روایت گوئی کا یہ حال ہے کہ آٹھ ائمہ رجال کے نزدیک وہ مجہول الحال لوگوں سے روایت کرنے کا عادی ہے اور حدیثیں گھڑتا ہے۔ (ابن معین، ابی حاتم، ابوداؤد، نسائی دار قطنی، ابن عدی، ابن حبان، عباس بن یحییٰ، ابن ندیم صفحہ ۱۳۷۔ میزان الاعتدال جلد ا۔ صفحہ ۴۳۸۔ تہذیب التہذیب جلد ۶۔ صفحہ ۲۹۷ بحوالہ نگار مئی ۱۹۶۰ء)

عقل بھی اس کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہے، مشہور سنی محقق، عالم ڈاکٹر طٰہٰ حسین اپنی مشہور کتاب "الفتنۃ الکبریٰ" جلد دوم صفحات: ۸۹۔۹۹۔۱۰۰ پر رقمطراز ہیں :

> "جنگ صفین میں سبائیوں اور ابن سبا کے ذکر سے مؤرخین نے جو اعتراض کیا ہے اس سے کم سے کم یہ بات آئینہ ہو جاتی ہے کہ ابن سبا بالکل فرضی اور من گھڑت چیز ہے اور جب فرقۂ شیعہ اور دیگر اسلامی فرقوں میں جھگڑے چل رہے تھے، اس وقت اسے جنم دیا گیا شیعوں کے دشمنوں کا منشاء یہ تھا کہ شیعوں کے اصول مذہب میں یہودی عنصر داخل کر دیا جائے۔ یہ سب کچھ بڑی زبردست چالبازی اور مکر و فریب کی صورتیں تھیں۔ محض شیعوں کو زچ

کرنے کے لیے۔ ورنہ اگر ابن سبا کا معاملہ کسی صحیح بنیاد پر مبنی ہوتا اور معتبر تاریخ سے اس کا پتہ چلتا ہوتا تو لازمی طور پر اس فرقے کا اثر ونشان اور اس کا مکروفریب جنگ صفین میں ضرور ظاہر ہوتا خصوصاً معاملۂ تحکیم کے موقع پر جب اصحاب علیؑ میں اختلاف رونما ہوا اس وقت بھی فطری طور پر اس فرقے کا وجود ہونا چاہیے تھا، لیکن ہم خوارج کے معاملے میں ابن سبا کا کوئی وجود نہیں پاتے۔ تمام تاریخیں اس موقع پر اس کے ذکر سے خاموش ہیں۔ اس خاموشی کی کیا توجیہ کی جاسکتی ہے اور واقعہ صفین اور فرقہ خوارج کے موقع پر ابن سبا کے غائب ہونے کی کیا وجہ بیان کی جاسکتی ہے۔ ہم تو صرف ایک ہی نتیجے پر پہنچتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ابن سبا محض وہمی چیز ہے اور اگر بالفرض اس نام کا کوئی شخص موجود بھی رہا تو اسے ایسی اہمیت ہرگز حاصل نہیں کہ جیسی مؤرخین تصویر کشی کرتے ہیں۔ اور قتل عثمان اور حضرت علیؑ کی خلافت کے پہلے سال میں اس کا تذکرہ کرتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ابن سبا ایک ہوا ہے۔ جسے شیعوں کے دشمنوں نے محض شیعوں کے لیے تلاش کیا۔

(اموی دور خلافت صفحہ ۲۱۳۔۲۱۴)

ڈاکر حسین کا خیال ہے "سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت کے حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ متعدد سیاسی جماعتیں ابھر آئیں اور ان میں سے ایک نے دوسرے کو گمراہ ثابت کرنا چاہا۔ ابن سبا کے فرضی وجود کو مخص کرنے کا ایک فائدہ تو یہ تھا کہ حضرت عثمان کے اعمال سے جو باتیں منسوب کی جاتی تھیں، مشکوک قرار پائیں۔ اور دوسرا یہ کہ حضرت علی اور انکے ساتھی لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل وخوار ہو جائیں۔" ('نگار' مئی ۱۹۶۰ء صفحہ ۲۰)

اس سلسلے میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین "الفتنۃ الکبریٰ" جلد اوّل" عثمان صفحہ ۱۳۲-۱۳۴ میں انکشاف کرتے ہیں۔

"میرا خیال ہے کہ جو لوگ ابن سبا کے معاملے کو اس حد تک بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں وہ اپنے اوپر بھی انتہائی زیادتی کرتے ہیں اور تاریخ پر بھی۔ سب سے پہلے ہماری نظر تو اس بیان پر

پڑتی ہے کہ متقدمین علماء کی بڑی بڑی کتابیں جو بعد کے مصنفین کا ماخذ بنیں ان میں ابن سبا کا کوئی ذکر موجود نہیں۔ نہ تو ابن سعد نے عہد عثمان کے واقعات اور ان لوگوں کی برگشتگی و برہمی کے سلسلے میں ابن سبا کا تذکرہ کیا ہے اور نہ علامہ بلاذری نے اپنی کتاب انساب الاشراف میں"۔

(اموی دور خلافت صفحہ ۲۲۰)

ان تمام دلائل وبیانات کی روشنی میں یہ بات صاف واضح ہو جاتی ہے کہ عبداللہ ابن سبا کسی بھی صورت میں شیعہ فرقے کا بانی نہیں کہا جاسکتا۔ شیعہ فرقہ پہلے ہی سے موجود تھا البتہ عبداللہ ابن سبا کا وجود آج بھی مشکوک ہے۔

۹ ۔ شیعه امت مسلمه کا پهلا فرقه ؟

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ شیعیت عہد عثمانی میں نہیں بلکہ حضرت علیؑ کے دور خلافت میں ظہور پذیر ہوئی۔ اور یہ فرقہ حضرت علیؑ کی زندگی ہی میں پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ مصنف "مذاہب اسلامیہ" مختلف اسلامی فرقوں کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ رائے زنی کرتا ہے کہ۔ "سب سے پہلا فرقہ جو امتِ مسلمہ میں پیدا ہوا وہ شیعانِ علیؑ مرتضٰی کا ہے۔ اور حضرت علیؑ ہی کی زندگی میں دوسرا فرقہ جو شیعان علیؑ سے علیحدہ ہو گیا خوارج کے نام سے مشہور ہے۔ (مذاہب اسلامیہ صفحہ ۱۰۷)

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر شیعہ امتِ مسلمہ کا سب سے پہلا فرقہ ہے تو اس سے قبل امتِ مسلمہ کا نام کیا تھا؟ اگر ان کا خیال یہ ہے کہ وہ اہلِ سنّت والجماعت کے نام سے مشہور تھی تو یہ قطعی غلط ہے۔ (کیونکہ یہ نام معاویہ کے زمانے سے جاری ہوا اور شیعیت کے بہت بعد کی پیداوار ہے۔ (ملاخطہ ہو صفحہ ۵۵-۵۶) ہاں مصنف "اسلامیہ مذاہب" کے بیان کو مانتے ہوئے یہ تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ حضرت علیؑ کے دور میں جب فرقۂ خوارج پیدا ہوا اسی زمانے میں مختلف الخیال مسلمانوں کے درمیان دیگر فرقوں نے بھی جنم لیا۔ اس طرح جو سب سے قدیم یا اوّل ترین فرقہ مانا گیا۔ وہ فرقۂ شیعہ تھا جو پہلے سے موجود تھا۔ گویا امتِ مسلمہ پہلے لفظ شیعہ ہی کے نام سے موسوم تھی۔ فاضل مصنف اسی کتاب کے صفحہ ۱۱۳ پر رقمطراز ہے۔

"حقیقت یہ ہے کہ حضرت علیؑ کے دور خلافت میں ایک سیاسی فرقہ ضرور پیدا ہوا جس کو آج

شیعان علیؑ کہتے ہیں۔ اور یہ پر جوش حامی اہل بیت تھے"۔

اگر اس بات کو مان لیا جائے تو احمد امین اعطا کی جیسے بہت سے مؤرخوں کے اس خیال پر نظر ثانی کرنا پڑے گی جو یہ سوچتے ہیں کہ رسول اللہ کی وفات کے فوراً بعد ہی یہ فرقہ پیدا ہو گیا تھا اور یہ لوگ اہل بیت رسول کی جانشینی اور خاص طور پر حضرت علیؑ کی خلافت کے حق میں تھے۔ (ملاحظہ ہو صفحہ ۲۳۔۲۴) اس طرح شیعیت وفات رسولؐ کے فوراً بعد ہی ظہور میں آ چکی تھی اور حضرت علیؑ کے دور خلافت تک آتے آتے تو اسے کئی سال تک گذر چلے تھے بلکہ اس کا سنِ بلوغت شروع ہو چکا تھا۔ لہٰذا عباداللہ اختر کا یہ بیان قابل قبول نظر نہیں آتا کہ فرقۂ شیعہ حضرت علیؑ کے دور خلافت میں پیدا ہوا۔ کیونکہ متنازعہ فی مسئلہ صرف خلافت کا تھا اور جب حضرت علیؑ کو خلافت مل گئی تو اس وقت ان کے حق کی حمایت میں کسی فرقے کا پیدا ہونا ایک عجیب سی بات ہے۔ ہاں حق نہ ملنے سے پہلے اسکی موجودگی تسلیم کی جاسکتی ہے، جو حق علیؑ کی حمایت میں آواز بلند کر رہا ہو۔ پر جوش احتجاج کر رہا ہو اور اس فرقے کو مخالفین علیؑ شیعان علیؑ کے نام سے پکارتے رہے ہوں۔

دوسری بات یہ ہے کہ شیعوں کو محض ایک سیاسی فرقہ تصور کرنا ایک بہت بڑی بنیادی غلطی ہے۔ اگر یہ محض ایک سیاسی فرقہ ہوتا تو اسلامی سیاست کے دم توڑتے ہی اسے بھی خاک میں مل جانا چاہیے تھا۔ لیکن چودہ سو برس کے بعد بھی، عالم اِسلام کے سیکڑوں سیاسی نشیب و فراز دیکھنے کے باوجود اور متعدد اسلامی حکمرانوں کے مظالم و مصائب سے گذر کر بھی وہ ایسے ہی دم خم کے ساتھ زندہ ہے جیسا اسلام کے ابتدائی دور میں تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ شیعیت کا تعلق سیاست سے زیادہ مذہبی عقائد سے تھا۔ چونکہ مذہب شیعہ اب تک زندہ ہے۔ لہٰذا شیعیت اور فرقہ شیعہ اب تک باقی ہے۔

۱۰ ۔ فرقۂ شیعہ بعد شہادت علیؑ :۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شہادت حضرت علیؑ کے بعد شیعیت کی نمود ہوئی۔ چنانچہ مشہور مغربی مورخ ایچ. اے. آر. گب کا خیال ہے۔

" The Shia began as a political movement against the Arabs themselves. Ali, the son-in-law of the Prophet and fourth caliph of Islam, had made his capital at Kufian

Iraque. When on his death the political centre of Islam was shifted to Syria, the opposition of the Arabs of Kufa to the Arabs of Syria took the form of a legitimate agitation, aiming at the restoration of the House of Ali to the Caliphate. Gradually this political aspiration created for it self a doctrinal basis, opposed to accepted doctrine of the community, namely, the doctrine of the exclusive right of the House of Ali to the Caliphate. This involved the repudiation of the first three Caliphs Abubakar, Omar, Usman as usurpers and this denunciation of three of the most revered companions had always remained th chief offence of Shi-ism in the eyes of orthodox Muslims."

(شیعیت ایک سیاسی تحریک کی حیثیت سے خود عربوں کے باہمی اختلاف کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ دامادِ رسولؐ اور مسلمانوں کے چوتھے خلیفہ حضرت علیؑ نے کوفہ (عراق) کو اپنا پایہ تخت بنایا تھا۔ ان کی شہادت کے بعد اسلام کے سیاسی مرکز شام میں تبدیل ہو جانا کوفے کے عربوں اور شام کے عربوں میں اختلاف کا باعث بنا جس کا مقصد اولادِ علیؑ کی خلافت کی بازیابی تھا۔ دھیرے دھیرے یہ سیاسی نظریہ ایک مذہبی عقیدے میں تبدیل ہوتا گیا جس نے موجودہ عقائد سے اختلاف کیا۔ خاص طور پر اولادِ علیؑ کے حق خلافت کے غصب ہو جانے پر۔ اس میں پہلے تین خلیفہ ابوبکر، عمر اور عثمان بھی بحیثیت غاصبین ملوث ہوئے۔ اور رسولؐ کے ان تین محترم صحابیوں کے خلاف شیعوں کا یہ رویہ سنیوں کی نظر میں ہمیشہ ایذا رسانی کا باعث بنا رہا۔)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ گب بھی شیعیت کی بنیاد مسئلہ خلافتِ علیؑ و اولادِ علیؑ کو جانتا ہے۔ لیکن اس کا خیال کہ یہ اختلاف بعد شہادت علیؑ پیدا ہوا، قطعی غلط ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ خلافتِ علیؑ کے حامیان شروع ہی سے موجود تھے۔ ہاں البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ بعدِ شہادت علیؑ شیعیت نے شدید مخالفت کے باوجود تقویت حاصل کی۔ کیونکہ یہ نفسیاتی کلیہ ہے کہ کسی جذبے کو جتنا دبانے کی کوشش کی جائے وہ اتنا ہی تیزی سے ابھرتا ہے۔ حضرت علیؑ کے بعد اموی دورِ خلافت میں خاص طور پر عہد معاویہ میں شیعوں پر جو مظالم ڈھائے گئے اُنھوں نے شیعیت کو اور تقویت پہنچائی۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین بھی شیعیت کی ابتداء بعد شہادت علیؑ قرار دیتے ہوئے "الامام علیؑ" میں لکھتے ہیں۔
"جہاں تک میں سمجھتا ہوں فقہاء و متکلمین اور مورخین لفظِ شیعہ سے جو ایک مقررہ جماعت مراد لیتے ہیں وہ حضرت علیؑ کی زندگی میں موجود نہ تھی۔ ہاں آپ کی وفات کے کچھ دنوں بعد ظہور میں آئی"۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا کہ عہد امیر المومنینؑ میں شیعہ کا لفظ ان معنوں میں استعمال نہ ہوتا تھا جن معنوں میں بعد میں استعمال ہونے لگا اور شیعوں کا پہلے کوئی وجود نہ تھا، بعد میں ہوا، محل تامل ہے۔ شیعہ کے لغوی معنی ہوں یا اصطلاحی معنی۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ علامہ ابن خلدون اپنے مقدمے کے صفحہ ۱۳۸ پر لکھتے ہیں۔

اعلمه ان الشيعة لغته هوالصحب ولا تباع ولطلق فى عرف الفقهاء والمتكلمين من الخلف والسلف علىّ اتباع علىّ وبينه رضى الله عنهه.
(لغت میں شیعہ کے معنی ساتھی اور پیرو کے ہیں اور فقہاء و متکلمین کی اصطلاح میں خواہ وہ پہلے زمانے کے ہوں یا بعد کے یہ لفظ علیؑ اور اولادِ علیؑ کے پیرووں کے لیے بولا جاتا ہے۔ (بحوالہ ماہنامہ اصلاح)

لغت بھی یہی کہتی ہے کہ شیعہ کے معنی ساتھی اور پیرو کے ہیں اور فقہاء و متکلمین نے اسے مخصوص کر دیا ہے پیراون علیؑ سے۔ اور پیروان علیؑ کا وجود امیر المومنینؑ کی رحلت کے بعد نہیں ہوا بلکہ پہلے سے تھا۔

۱۱۔ شیعیت اور مجوسیت :-

مورخین وعلماء کا ایک گروہ وہ بھی ہے جو شیعیت کو ایران کی دین اور اسلام پر مجوسیت کا اثر بتلاتے ہیں۔ خاص طور پر مستشرقین نے اس قسم کے پروپیگنڈے کو خاصی ہوا دی۔ چنانچہ ڈوزی لکھتا ہے۔ "عرب جمہوری نظام حکومت آزادی کے دلدادہ تھے۔ لیکن ان کے بالمقابل ایرانی شہنشاہیت کے پرستار تھے۔ جو باپ کے بعد بیٹے اور بیٹے کے بعد پوتے کی طرف منتقل ہو جاتی تھی۔ اگر شہنشاہ کے اولاد نہ ہوتی تو اسی کے خاندان میں سے کسی شہزادے کو بادشاہ مقرر کیا جاتا تھا

....فتوحات اسلامیہ کے بعد ایرانیوں نے کثرت سے اسلام میں داخل ہونا شروع کیا۔ انھوں نے دیکھا کہ رسول اللہ نے اپنے بعد کوئی نرینہ اولاد نہیں چھوڑی تھی۔ اس لیے اپنے ذہنی افکار کی وجہ سے لازماً انھوں نے حضرت علیؑ کو جو آپ کے چچا زاد بھائی نیز داماد تھے۔ خلافت کا سب سے زیادہ مستحق سمجھا"۔ (بحوالہ کربلا سے پہلے عمر ابوالنصر صفحہ ۵۵۔)

اگر یہ مان لیا جائے کہ ایرانی مزاجاً موروثی بادشاہت کے قائل تھے اور اسی وجہ سے انھوں نے حضرت علیؑ کو خلافت کا مستحق سمجھا۔ تو پھر وہی سوال اٹھتا ہے کہ حضرت علیؑ ہی کو کیوں؟ کسی اور کو کیوں نہیں سمجھا؟ تعجب تو یہی ہے کہ عمار بن یاسر، ابوذر غفاری وغیرہ کی نظر بھی جاتی ہے تو حضرت علیؑ پر عبداللہ بن سبا بھی انتخاب کرتا ہے تو حضرت علیؑ کو اور ایرانی موروثی شہنشاہیت کی جانشینی کے لیے منتخب کرتے ہیں تو حضرت علیؑ کو۔ آخر حضرت علیؑ کی ذات میں وہ کونسی خصوصیت تھی کہ ہر نگاہ انھیں کی طرف اٹھتی تھی؟

رہ گیا موروثی شہنشاہیت کے زیر خیال شیعیت کا فروغ پانا تو آج کے دور میں اگر ایران پر نظر کی جائے تو یہ خیال بھی غلط معلوم ہوتا ہے۔ آج اسی سرزمین ایران پر وہ زبردست انقلاب نظر آرہا ہے جس نے ایک مذہبی پیشوا کی قیادت میں صدیوں کی شہنشاہیت کا خاتمہ کر دیا۔ شہنشاہیت ایران سے ختم ہوگئی۔ لیکن شیعیت آج بھی ایران کا اہم جزو ہے۔ اگر شیعیت کا فروغ شہنشاہیت ہی کا مرہون منت ہوتا تو آج ایران سے شیعیت کا قلع قمع ہو جاتا، شہنشاہیت کا نہیں۔ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ کسی ضعیف ونزار مذہبی پیشوا نے اٹھارہ سال جلاوطنی کی زندگی گذار کر اس طرح سیکڑوں برسوں کی شہنشاہیت کے خلاف ایک مذہبی حکومت کے قیام کی خاطر اتنا زبردست انقلاب نہیں لایا جیسے ایران کے اسی سالہ مذہبی رہنما آیت اللہ خمینی نے کیا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اتنے عرصے سے شہنشاہیت کے سائے میں سانس لیتے ہوئے بھی ایران کے شیعی عوام مذہب کو شہنشاہیت پر زیادہ ترجیح دیتے تھے۔

شیعیت اور ایران کے تعلق سے ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ:
...."ایران ہمیشہ سے ایک بلند اور مہذب حکومت رہی ہے۔ جنھوں نے ہمیشہ عربوں کو اپنے سے فروتر سمجھا ہے۔ لیکن جب اسلامی فتوحات نے ایران کو دمشق کے پایہ تخت سے متعلق کر دیا تو

اہل ایران کی غیرت قومی اور حمیت ملی کے لیے یہ چیز سخت نا قابلِ برداشت تھی کہ وہ عربوں کے جور و استبداد کے سامنے اپنی گردنوں کو خم ہوتا دیکھیں...انھوں نے عربوں سے بدلہ لینے کا یہ بہت اچھا موقع دیکھا کہ حضرت علیؑ کی الہامی نبوت (مضمون نگار کی لاعلمی کا یہ عالم ہے کہ وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ شیعہ حضرت علیؑ کی نبوت کے نہیں امامت کے قائل ہیں) کی آڑ میں خاندان اموی کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کردیں۔ چنانچہ بالآخر ۹ رجون ۷۴۷ء کی صبح کو خراسان کے ایک گوشے سے ابومسلم نے عباسیوں کا سیاہ جھنڈ بلند کردیا اور گو عباسیوں کے دورِ حکومت میں ایران پوری طرح مطمئن نہ ہوسکا۔ لیکن جب چنگیز خاں کے حملے کے بعد ایران میں ایک مستقل خود مختار حکومت کی بنیاد قائم ہوئی تو ایرانیوں کے دل کے پھپھولے پھوڑنے کا کافی موقعہ ملا۔ چنانچہ خاندان صفویہ اٹھا اور اس نے صحیح معنوں میں عربوں سے اس طرح انتقام لیا کہ سارے ملک کو بہ نوک شمشیر شیعیت کے رنگ میں رنگ دیا"۔

('نگار' جولائی ۱۹۳۵ء صفحہ ۶۰ مضمون از ابوسعید بزمی)

جنھیں ابوسعید بزمی ایرانیوں کے "دل کے پھپھولے" کہہ رہے ہیں یہ وہ داغ تھے جو اموی ظلم و ستم کی آگ نے بخشے تھے۔ رہا شیعیت کا "بہ نوک شمشیر" پھیلنا۔ تو آج تک یہ الزام صرف اسلام پر لگایا جاتا تھا کہ اسلام تلوار کے ذریعے پھیلا ہے۔ کہیں یہ پڑھنے اور سننے میں نہیں آیا کہ شیعیت تلوار کی نوک پر پھیلی۔ ہاں اگر بزمی صاحب شیعیت کو عین اسلام اور اسلام کو عین شیعیت سمجھتے ہیں تو یہ ان کی نیک نیتی پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ ویسے یہ ضرور ہے کہ اگر شیعیت واقعی تلوار کی نوک پر پھیلی ہوتی تو جہاں جہاں اسلام پھیلا ہے وہاں وہاں شیعیت کا ہونا لازمی امر تھا۔ لیکن ایسا کیونکر ہوتا کہ تاریخ میں جو زمانہ فتوحات اسلامی کا شاندار دور سمجھا جاتا ہے ان خلیفاؤں اور حاکموں کا ہے جنھیں کسی بھی زاویے سے شیعہ نہیں کہا جاسکتا۔ ان میں بہت سے تو خود بدترین دشمنانِ شیعہ تھے (جیسے حجاج بن یوسف جس کے دور میں ہندوستان فتح ہوا) اعداد و شمار اور مشاہدہ و مطالعہ بھی بتاتا ہے کہ وسیع و عریض ممالک اسلامی میں شیعیت آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ یہ نمک اپنے تمام تر ذائقہ کے ساتھ ایران میں شدت سے پایا جاتا ہے۔ لیکن اس کی وجہ "نوک شمشیر" نہیں بلکہ "دستِ شفقتِ رسولؐ" ہے۔ جو کسی بھی حال میں ظالم نہیں

ہوسکتا۔ بلکہ نواب نصیر حسین خیال لکھتے ہیں کہ "پیغمبر عربیؐ نے عجمیوں کو ہمیشہ بہ نظر لطف دیکھا۔ نوشیروان عادل کے عہد میں اپنے وجود ذی جود پر آپ نے فخر فرمایا اور فارسیوں کو اپنی محفل و مجلس میں سرفراز کیا۔ اور سلمان فارسی کا قصہ کسے معلوم نہیں کہ ان کے سے عجمی غلام کو آپ نے آقائے اعراب ہی نہیں بنایا بلکہ انھیں "من اہل بیتی" فرما کر اپنے گھر میں داخل کرلیا۔ یہ وہی مذاق و اثر تھا کہ اہل بیتِ رسولؐ میں فارسیوں کی ہمیشہ قدر رہی اور فارسی جنگوں کے بعد جب شاہزادای ساسانیان حضرت شہر بانو مدینہ لائی گئیں تو جناب امیرؑ کے تدبر قدردانی سے وہ شہزادۂ عرب جناب امام حسینؑ کے محل میں ملکہ و مالکہ بن کر رہیں۔ رسول عربی کی نسل ان شہر بانو کی جہت سے چلی اور پھیلی اور آج دنیا میں لاکھوں سادات عرب عجم کے اس اتفاق سے ہماری زمین پر نظر آتے ہیں اور فخر کرتے ہیں۔ (ماہنامہ 'نگار' فروری ۱۹۳۵ء "اشوزلہ دشت" نواب نصیر حسین خیال۔)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ شیعیت ایران کی دین نہیں، ہاں ایران کی پروردہ ضرور ہے۔ البتہ جب ایران میں صفوی حکومت نے اقتدار حاصل کیا تو انھیں کھلم کھلا اپنے عقائد کا بھرپور انداز میں اظہار کرنے کا موقع ملا۔ اور اسی اظہار کو مخالفین نے مجوسیت، عیسائیت اور یہودیت کا نام دے دیا۔ یہودیت کے سلسلے میں پہلے بحث کی جاچکی ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ بقول احمد امین مجوسیت نے شیعیت کو متاثر کیا یا شیعیت نے مجوسیت کو۔ ان دونوں مذہبی نظریوں کا ایک تقابلی مطالعہ ضروری ہے۔ نواب نصیر حسین خیال نے اس تقابلی مطالعہ کے بعد جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ حیرت انگیز ہونے کے ساتھ ساتھ قابلِ توجہ بھی ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"مذہب اسلام اور کیش زردشت واقعی اس درجہ ملتے جلتے ہوئے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ ہمارے آنحضرتؐ پر ان کے خاندان میں سب سے اوّل امیر مومناں حضرت علیؑ ایمان لائے۔ اسی طرح اشوزردشت کی تصدیق پہلے ان کے چچا زاد بھائی خدیو ماہ نے کی۔ آنحضرتؐ نے دشمنوں کے خوف سے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ زردشت بھی اسی طرح یان ویج (مقامے در ایران) سے باختر جاتے اور وہاں تبلیغ کرتے۔ لارہبانیت فی الاسلام ہمارا قانون ہے اور زردشت کا بھی یہی آئین۔ قیامت کے قریب ہم بھی ایک مہدی وہادی کے آنے کا اعتقاد رکھتے ہیں اور زردشتی اس موقع پر شوشیان نام کے ایک بزرگ کے ظاہر ہونے کی پیشن گوئی کرتے

ہیں۔ زردشتوں کے وہاں قیامت میں جس پل پر سے گذرنا ہوگا اس کا پہلوی نام چنات ہے اور عربی میں (اس کا معرب) صراط ہے۔ ان کی ہماری رسمیں بھی اکثر ایک ہیں۔ شام کو چراغ دکھائی دیا اور ہم نے دعا پڑھی۔ زردشتیوں کے سامنے آتش نمودار ہوئی اور انھوں نے حمد کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ ہمارے انکے مذہبی مراسم بھی دور نہیں ہیں۔ ہم نماز کے لیے وضو کرتے ہیں۔ ہماری نماز پنج وقتہ ہے اور انکی عبادت بھی دن میں پانچ مرتبہ۔ اسے دیکھ کر اکثر اربابِ دانش کا خیال ہے کہ ہماری پنج وقتہ نماز زردشتیوں کی تقلید ہے ورنہ اسلام میں وہ صرف تین دفعہ فرض تھی۔"

(ماہنامہ 'نگار' فروری ۱۹۳۵ء "اشو زردشت" نواب نصیر حسین خیال)

اس حیرت انگیز مماثلت کے مطالعے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے مجوسیت اور اسلام میں سوائے ہادی مہدی کے عقیدے کے اور کوئی خالص شیعی نظریہ نہیں ہے۔ لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ مجوسیت نے شیعیت کو متاثر کیا۔ کیونکہ اگر یہ مان لیا جائے تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ صرف شیعیت ہی نہیں بلکہ پورا اسلام مجوسیت کا چربہ ہے۔ کیونکہ مجوسیت اسلام سے بھی پرانا مذہب ہے لیکن حقیقت یہ نہیں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ جب فتح ایران کے بعد مسلمان اسلام کو لے کر ایران میں داخل ہوئے تو اس کی قبولیت مجوسیوں کے لیے کوئی مشکل مرحلہ نہ بن سکی۔ بلکہ اس حیرت انگیز مماثلت کی وجہ سے انھوں نے بہت جلد۔ بآسانی اور بخوشی اسے قبول کرلیا۔ اور بعد میں سیاسی حالات کے پیش نظر امویوں کے ظلم وستم نے انھیں خود بخود شیعیت اسلام کی طرف راغب کر دیا جو ہاشمیوں کا مسلک تھا اور چونکہ بانی اسلام ہاشمی تھا لہٰذا نومسلم ایرانیوں نے حضرت علیؑ اور اہل بیت کے مسلک پر کاربند رہنا پسند کیا۔ یوں ایران میں شیعیت اسلام تقویت پاتی رہی۔

چنانچہ مشہور مورخ ایچ. آر. گب لکھتا ہے۔

" At a very early stage, however, the Shi-ite name was used to cover a number of totally different activities and served as a cloak for the introduction into Islam of all sorts of old oriental beleifs Baby lonaian, Persian and even Indian. The conversion of large numbers of earlier inhabitants of ten conquered countries necessarily led to a wide spread unsettlement of religious beliefs which

favoured the spread of esoteries sects and led to the religions struggles of early countries. The Hellenistic elements as a rule attacheed themselves to the sunni or majority party, while the older Asiatic beliefs tended rather to attack themselves to persons, of Ali. From their very nature, however such beliefs were held and propegated mainly by non-Arabs and were specially by the anixed population of Iraque. There are indications also that Shiaism in the early centuries was among the people, the standard rather of a social revolt against the Sunni ruling classes than of a theological opposition to the Sunni doctrines. It shoul be said at once that the still fartoo prevalant view that Peria was the original name of Shi-ism has no foundation at all and it is notiworthy that converts from Zorastrianism adopted in general the Sunni rather than the Shi,ite faith "

اپنی ابتدائی شکل میں لفظ شیعہ کم وبیش مختلف تحریکات کے لیے استعمال ہوتا تھا اور اسلام میں تمام مشرقی نظریات بابلی، ایرانی اور ہندوستانی وغیرہ کے داخلے کا ذریعہ تھا۔ مفتوحہ ممالک کے قدیم باشندوں کی ایک بڑی تعداد کی تبدیلی مذہب نے لازمی طور پر ایک وسیع اور غیر منظم مذہبی نظریہ کو پیدا کیا جس نے ایک جدید فرقے کے نظریہ کی موافقت میں مدد دی اور ابتدائی صدیوں میں مذہبی کشاکش کو راہ دی۔ جدید یونانی طرز حکومت نے اکثریت کو یعنی سنیوں کو متاثر کیا۔ جبکہ قدیم ایشیائی معتقدات نے شیعیانِ علیؑ کو اپنی طرف راغب کیا۔ اپنے فطری انداز میں یہ معتقدات پروان چڑھتے رہے اور خاص طور پر غیر عرب اقوام میں ان کی تشہیر زیادہ ہوئی اور وہ بھی خصوصاً عراق کی مخلوط آبادی میں۔ بہت سی نشانیاں ایسی ملتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیعیت ابتدائی صدیوں میں سنّی نظریات کے اختلاف کی بہ نسبت سنّی حکمراں جماعت کے خلاف ایک سماجی انقلاب کے معیار کی حیثیت زیادہ رکھتی تھی۔ لہٰذا یہ کہنا چاہیے کہ یہ نظریہ کہ شیعیت کا اصلی مسکن ایران تھا۔ سرے سے کوئی بنیاد ہی نہیں رکھتا اور یہ امر قابل توجہ ہے کہ زرتشی مذہب سے

منحرف ہو کر لوگ زیادہ تر سنّی مذہب میں آئے نہ کہ شیعہ مذہب میں۔"

رگب کے اس بیان سے بہت سی باتوں کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ اوّل یہ کہ لفظ شیعہ بہت پہلے سے مستعمل تھا اور کسی بھی تحریک کے سلسلے میں استعمال ہوتا تھا جیسے شیعہ علی، شیعۂ معاویہ وغیرہ۔ دوسرے یہ کہ فتوحات اسلامیہ کے بعد ایک فرقہ جو جدید یونانی طرز حکومت (جمہوریت) وغیرہ سے متاثر ہوا۔ (اور وہ اہل سنت والجماعت تھے) جبکہ شیعان علی قدیم ایشیائی معتقدات (الٰہی حکومت) کے قائل تھے یوں مسلمانوں میں فرقہ بندی ہوئی۔ تیسرے یہ کہ شیعوں کا اختلاف سنّی نظریات سے نہیں بلکہ سنّی حکمرانوں کے خلاف ایک سماجی انقلاب کی حیثیت رکھتا تھا۔ یعنی چونکہ شیعہ اس طرز حکومت کے مخالف تھے لہٰذا انھوں نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ چوتھے یہ کہ مجوسیت ترک کر کے اسلام میں داخل ہونے والے لوگ زیادہ تر سنّی تھے۔ شیعہ نہ تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ سنّی امام ابوحنیفہ کا مذہب فارس کے شہروں میں جتنا پھیلا اتنا کوئی دوسرا مذہب نہیں پھیلا وہ علماء بھی جنھوں نے اس مذہب کی نشر و اشاعت کی زیادہ تر فارس ہی کے تھے۔ اسی طرح بڑے بڑے حفاظ حدیث اور علمائے سنت بھی زیادہ تر فارس ہی کے رہنے والے تھے جیسے بخاری، حاکم، بیہقی، ترمذی وغیرہ۔ زیادہ تر صوفیائے کرام بھی ایران کے تھے۔

۱۲۔ شیعہ قاتلان حسینؑ ؟

بعض ناقص العقل حضرات کا یہ بھی خیال ہے کہ شیعہ وہ گروہ ہے جس نے میدانِ کربلا میں امام حُسینؑ اور ان کے ساتھیوں کو شہید کیا۔ حالانکہ یہ نظریہ بہت حد تک نزاعی ہے۔ اور اس کے تعلق سے ہر دو فریقین کی جانب سے جواب در جواب کتابوں کا سلسلہ بھی موجود ہے۔ اس کے باوجود بھی یہ خیال بہت احمقانہ نظر آتا ہے۔ کیونکہ نہ عقل اس کو تسلیم کرتی ہے نہ انسانی نفسیات اس کو گوارا کرتی ہے، اور نہ تاریخ اس کی اجازت دیتی ہے۔ مختصراً صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ قاتلانِ حسینؑ شیعہ تھے نہ سُنّی۔ وہ حقیقتاً مومن و مسلمان ہی نہ تھے بلکہ یہ کہا جائے کہ وہ انسان کہلانے کے بھی مستحق نہ تھے تو غلط نہ ہوگا۔ پھر یہ شیعہ ہونے نہ ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ البتہ بعض روائتیں ضرور ملتی ہیں جن

سے شیعوں کی برات ثابت ہوتی ہے، جیسے مشہور روایت کہ: "جب زہیر بن قین یزیدی فوج کو امام سے لڑنے سے روکنے کے لیے نصیحت کرتے ہیں تو ان کا ایک واقف کار یزیدی سپاہی کہتا ہے۔

یاذهیر ملکنت عند نامن شیعة اهل هذا لبیت انماکنت عثمانیا

(طبری جلد ۶ صفحہ ۶۱ مطبوعہ حسینیہ مصر ۱۳۲۶ھ۔ بحوالہ حاشیہ تنویر الشہادتین (ترجمہ سِرّ الشہادتین) صفحہ ۵۸۔)

(اے زہیر تم تو کبھی ان اہل بیت کے شیعہ نہ تھے بلکہ عثمانی تھے)

اس روایت کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شیعہ قاتلانِ حسینؑ نہیں۔ تو سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا عثمانی قاتلانِ حسینؑ تھے؟ ملاحظہ ہو طبری جلد ۶ صفحہ ۲۳۴۔

"ابن زیاد نے عمر ابن سعد کو حکم بھیجا کہ حسینؑ پر پانی بند کر دو اس طرح کہ ایک قطرہ پانی بھی انکو نہ ملے جیسا کہ متقی، پاکیزہ، مظلوم امیر المومنین عثمان بن عفان کے ساتھ کیا گیا۔" (بحوالہ تنویر الشہادتین صفحہ ۲۸)

اگر عثمانی قاتلانِ حسینؑ تھے تو زہیر بن قین (اگر وہ عثمانی تھے جیسا کہ اس سپاہی کے الفاظ ہیں) امام حسین کے ناصروں میں سے نہ ہوتے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ قصاصِ عثمان کے نام سے دشمنانِ اہلِ بیت ہمیشہ ہی فائدہ اٹھاتے رہے اور شیعوں اور سنّیوں کو ایک دوسرے سے لڑاتے رہے۔ یہ وہ شر پسند عناصر تھے جو اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اسلامی اتحاد کو نقصان پہنچا رہے تھے۔

اس کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ عام طور پر قاتلانِ حسینؑ میں جن تین اشخاص کے نام سرِ فہرست ملتے ہیں وہ یزید (حکم قتل دینے والا) ابن زیاد (یزید کا حمایتی شریک سازش قتل) اور عمر بن سعد (محرک قتل حسینؑ) کے ہیں اور ان تینوں کے نظریات شیعی عقائد سے میل نہیں کھاتے لہٰذا یہ لوگ شیعہ نہیں کہلا سکتے۔ آج تک کسی نے ان تینوں کی شیعیت ثابت نہیں کی اور شیعہ تو کیا یہ صحیح معنوں میں مسلمان بھی نہ تھے۔ ان کا مذہبی ملمع تو شہادت حسینؑ کے فوراً بعد ہی اتر گیا جب یزید نے جشنِ فتح کی خوشی میں جام پر جام چڑھاتے ہوئے یہ اشعار عالمِ مستی میں پڑھے....

لیت اشیاخی ببدد شهدوا　　　جزع الخزرج من وقع الامل

(کاش میرے جنگ بدر والے بزرگ موجود ہوتے اور وہ مشاہدہ کرتے فریقِ مقابل کی

گھبراہٹ کا نیزوں کے مقابلے میں)

لعبت هاشم بالملك وه   خبر جآء ولا وحی نزل

(یہ تو بنی ہاشم کو سلطنت کا کھیل کھیلنا تھا نہ کوئی خبر آئی تھی نہ آسمان سے کوئی وحی اُتری تھی)

لو داؤد لاسهلو افرحا   ثمه قالو ایایزید لا متثل

(اگر میرے بزرگ اس موقع کو دیکھ لیتے تو خوشی کے مارے کھل جاتے اے یزید کبھی تیرے ہاتھ شل نہ ہوں۔ (قاتلانِ حسینؑ کا مذہب۔ از سید علی نقی نقوی۔ صفحہ ۱۵ تا ۱۸)

یزید خود فخر کرتا ہے کہ میں نے حسینؑ سے رسول کا بدلہ لیا ہے۔

لست ممن خندف ان لمرا نقتم   من نبی احمد ملکان فعل

(میں اولاد خندف سے نہ ہوتا اگر میں اولاد احمد سے بدلہ نہ لیتا ان باتوں کا جو (آنحضرت) کر چکے تھے) (مقتل ابی مخنف صفحہ ۵۹ مطبوعہ بمبئی ۱۳۱۱ھ ینابیع المودۃ باب ۶ صفحہ ۲۷۶ مطبوعہ بمبئی ۱۳۱۱ھ۔ بحوالہ تنویر الشہادتین صفحہ ۵ (ترجمہ سر شہادتین از شاہ عبدالعزیز)

اسی طرح عبیداللہ ابن زیاد کے متعلق یزید کا یہ کہنا کہ:

صاحب الودو الامانتة وامزید معلّی ومغنمی وجهادی

(وہ کہ جو خالص دوست امانت دار اور میری تائید کرنے والا اور میرا سرمایۂ زندگی اور جنگ میں میرا مددست ہے، اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وحی کو کھیل سمجھنے والے یزید کا حامی اور تائید کرنے والا کیسا مسلک رکھتا تھا۔ رہا عمر بن سعد جسے ابن زیاد نے قتل امام پر معمور کیا تھا تو وہ بھی قتل حسینؑ کے عمل پر کہتا ہے... "وہ لوگ کہتے ہیں کہ خدا نے کوئی جنت خلق کی ہے اور آگ اور عذاب اور ہاتھوں کی ہتھکڑیاں۔ اچھا تو اگر یہ لوگ سچے ہیں ان باتوں کے کہنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ میں دو ہی برس کے اندر اس گناہ سے توبہ کرلوں گا۔ اور اگر یہ غلط کہتے ہیں اور جنت اور دوزخ کی کوئی حقیقت نہیں تو پھر کیا ہے۔ پھر تو ہم ایک عظیم دنیا اور ایسے ملک کے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے جس کی نعمتیں باقی رہنے والی ہیں۔"

(قاتلانِ حسین کا مذہب از سید علی نقی نقوی صفحہ ۱۹ سے ۲۰۰۔)

عقیدۂ معاد اور جنت اور دوزخ کے وجود کے متعلق تشکیک رکھنے والا شخص مسلمان نہیں ہوسکتا،

چہ جائیکہ اس کا شیعہ یا سنّی ہونا۔ لہٰذا وہ لوگ قاتلانِ حسینؑ کا مذہب 'شیعیت' اور 'سنّیت' میں تلاش کرتے ہیں انتہائی بیوقوف ہیں۔ قاتلانِ حسین نہ شیعہ تھے نہ سنّی۔ وہ حقیقتاً مسلمان ہی نہ تھے۔

۱۳۔ شیعہ یا رافضی :-

شیعوں کو رافضی کے نام سے بھی پکارا جاتا رہا ہے جیسا کہ مشہور ہے۔

"الروافض فرقة من كبار الفرق الاسلاميه وتسمّى باشيعة"

(روافض کا فرقہ اسلام کے بڑے فرقوں میں ہے، جس کا نام شیعہ ہے۔ (رافضیت صفحہ ۹۶)

لفظ "رافضی مشتق ہے 'رفض' سے بمعنی ترک کرنا۔ چھوڑ دینا۔ رافضی یعنی ترک کرنے والا۔ رافضہ (رافضیوں کا گروہ) رافضیت یعنی رافضی ہونا۔ مولوی محمد رفیع خاں فاضل دیوبند اپنی تالیف "جامع اللغات" اردو مطبوعہ شانتی پریس الہ آباد صفحہ ۳۲۷ پر تحریر فرماتے ہیں۔

"رافضی۔ ع۔ رافضہ سے منسوب۔ رافضہ وہ گروہ جو اپنے سردار سے الگ ہو جائے یا اس کو چھوڑ دے۔ وہ پیروانِ علیؑ جنھوں نے جنگ جمل میں آپ کا ساتھ چھوڑ دیا"۔

(حالانکہ جنگِ جمل میں نہ کوئی حضرت علیؑ کے لشکر سے علیحدہ ہوا نہ رافضی کہلایا)۔

پیران پیر عبدالقادر جیلانی لکھتے ہیں۔

"شیعہ کو شیعہ اس واسطے کہتے ہیں کہ وہ حضرت علیؑ کی پیروی کرتے ہیں اور ان کو سب خلیفوں پر ترجیح دیتے ہیں اور رافضہ ان کا اس سبب سے نام رکھا گیا کہ وہ اکثر صحابہ کو نہیں مانتے اور حضرت ابوبکر و حضرت عمر کی خلافت کو تسلیم نہیں کرتے۔ (غنیۃ الطالبین مترجم مطبوعہ نول کشور۔ صفحہ ۱۵۵)

مولوی عبیداللہ امرتسری لکھتے ہیں۔

"ساتواں گروہ شیخین اور حضرت عثمان کی تنقیص کرتا تھا۔ چونکہ ابتدا ہی سے اہل سنت کی جماعت کثیر اطراف بلاد میں پھیلی ہوئی تھی اور یہ ساتویں قسم کا گروہ اقلِ قلیل دنیا میں آباد تھا۔ بوجہ تخالفِ مذہبی کے اہل سنت اس ساتویں گروہ کو ان کے چڑانے کے واسطے ان کو رافضی کہنے لگ گئے"۔

(رافضیت از سید نذر عسکری صفحہ ۹۶۔ تاریخ وعقائد شیعہ امامیہ۔ صفحہ ۴۵)

مولوی نذیر احمد ''مجموعۃ الرسائل فی تحقیق المسائل'' مطبوعہ بمبئی میں بحوالہ غنیۃ الطالبین شیخ عبدالقادر پیران پیر جیلانی لکھتے ہیں۔

''کہا گیا ہے کہ شیعہ وہ شخص ہے جو حضرت عثمان کو حضرت علیؑ پر فضیلت نہ دے یعنی برابر جانے اور رافضی وہ شخص ہے جو فضیلت دیوے حضرت علیؑ کو حضرت عثمان پر۔ اس سے ثابت ہے کہ جو حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر اور حضرت عثمان کو فضیلت نہ دے حضرت علیؑ پر وہ شیعہ ہے سنت و جماعت نہیں ہے اور حضرت علیؑ کو ان پر فضیلت دینے والا رافضی ہے''۔

اسی بیان کی روشنی میں سید نذر عسکری اپنی کتاب ''رافضیت'' میں لکھتے ہیں۔

''عہد حضرت موسیٰ علیہ السلام میں جب بنی اسرائیل نے فرعون کی اطاعت ترک کی اور متابعت حضرت موسیٰ اختیار کی تو ہوا خواہانِ فرعون نے انکو رافضی کہا''غنیۃ الطالبین'' میں جناب غوث الاعظم نے تارکانِ امامتِ شیخین کو رافضی فرمایا ہے۔ اس سے آئمہ اطہار کے اقوال کی تصدیق ہوتی ہے۔ احادیث معتمد و مستند بین المسلمین میں وارد ہے کہ فرمایا رسولؐ برحق نے کہ میری امت کے لوگ قدم بقدم امتِ موسیٰ کے چلیں گے لہذا امت محمدیہ میں بھی گروہ رافضی کا ہونا لازمی ولابدی تھا اور حسب ارشاد نبوی جناب امیرؑ سرور کائنات سے بمنزلہ ہارون من موسیٰ تھے۔ پس رافضیت بھی محبانِ علیؑ کی جانب بوجہ ترک کرنے فراعنۂ امتِ محمدیہ کے آئی۔ اور شیعانِ علیؑ ..... بہ لقب رافضی ملقب ہوئے۔ اسی طرح امتِ موسیٰ کے روافض بھی بہ لقب شیعہ موسوم تھے جیسا کہ امام سیوطی نے حسن المحاضرہ فی الاخبار المصر والقاہرہ صفحہ ۲۹ پر ایک طویل عبارت کے اندر یہ فرمایا ہے۔ ''جن لوگوں نے فرعون کو ترک کیا تھا ان کا لقب بھی شیعہ تھا'' پس یہ سمجھ لیجئے کہ ہر شیعہ رافضی ہے اور ہر رافضی شیعہ۔ شیعہ تولائی لقب ہے اور رافضی تبرائی''۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو لوگ محبت علیؑ و محبت اہل بیت میں سارے عالم سے درگذرے ان کو رافضی کہا گیا۔ رفض کے الزام سے شیعہ تو شیعہ امام شافعی جیسے حضرات بھی محفوظ نہ رہ سکے اور انھیں کہنا پڑا کہ:

لوکان رفضاً حُبّ آلِ محمدٌ فلیشهد الثقلان انّی رافضی

(اگر رفض محبت آلِ محمدؐ کا نام ہے۔ تو دونوں جہان گواہ رہیں کہ میں رافضی ہوں)

۱۴ ۔ شیعہ ۔ غالی فرقہ ؟

شیعوں کو اکثر غالی بھی کہا جاتا ہے۔ غالی بنا ہے غلو سے اور غلو کے معنی ہیں حد سے آگے بڑھنا۔ یہ حقیقت ہے کہ تاریخ اسلامی میں حضرت علیؑ کی ذات اقدس وہ واحد ذات ہے جس کو عام طور پر مسلمان سمجھ نہ سکے۔ یا تو انکا مرتبہ گھٹا دیا گیا اور منبر سے گالیاں دلوائی گئیں یا پھر ان کا مرتبہ اس قدر بڑھا دیا گیا کہ خدائی سے جا ملایا۔ نصیری وہ فرقہ ہے جو حضرت علیؑ کو خدا کہتا ہے اور غلو کی آخری منزل یہی ہے۔ لہذا شیعہ غالی نہیں کہلا سکتے۔ نصیری بھی شیعوں کا فرقہ نہیں جیسا کہ عام طور پر غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ شیعہ خود اس فرقے کو خارج از اسلام سمجھتے ہیں۔ حضرت علیؑ کی خدائی کا اعتراف تشیع میں دور دور تک نہیں ہے۔

البتہ غلو کی توضیح ابن حجر عسقلانی نے اس طرح کی ہے۔

''والتشیع محبۃ علیؑ و تقدعیه علیؑ و تقدعیه علیؑ الصحابته فمن قدمه علیؑ ابی بکر و عمر فهو غال فی التشیع'' (مقدمہ فتح الباری)

(تشیع کے معنی ہے حضرت علیؑ سے محبت کرنا اور انکو صحابہ پر مقدم کرنا پس جو شخص حضرت علیؑ کو ابوبکر و عمر پر مقدم کرے وہ تشیع میں غالی ہے۔)

اگر ابن حجر عسقلانی کی اس توضیح کو مان لیا جائے تو پھر وہ تمام صحابہ کرام جن میں ابوذر غفاری، عمار بن یاسر، مقداد ابن اسود، جابر ابن عبداللہ، حذیفہ یمانی، ابوسعید خدری، زید ابن ارقم وغیرہ بھی غالی ٹھہرتے ہیں کہ یہ سب حضرت علیؑ کو فضیلت دیتے تھے۔ لیکن چونکہ ان کے لیے کہیں بھی لفظ غالی استعمال نہیں کیا گیا۔ لہذا بعد کے آنے والے شیعوں کے لیے یہ لفظ استعمال کرنا درست نہیں۔ کیونکہ ان کا عقیدہ ان صحابہ رسول سے الگ نہیں۔

۱۵ ۔ شیعہ بدعتی ؟

حضرت علیؑ کو فضیلت دینے کی بناء پر بعض لوگ شیعوں کو بدعتی بھی کہتے ہیں۔ جس کا اعتراف مولانا عبیداللہ امرتسری ''ارجح المطالب'' کے صفحہ ۱۶۴ پر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''بدعت وہ امر ہے جو دین میں پیدا کیا جائے۔ جس کا ماخذ (ثبوت) کتاب و سنت و آثار

صحابہ میں نہ ہو.....''

جناب امیر کی فضیلت کا ثبوت احادیث صحیحہ و آثار سے ملتا ہے۔ سب سے قطع نظر صرف ایک حدیث جو تمام آئمہ حدیث کے نزدیک ''اثبت الاخبار'' اور ''اصح الاحادیث'' ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا۔

انت منّی بمنزلیته هارون من موسیٰ ۔(اے علیؑ! تیری منزلت مجھ سے ویسی ہی ہے جیسی ہارون کی موسیٰ سے تھی)

مولانا عبید اللہ امرتسری تحریر کرتے ہیں کہ مذہب تفضیل یعنی حضرت علیؑ کو سب صحابہ سے افضل ماننا کثرت سے تابعین اور تبع تابعین میں رائج تھا۔ لہٰذا ہم کو تھوڑی دیر کے لیے نگاہ اٹھا کر بدعت قرار دینا بذات خود بدعت ہوگی۔ لہٰذا شیعوں کو بدعتی کہنا مناسب نہیں کیونکہ اگر اس فرقے کو بدعتی کہتے ہیں تو طبقۂ اوّل کے بہت سے صحابہ کو بھی بدعتی کہنا پڑے گا۔

۱۶ ۔ شیعہ اور عہد رسولؐ :

شیعوں کو بدعتی کہا جائے، غالی کہا جائے، رافضی سمجھا جائے یا ان کی پیدائش یہودیت، مجوسیت اور عیسائیت کی مرہون منت سمجھی جائے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ رسولؐ اکرم کی بے شمار حدیثیں ایسی موجود ہیں جن سے شیعوں کا عہد رسولؐ میں پایا جانا ثابت ہوتا ہے۔

جابر بن عبداللہ انصاری سے روایت ہے کہ ہم جناب رسالتمآب کی خدمت میں حاضر تھے کہ جناب امیر تشریف لائے۔ آنحضرتؐ نے ارشاد کیا۔ ''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ یہ (علیؑ) اور اس کے شیعہ بس وہی تو قیامت کے روز جنت کے رفیع درجوں تک پہنچنے والے ہیں۔'' اس حالت میں یہ آیت نازل ہوئی۔ اِنّ الّذین امنوا و عملو الصالحات او لٰئك هم خیر البریه (وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک کام کرتے ہیں وہی تمام خلقت سے بہتر ہیں۔ (خوارزمی سیوطی فی دُرِّ منثور ارجح المطالب صفحہ ۵۲۱)

ابن عساکر، جابر ابن عبداللہ کی زبانی بیان کرتے ہیں ہم رسالتمآب کی خدمت میں حاضر تھے کہ سامنے سے علیؑ نمودار ہوئے۔ پیغمبرؐ نے علیؑ کو دیکھ کر فرمایا ''قسم ہے اس پاک پروردگار کی جو

میری جان کا مالک ہے کہ قیامت میں یہ اور اس کے شیعہ ہی کامیاب رہیں گے۔'' (بحوالہ اصل و اصول شیعہ۔ صفحہ ۲۵)

ابن عدی ابن عباس سے ناقل ہیں کہ آئیہ وافی ھدایہ ''ان الذین امنوا و عملو الصالحات'' نازل ہوئی تو حضرت ختمی المرتبتؐ نے علیؑ ابن ابی طالب سے ارشاد فرمایا کہ اس سے مراد تم اور تمہارے شیعہ ہیں جو قیامت میں خوش و خرم ہونگے۔'' (بحوالہ اصل و اصول شیعہ۔ صفحہ ۳۱)

ابن حجر مکّی نے بھی 'صواعق محرقہ' میں ان سے بعض احادیث کو دار قطنی کے حوالے سے درج کیا ہے۔ اور جناب اُمّ سلمہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ''اے علیؑ! تمہیں اور تمہارے شیعوں کو جنت نصیب ہوگی۔ (ایضاً)

ابن اثیر نے بہ سلسلۂ لفظ ''قمح'' لکھا ہے کہ رسول کریمؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا۔ ''بارگاہ ایزدی میں جب حاضری ہوگی تو تمہارے ساتھ تمہارے شیعہ بھی شادکام آئیں گے اور دشمنوں کا یہ حشر ہوگا کہ غضب میں مبتلا اور ہاتھ پسِ گردن سے بندھے ہوئے ہونگے۔'' (ایضاً)

اس کے بعد آنحضرت نے اپنے دونوں ہاتھوں کو گردن کے پیچھے لے جا کر بتایا کہ دیکھو یوں بندھے ہونگے۔'' (بحوالہ اصل و اصول شیعہ صفحہ ۳۱)

زمخشری کی ''ربیع الابرار'' میں سرکار دو عالمؐ کا یہ ارشاد نظر آتا ہے۔

''اے علیؑ! قیامت کے دن دامن رحمت باری میرے ہاتھ میں ہوگا اور میرا دامن تمہارے ہاتھ میں۔ تمہاری اولاد تمہارا دامن تھامے گی اور تمہاری اولاد کے شیعہ ان کے دامن سے متمسک ہونگے۔'' (مسند احمد اور خصائص نسائی میں بھی اس کا ذکر ہے)۔

مدیر اصلاح فرماتے ہیں ''پیغمبرؐ کے ان مسلسل ارشادات سے بدیہی طور پر اس کا اندازہ تو کیا ہی جا سکتا ہے کہ پیغمبر کے زمانے میں کچھ نہ کچھ ایسے لوگ ضرور موجود تھے جو واقعی طور پر شیعیان علیؑ کہے جا سکیں۔ اگر ایسے موجود نہ تھے تو پیغمبر مدح و ثنا کن کی فرماتے تھے۔ شیعیان علیؑ کہہ کر قیامت میں رستگار ہونے کی سند کسے دیتے تھے؟

تھا بھی ایسا ہی۔ ایسے افراد واقعی طور پر عہد پیغمبر میں موجود بھی تھے۔ اور ایک یا تھوڑی تعداد میں بھی نہ تھے بلکہ اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو پیغمبر کی زندگی ہی میں علیؑ کے حلقہ بگوش ہو

چکے تھے اور انھیں پیغمبر کی جانشین و نائب اور اپنا امام و پیشوا مانتے تھے ۔ پیغمبر کی تعلیمات رموز و اسرار، علوم و معارف کا مفسر سمجھتے تھے اور اسی وقت سے ان کی شہرت ہی شیعیانِ علیؑ کے نام سے ہوگئی تھی۔ (ماہ نامہ اصلاح نومبر ۱۹۷۸ صفحہ ۲۴۵ حاشیہ)

یوں بھی ان تمام احادیث میں صرف شیعیت علیؑ ہی کا تذکرہ ہے کسی اور کی شیعیت کا ذکر نہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ عہد رسول میں ''شیعہ'' صرف انھیں لوگوں کے لیے استعمال ہوتا تھا جو حضرت علیؑ اور اولادِ علیؑ سے محبت کرتے اور ان کی پیروی کرنے والے ہیں۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ احادیث کی صحت کی بناء پر ابن حجر مکّی جیسے شخص کو نو سو برس بعد ''صواعق محرقہ'' میں یہ جواز شیعیت کے ضمن میں ڈھونڈ کر لانا پڑا کہ۔

''اہل سنت و جماعت ہی شیعہ اہل بیت ہیں کیونکہ یہی لوگ حکم خدا اور رسول کے مطابق ان کی محبت رکھتے ہیں اور اہل سنت کے سوا دوسرے لوگ درحقیقت محبِّ اہل بیت نہیں ہیں بلکہ انکے دشمن ہیں۔ (بحوالہ ارجح المطالب)

جہاں تک ابن حجر کی محبت اہل بیت کا سوال ہے وہ اس بات سے ظاہر ہے کہ وہ یزید کو مومن مانتا ہے۔ لہٰذا ایسا شخص اہل بیت کا دعویدار کیسے ہوسکتا ہے؟ شر کو چاہنے والا خیر کا حامی ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اندھیروں کا رفیق، اجالوں کا دوست کیونکر ہوسکتا ہے؟ چہ جائیکہ دعوائے شیعیت؟

آپ کے لب پہ اور وفا کی قسم ؟
کیا قسم کھائی ہے خدا کی قسم

لیکن ابن حجر کے چار سو سال بعد اور ظہور اسلام کے تیرہ سو سال بعد اس قسم کی آواز پھر دہلی کی سرزمین سے اٹھتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔ شیعوں کے مختلف فرقوں کا ذکر کرتے ہوئے شاہ عبدالعزیز ایک اصطلاح ''شیعہ اولیٰ'' کی وضع کرتے ہیں اور لکھتے ہیں۔

''اہل سنت والجماعت کہتے ہیں کہ ہم ہی شیعہ اولیٰ ہیں اور جو احادیث فضیلت شیعہ میں وارد ہیں ہمارے حق میں ہیں نہ کہ روافض کے؟''

(رافضیت صفحہ ۶۲۔ بحوالہ اثناعشریہ از شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی)

شاہ صاحب کے بیان کی روشنی میں تین سوال ذہن میں ابھرتے ہیں۔ اول یہ کہ اگر یہ شیعہ

اولیٰ ہیں تو پھر انھیں سنت والجماعت کا لقب کس سے عطا کیا اور کب سے؟ دوسرے یہ کہ پھر اس لقب (شیعہ) کو جو سنت والجماعت سے مخصوص تھا شیعوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کیسے اپنا لیا جبکہ دونوں فرقوں میں زبردست اختلاف تھا۔ تیسرے یہ کہ اہل سنت نے اپنے اصلی نام سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دستبرداری کیوں قبول کرلی؟ اور وہ بھی بخاموشی (کیونکہ تاریخ میں کہیں بھی اس سلسلے میں کسی ہنگامے کے نشانات نہیں پائے جاتے)۔ ہاں شاہ صاحب خود ہی اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

''باید دانست که شیعهٔ اولیٰ که فرقه سنّیه و تفضیلیه اند در زمانِ سابق بشیعه ملقب بودند و چون غلاته و روافض و زیدیان و اسمعیلیه بایں خودرا ملقّب کردند و مصدر قبائح و شر در اعتقادی و عملی گردیدند خوفاً عن التباس الحق بالباطل فرقه سنّیه و تفضیلیه آنرا بر خود نه پسندیدند خودرا اهل سنت و جماعت ملقب کردند ....''

(تحفۂ اثناعشریہ صفحہ ۱۷، اردو ترجمہ تحفۂ اثناعشریہ صفحہ ۱۶)

(..... اور یہ بھی جاننا چاہئے کہ شیعہ اولیٰ کہ فرقۂ سنیہ وتفضیلیہ ہر دو شامل ہیں، پہلے شیعہ کا لقب سے مشہور تھا اور جب غالیوں، رافضیوں، زیدیوں اور اسمٰعیلیوں نے یہ لقب اپنے لیے استعمال کیا اور عقائد و اعمال میں ان سے شر و قبائح سرزد ہونے لگے تو حق اور باطل کے مل جانے کے خطرے سے فرقۂ سنیہ وتفضیلیہ نے اس لقب کو اپنے لیے ناپسند کیا اور اس کی جگہ اہل سنت و جماعت کا لقب اختیار کیا۔)

تعجب ہے کہ وہ لقب جو رسول اکرمؐ نے اپنے مسلمانوں کو عطا کیا ہو شاہ صاحب محض اس وجہ سے ترک کرنے پر تلے ہوئے نظر آتے ہیں کہ اسے غلاۃ، روافض اور دیگر فرقوں نے اپنا لیا۔ کیا شاہ صاحب، اسلام، مسلمان، کلمہ، رسول اور قرآن ہر چیز کو محض اس وجہ سے چھوڑ سکتے ہیں کہ انھیں مسلمانوں کے وہ فرقے اپنائے ہوئے ہیں جو ان کی نظر میں معتوب ہیں؟

مولانا عبیداللہ امرتسری اس کا یوں جواب دیتے ہیں۔

''... لیکن یہ کہنا کہ اہل سنت ابتداء میں شیعہ کے نام سے مشہور ہوئے محض ادعا ہے جس کا

کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اگر اہل سنت ابتداء میں شیعہ مشہور ہوتے تو زیدیہ فرقے کے خروج کے پہلے جو اہل سنت گذر چکے ہیں۔ کوئی نہ کوئی اس نام سے مشہور ہوتے۔ حالانکہ وہی لوگ شیعہ کہے گئے جو جناب امیر کے افضل الصحابہ ہونے کے قائل تھے۔ ماسوا اس کے اگر اہل سنت ابتداء شیعہ مشہور ہوتے تو زیدیہ و اسمٰعیلیہ بوجہ خصومت اس نام کو پسند نہ کرتے۔ علاوہ بریں متاخرین اہل سنت ان شیعیان اولیٰ کو اعتقاد تفضیل کے باعث ہمیشہ بدعتی کہتے چلے آئے ہیں اگر اہل سنت اسی گروہ میں شامل ہوتے تو بے چارے مبتدع کیوں کہے جاتے۔"

لیکن شاہ صاحب اسی بات پر مصر ہوتے ہوئے آگے فرماتے ہیں۔

"حضرت امیر المومنین کے عہد میں شیعیت کے وجود میں آنے کے بعد اور شیعیت کے چاروں فرقوں میں بٹ جانے کے بعد جن میں سے ایک فرقہ اہل سنت و جماعت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے (یعنی وہی شیعہ اولیٰ اور مخلصین صحابہ و تابعین کا فرقہ) مذہب شیعہ میں اور بھی نئی نئی باتیں رونما ہوتی رہیں۔" (اردو ترجمہ تحفۂ اثنا عشریہ صفحہ ۱۶)

شاہ صاحب کا ابتدائی جملہ بتا رہا ہے کہ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ شیعیت حضرت امیر المومنینؑ کے عہد میں وجود میں آئی۔ یعنی اس سے قبل شیعیت کا وجود نہ تھا۔ پھر شاہ صاحب رسولؐ کی شیعہ اولیٰ والی حدیث کہاں سے لے آئے؟ اور شیعۂ اولیٰ کا لقب کہاں سے آیا؟

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایسا کوئی لقب تھا ہی نہیں۔ اور اگر تھا تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ شیعیت امیر المومنینؑ کے عہد سے پہلے وجود میں آ چکی تھی۔ پھر بقول شاہ صاحب امیر المومنینؑ کے عہد میں چار فرقوں میں بٹ گئی جن میں سے ایک فرقہ اہل سنت و جماعت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مگر یہاں بھی وہی سوال اٹھتا ہے کہ کب سے اور کیوں یہ لقب ملا؟ اگر شاہ صاحب کا پہلا بیان مان لیا جائے تو زیدیوں، اسمٰعیلیوں، رافضیوں اور غالیوں کے شیعہ کہلوانے پر یہ لقب سنیوں نے اختیار کیا۔ لیکن یہ سراسر غلط ہے۔ کیونکہ فرقہ اسمٰعلیہ ۱۴۸ھ میں ظاہر ہوا۔ اور ۱۴۸ھ کے بعد اہل سنت و جماعت نام رکھنے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ بلکہ اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ یہ نام اس سے بہت پہلے رکھا گیا۔ (مقدمہ صحیح مسلم صفحہ ۱۱)

اب غالی فرقہ کی طرف آیئے۔ یہ فرقہ ۴۰ھ میں موجود تھا۔ اور بقول شاہ صاحب اپنے کو

شیعہ کہتا تھا۔ لیکن اس وقت فرقہ سنیہ نے اپنا نام اہل سنت و جماعت نہیں رکھا۔ پھر ۱۲۱ھ میں زیدیہ فرقہ ظاہر ہوا اور اسی کے ساتھ ساتھ ایک گروہ رافضی بھی کہلوایا اور ان دونوں نے بقول شاہ صاحب شیعہ ہونے کا دعویٰ کیا۔ پھر بھی اہل سنت نے اپنا نام سنت والجماعت نہ رکھا۔ یہاں تک کہ ۱۴۸ھ میں اسمٰعیلیہ فرقہ نمودار ہوا اور تب (بقول شاہ صاحب) یہ نام رکھا گیا۔

کوئی بھی سوچ سکتا ہے کہ جب صدر اسلام میں اہل سنت و جماعت کا کوئی گروہ نہ تھا تو پھر یہ نام کس سنہ میں رکھ گیا اور کس کی قیادت میں؟ اور جس گروہ کے لیے یہ نام رکھا گیا اس کا عقیدہ کیا تھا؟ شاہ صاحب تو ان سوالوں کے جوابوں پر روشنی نہیں ڈالتے، البتہ تاریخ اس سلسلے میں چپ نہیں رہتی۔ علامہ یحییٰ بن الحسن قرشی "منہاج التحقیق" میں، شیخ العسکری "کتاب الزور جر" میں، ابن بطہ کتاب لاآبانہ میں، حسن سہیل "انوار البدریہ" میں تحریر فرماتے ہیں۔

"إن معاويه حسين سب علی ذایک العام عام السنت۔" (رافضیت صفحہ ۷۴)

(معاویہ نے جس سال علیؑ پر رسم تبرا جاری کیا وہ سال سنت کا سال کہا گیا)

علامہ ابن حجر مکی "حیواۃ الحیوان" جلد ا صفحہ ۷۴ اپر رقمطراز ہیں۔

"۴۱ھ کو جماعت کا سال اس لیے کہتے ہیں کہ اسی سال افتراق کے بعد امت اسلامی ایک امام پر متحد ہوئی۔" (رافضیت صفحہ ۷۵، بحوالہ جلد ا جلد ۲ صفحہ ۱۹۹)

علامہ موصوف "تطہیر الجنان" پر حاشیہ صواعق محرقہ صفحہ ۳۷ پر تحریر کرتے ہیں۔ "امام حسنؑ کی حکومت ظاہری سے دستبرداری دینے کے بعد تمام مسلمانوں نے معاویہ کی خلافت پر اتفاق کر لیا۔ اسی وجہ سے یہ سال جماعت کہلوایا۔ اس کے بعد پھر کسی نے بھی معاویہ کے خلیفہ ہونے پر نزاع نہیں کی۔" (رافضیت صفحہ ۷۵، بحوالہ جلد ا جلد ۲ صفحہ ۱۹۹)

عمدۃ القاری اور فتح الباری شرح بخاری کی مندرجہ ذیل عبارتوں سے بھی ظاہر ہے کہ

"امیر معاویہ کوفہ میں آئے اور لوگوں نے بیعت کی۔ پس نام رکھا گیا اس سال کا سنۃ جماعت (جماعت کا سال بسبب مجتمع ہونے لوگوں کے اور جنگ بند ہونے کے)۔"

(جلد ۶ صفحہ ۲۵۲ فتح الباری۔ تاریخ و عقائد شیعہ امامیہ صفحہ ۳۸)

نیز یہ کہ ـــــ

''امیر معاویہ نے لوگوں سے اپنی بیعت لی۔ پس یہ سال سنتہ جماعت (جماعت کا سال) ہو گیا۔'' عمدۃ القاری۔ (تاریخ وعقائد شیعہ امامیہ صفحہ ۳۸)

پس اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ۴۱ھ میں صلح کے بعد امیر معاویہ کوفہ میں آئے جہاں سے بہت سے لوگوں کا اجماع ان پر ہو گیا۔ اور اس سال کا نام سنتہ جماعت اور اس گروہ کا نام اہل سنت و جماعت ہو گیا۔

ان حقائق سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ تشیع عہد رسولؐ میں موجود تھا۔ چنانچہ امام ابو حاتم اپنی تصنیف ''الزینہ'' میں رقمطراز ہیں۔

پہلا نام جو زمانہ رسالت میں ظاہر ہوا وہ شیعہ ہے۔ یہ اصحاب میں چار اشخاص ابوذر، سلمان، مقداد، عمار کا لقب تھا۔ یہاں تک کہ جنگ صفین کا وقت آ گیا۔ اس وقت یہ نام دوست داران علیؑ کے لیے اچھی طرح مشہور ہو گیا اور پیروان معاویہ سُنّی کے نام سے مشہور ہوئے۔''

(رافضیت صفحہ ۵۳)

علامہ شہاب الدین احمد بن عبدالقادر الحفظی شافعی ''ذخیرۃ المال فی شرح عقد جواھر اللال الحفظی'' میں تحریر فرماتے ہیں۔

''صحابہ تشیع کے اعلیٰ رتبے پر فائز تھے۔'' (ایضاً صفحہ ۵۴)

علامہ موصوف بحوالہ دلائل الخیرات مصنفہ علامہ الشیخ محمد شارح کتاب مذکور میں لکھتے ہیں۔

''خود جناب رسول اللہ راس اہل بیت تھے اور صحابہ ''روؤس شیعہ'' عمار یاسر، خزیمہ بن ثابت ذوالشہادتین سعد بن عبادہ انصاری، قیس بن سعد۔ اویس قرنی وغیرہ ان کے علاوہ دوسرے اکابر اصحاب یہ لوگ تھے جنھوں نے سب سے پہلے ارکانِ ''شیعیت کو مضبوط کیا''۔

دمشق کے مشہور شیعہ مخالف مصنف محمد کرد علی اپنی کتاب '' خطوط الشام'' جلد ۵ صفحہ ۲۵۱ پر لکھتے ہیں۔

''پیغمبر کے زمانے ہی میں کبارِ اصحاب کی ایک جماعت علیؑ کی مولاۃ (انکی محبت و اتباع) میں مشہور تھی۔ جیسے سلمان فارسی جن کا یہ قول تھا کہ ہم نے رسول اللہ کی بیعت کی تھی اس بات پر مسلمانوں خیر خواہی کریں گے اور علیؑ کی اطاعت و پیروی اور ان سے موالاۃ رکھیں گے۔ اور جیسے ابو

سعید خدری جو کہا کرتے تھے کہ لوگوں کو پانچ باتوں کا حکم دیا گیا تھا۔ چار پر تو انھوں نے عمل کیا اور ایک کو چھوڑ دیا جب ان سے پوچھا گیا کہ وہ چار کون ہیں تو انھوں نے بتایا کہ نماز، زکوۃ، ماہ مبارک کے روزے اور حج۔ جب پوچھا گیا کہ وہ پانچویں کون چیز ہے جسے لوگوں نے چھوڑ دیا تو بتایا کہ علی ابن ابی طالب کی ولایت۔ پوچھا گیا کہ کیا یہ بھی فرض ہے۔ انھوں نے کہا ہاں یہ بھی انھیں چاروں کی طرح فرض ہے اور جیسے ابوذر غفاری، عمار بن یاسر، حذیفہ بن الیمان، خزیمہ بن ثابت ذوالشہادتین، ابوایوب انصاری، خالد بن سعید اور قیس بن عبادہ۔'' (اردو ترجمہ) آگے لکھتے ہیں۔

''اس میں شک نہیں کہ شیعیت کا سب سے پہلے ظہور سرزمین حجاز پر ہوا۔ (ترجمہ)

چنانچہ مصنف اصل الشیعۃ واصولہا رقمطراز ہیں۔

''تشیع کوئی نیا مذہب نہیں۔ جہاں سے اسلام شروع ہوتا ہے وہیں سے شیعیت کی بھی ابتداء ہوتی ہے۔ چمن آرائے شریعت یعنی سرکار خاتم الانبیاء نے اسلام کے ساتھ ہی ساتھ اپنے ہی ہاتھوں سے پودا لگایا۔ آبیاری کی اور خود حضور ہی اس کی نگہداشت فرماتے رہے۔ پودا بڑھ کر ہرا بھرا درخت ہوا اور رسولؐ مقبول کی زندگی میں پھولنے بھی لگا۔ مگر پھلنے نہ پایا تھا کہ چراغ نبوت گل ہو گیا۔'' (اصل واصول شیعہ ''مترجم ابن حسن نجفی'' صفحہ ۲۹)

یہی بات حسن الامین اسلامی شیعی انسائیکلوپیڈیا Islamic Shi-ite Encyclopedia میں لکھتے ہیں :

" It has been known during the first enquiry that during the life time of the Prophet there existed a group which professed allegiance and partisonship to Ali. " (Page No.17)

(پہلی ہی تحقیق میں یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ پیغمبر کی زندگی ہی میں ایک فرقہ موجود تھا جو حضرت علیؑ کا تابع اور معتقد تھا)

(بعد میں پیغمبر کی وفات پر مسئلہ خلافت کے موقع پر یہ طاقت زیادہ واضح طور پر ظاہر ہوئی)

۱۷۔ لفظ شیعہ قرآن میں :

یہی نہیں بلکہ اس حقیقت کی تلاش میں اگر نظریں دوڑائی جائیں تو ذاتِ رسولؐ سے آگے

خالق کائنات تک جاتی ہیں۔ جس نے قرآن میں اس لفظ کا استعمال فرمایا ہے اور حضرت خلیل اللہ کی زبان سے خود یہ لفظ کہلوایا ہے۔ سورۂ صافات میں ''وان من شیعتہ وابراہیمہ'' موجود ہے۔ (پارہ۲۳۔ ع ۷) تابع وپیر ومحب حضرت موسیٰ کو خداوندِ عالم نے دوبار شیعہ فرمایا ہے۔ سورۂ قصص میں ہے۔

'' هذا امن شيعة وهذامن عدوه ''(یہ موسیٰ کے شیعوں میں سے ہے اور یہ موسیٰ کے دشمنوں سے)(پارہ۲۰۔ع۵)

ان دونوں آیتوں بلکہ تمام آیات میں شیعہ کا لفظ انصار اور پیروں کے اس گروہ کے لیے استعمال ہوا ہے جو عقیدہ ومسلک میں باہم موافق اور شریک ہوں۔ چنانچہ وہ شخص جو موسیٰ کا شیعہ تھا بنی اسرائیل کا ایک فرد تھا۔ اور وہ شخص جو دشمنان موسیٰ سے تھا وہ مصریوں کا ایک فرد تھا۔

حضرت موسیٰ کے تابعداروں کے بعد لفظ شیعہ اہل بیت حضرت محمدؐ کے محبوں پر استعمال کیا گیا جیسا کہ اس حدیث سے واضح ہے۔

''قال رسول الله شفاعتي الامتي لمن احبّ اهلبيتي وهمه شيعتي ''۔

(حضرت رسول خدا نے فرمایا'' میری شفاعت میری امت کے ان لوگوں کے لیے ہے جو میرے اہل بیت سے محبت کرتے ہیں اور وہی میرے شیعہ ہیں)(کنزالعمال جلد۶۔ صفحہ۲۱۷)

متقدمین مفسرین نے بھی جنھوں نے قرآن مجید کی تفسیر ذی علم اصحاب پیغمبر سے حاصل کی تھی ایسے ہی بیان کیا ہے۔ جناب ابراہیمؑ نوح کے شیعہ تھے۔ یعنی نوح کی سنت وروش پر تھے۔ ان کے عقائد وہی تھے جو نوحؑ کے تھے اور جن کے اعمال وعبادات بھی وہی تھے جو نوحؑ کے تھے جیسا کہ مفسرین نے اس کی بھی وضاحت کی ہے۔ لہٰذا علیؑ کے عہد کے شیعہ وہ لوگ تھے جنھوں نے ان کی بیعت کی اور انکے عقائد ونظریات کے حامل ہوئے۔

۱۸ ۔ شیعوں کے چند فرقے :

اس تمام بحث وتمحیص کے بعد یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ لفظ شیعہ ابتداء ہی سے مستعمل تھا اور خود احادیث وقرآن، تواریخ وتصانیف اس کے گواہ ہیں۔ خدا خود اس لفظ کا استعمال

کررہا ہے۔ البتہ جیسے جیسے تاریخ آگے کی طرف بڑھتی رہی اس لفظ کی تفہیم کے سلسلے میں غلط فہمیاں پھیلتی گئیں۔ بہرحال اس بات سے کوئی انکار نہ کرسکا کہ شیعہ اس گروہ کو کہتے ہیں جو حضرت علیؑ کا تابع ومعتقد ہے۔ چاہے اسے اہل سنت کہہ لیجئے، زیدیہ کہیئے یا اسمٰعیلیہ۔ لیکن حقیقتاً شیعۂ علیؑ سے مراد صرف امامیہ یعنی اثناعشری طبقہ ہوتا تھا۔ لفظ شیعہ فرقۂ امامیہ اثناعشری کے ساتھ اتنا چسپاں ہوگیا ہے کہ جب شیعہ کہا جاتا ہے تو اس سے اس فرقے کے علاوہ اور کوئی دوسری فرقہ مراد ہی نہیں لیا جاتا۔ جب تک کہ زیدی یا اسمٰعیل کی قید نہ لگائی جائے۔ اس کے علاوہ شاہ عبدالعزیز نے شیعوں کے جتنے فرقے گنائے ہیں حقیقتاً ان میں سے اکثر شیعوں کے فرقے ہی نہیں ہیں۔

۱۹ ۔ شیعۂ اثنا عشری :

شیعہ صرف فرقۂ امامیہ ہی کو کہا جاسکتا ہے جو اثناعشری بھی کہلاتے ہیں اور رسول اللہؐ کے بعد بالترتیب بارہ اماموں کو مانتے ہیں چنانچہ علامہ اطا کی فرماتے ہیں۔

''شیعہ خدائے یکتاوبی ہمتارا پرستش می کندوایمان بہ رسالت محمدؐ بن عبداللہ ولایت حضرت امیرؑ مومناں علیؑ رادارد۔ وپس از علیؑ بن الحسینؑ (زین العابدین)، امام محمد باقرؑ، امام جعفر صادقؑ، امام موسیٰ کاظمؑ، امام رضاؑ، امام محمد جوادؑ، امام علیؑ ہادی، امام حسن عسکریؑ، امام حجت منتظر۔

(۱ گرایش چند شخصیت بزرگ بہ تشیع۔)

حضرت رسولؐ خدا کی مشہور حدیث مبارک ہے کہ میرے بعد میرے خلیفہ بارہ ہونگے اور قیامت تک یہی بارہ خلیفہ مسلمانوں کے امام وپیشوا رہیں گے۔ یہ حدیث بلا اختلاف خیال شیعوں اور سنیوں دونوں کی معتبر کتب حدیث وتاریخ وتفسیر میں موجود ہے۔ ۱

چنانچہ صحیح بخاری کتاب الفتن باب الاستخلاف پارہ۲۹، مطبوعہ دہلی صفحہ۶۲۸ میں ہے۔

عن عبدالملك قال سمعت جابرين سمسرة قال سمعت النبی چلی الله عليه وسلم يقول يكون اثنا عشر اميرافقال كلمة لمراسمعهه فقال ابی انه قال كلهمه من قريش۔

یعنی جابر سمرہ سے روایت ہے کہ حضرت رسولؐ خدا نے ارشاد فرمایا کہ (میرے بعد) بارہ

سرداراور حاکم ہونگے اور وہ سب قریش ہی سے ہوں گے۔

صحاح ستہ کی چوتھی کتاب سنن ابوداؤد مطبوعہ کانپور صفحہ ۵۸۸ میں درج ہے۔

"عن جابربن سمرة قال سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول لایزال ھذالدین قائما حتی یکون علیکم اثنا عشر خلیفہ"۔

(جابر بن سمرہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنا کہ حضرت رسولؐ خدا ارشاد فرماتے تھے جب تک تم لوگوں کے بارہ خلیفہ رہیں گے اس وقت تک یہ دین قائم رہے گا)۔

یہی روایت مشکوۃ شریف باب مناقب قریش مطبوعہ لاہور جلد ۸ صفحہ ۹۳، کنز العمال مطبوعہ ریاست حیدرآباد دکن جلد ۶ صفحہ ۱۹۸، ۲۰۰ علامہ ابن حجر مکی صواعق محرقہ میں صفحہ ۱۱ پر، علامہ جلال الدین سیوطی تاریخ الخلفاء مطبوعہ دہلی صفحہ ۷، مولوی عبداللہ امرتسری ارجح المطالب مطبوعہ لاہور صفحہ ۴۰۲۔ علامہ شیخ سلیمان قندوری ینابیع المودۃ مطبوعہ استنبول صفحہ ۴۴۴، ۴۴۵ میں، تفسیر درمنثور مطبوعہ مصر جلد ۲ صفحہ ۲۶۷، ملا قاری شرح فقہ اکبر صفحہ ۸۲ میں، تلخیص الصحاح مطبوعہ لاہور جلد ۲ صفحہ ۱۹۴، معجم کبیر طبرانی میں، علامہ مناوی کنوز الحقائق مطبوعہ مصر بر حاشیہ جامع صغیر جلد ۲ صفحہ ۱۶۳ میں بھی موجود ہے۔

غرضیکہ بارہ خلیفاؤں کا ذکر بار بار کیا گیا ہے۔ البتہ ان بارہ شخصیتوں کے متعلق کے لوگوں میں اختلاف رائے ہے۔ پھر بھی اتنا ضرور ہے کہ اثنا عشر صرف فرقۂ امامیہ ہی کہلاتا ہے جو بارہ اماموں کا ماننے والا ہے۔ اور بالکل اس حدیث کے مطابق جو قندوزی کی ینابیع المودۃ کے صفحہ ۴۴۵ پر موجود ہے۔

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم انا سیدالنبیین وعلیؑ سیّد الوصیین وان اوصیائی بعدی اثنا عشر اوّلھم علیؑ وآخرھم القائم المھدی۔

(حضرت رسول خدا نے فرمایا کہ میں سردار انبیاء اور علیؑ سردار اوصیاء ہیں اور میرے اوصیاء میرے بعد بارہ ہونگے۔ ان کے اوّل علیؑ اور ان کے آخر قائم مہدیؑ ہونگے۔)

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم جب شیعیت کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس سے دراصل شیعیت علیؑ

ہی مراد ہوتی ہے اور شیعیت علیؑ میں بھی محض اثنا عشریت ہی کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ جس طرح ہماری زبان پہلے زبانِ اردوئے معلّٰی کے نام سے موسوم ہوئی۔ پھر دھیرے دھیرے زبان اردو کہلانے لگی اور پھر اتنی مشہور ہوگئی کہ صرف 'اردو' کہنے سے ہماری توجہ اس مخصوص زبان کی طرف چلی جاتی ہے۔ مزید وضاحت کی ضرورت نہیں پیش آتی۔ اسی طرح لفظ شیعہ پہلے کسی بھی شخص کے پیرو کو کہا جاتا تھا۔ جیسے شیعۂ نوحؑ، شیعہ ابراہیمؑ، شیعہ علیؑ اور شیعۂ معاویہ وغیرہ۔ پھر یہ لفظ شیعہ علیؑ کے لیے مخصوص ہوگیا اور بعد میں اتنا مشہور ہوگیا کہ صرف لفظِ 'شیعہ' کہنے سے ہم سمجھ جاتے ہیں کہ شیعۂ علیؑ اثنا عشری کی طرف اشارہ ہے۔

ب : شیعیت کی ابتداء :

۱۔ شیعیت عہدِ رسولؐ میں

تاریخی و تحقیقی حقائق سے واضح ہوگیا کہ شیعیت کی ابتداء عہدِ رسولؐ ہی میں ہوچکی تھی اور اصحاب رسولؐ ہی میں ایسے افراد موجود تھے جو نمایاں طور پر شیعانِ علیؑ کہلاتے تھے۔ جن میں ابوذر غفاری، سلمان فارسی، مقداد، عمار یاسر وغیرہ کے نام فراموش نہیں کیے جاسکتے۔ چنانچہ علامہ سید محمد حسین طباطبائی فرماتے ہیں۔

> "آغاز پیدائش شیعہ را کہ برائے اوّلین بار شیعۂ علیؑ معروف شدند ہمان زمانِ حیاتِ پیغمبر اکرمؐ باید دانست وجریان ظہور وپیشرفت دعوت اسلامی در بیست وسہ سال زمان بعثت موجباتِ زیادی در برداشت کہ طبعًا پیدائش چنیں جمعیتی را در میان یارانِ پیغمبر اکرمؐ ایجاب می کرد"۔
>
> (شیعہ در اسلام۔ صفحہ ۴، ۵)

یہ اور بات ہے کہ حالات کے پیش نظر کبھی یہ فرقہ ظاہر نمودار رہا اور کبھی مخفی۔ لیکن جہاں تک عہدِ رسالت کا تعلق ہے اس دور میں شیعہ نسبتاً زیادہ آزاد تھے اور کسی کی مجال نہ تھی کہ انھیں کچھ کہہ سکتا۔ چنانچہ سرورِ کائناتؐ کے چند اصحاب جیسے سلمان فارسی، ابوذر غفاری، مقداد، عمار، خزیمہ ذوالشہادتین، ابوالتیہان، حذیفہ یمانی، زبیر، فضل بن عباس اور ان کے برادر عالی قدر عبداللہ،

ہاشم ابن عتبہ مرقال، ابوایوب انصاری، ابان نیز ان کے بھائی خالد، فرزندان سعید ابن العاص اموی، ابی ابن کعب اور انس ابن الحرث وغیرہ جنھوں نے رسولِ مقبول کو یہ فرماتے ہوئے سنا تھا کہ "میرا فرزند حسینؑ اس زمین پر شہید ہوگا جسے کربلا کہا جاتا ہے۔ پس تم میں سے جو بھی اس حادثے کے وقت موجود ہو وہ ضرور اس کی مدد کو پہنچے، یہ تمام حضرات شیعہ تھے۔

(الدرجات فی طبقات الشیعہ۔ از سید علی خان)

اس کے علاوہ خاندان ہاشم کے نامی گرامی افراد جیسے حمزہ، جعفر اور عقیل، ان کے علاوہ عثمان ابن حنیف، سہیل ابن حنیف، ابوسعید حذری، قیس ابن سعد بن عبادہ، رئیس الصار بریرہ، براء ابن مالک، جناب ابن الارث، رفاعہ ابن مالک، عامر ابن واثلہ، ہند ابن ابی ہالہ، جعدہ ابن ھبیرہ، مخزومی اور ان کی والدہ ام ہانی بنت ابی طالب اور بلال ابن ریاح موذن وغیرہم یہ تمام حضرات بھی شیعہ تھے۔ (ایضاً)

اس کے بعد آنے والوں میں احنف بن قیس، سوید بن عفلہ، عطیہ عوفی، حکم بن عتیبہ، سالم بن ابوالجعد، علی ابن جعد، حسن ابن صالح، سعید ابن جبیر، سعید ابن مسیت، اصبغ ابن نباتہ، سلیمان ابن مہران اعمش اور یحییٰ ابن یعمر عدو وغیرہ بھی شیعوں میں سے تھے۔ (ایضاً)

چنانچہ حسن الامین فرماتے ہیں۔

" During the early period of Islam, the Shi-ites continued increasing in number so that it stood one thousand or more. When Abuzar was banished to Syria, many of Syrians become Shi-ites on account of his influence. It is said that the Shi-ites of the Jabal. Amir in Lebonan have adhered to this creed since that time. When Muawiya turned him out of Syria into villages belonging to Bani-Amilah, all of the inhabitants there became Shi-ites".

(اسلام کے ابتدائی زمانے ہی میں شیعوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ہزار سے اوپر پہنچ چکی تھی۔ جب ابوذر شام میں روپوش ہوئے تو ان کے زیر اثر بہت سے شامی شیعہ ہوگئے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ جبل عامل (لبنان) کے شیعہ اسی وقت سے شیعہ ہوگئے جب معاویہ نے

انھیں شام سے نکال کر بنی عاملہ کے دیہاتوں میں جانے پر مجبور کیا تو وہاں کے تمام باشندے شیعہ ہوگئے۔ (Islamic Shia-ities Encyclopaedia page 23)

جبل عامل کے دو قصبوں سرافند اور سیں (جنوبی لبنان) میں جامع مسجد کے علاوہ دو اور مسجدیں بھی موجود ہیں جو ابوذر کے زمانے کے تعمیر کردہ بتائی جاتی ہیں روضۃ الکافی اور فدائت شہزان بن جبریل القمی کے ہاں عمار بن یاسر اور زید بن ارقان سے دو روایتیں بھی ملتی ہیں جو اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ جبل الثلج کے نزدیک شام میں اسعر نام کا ایک قصبہ تھا جس کے تمام باشندے شیعہ تھے۔

عہد رسولؐ کے بعد خلفائے ثلاثہ کے دور میں چونکہ خود حضرت علیؑ ہی گوشہ نشینی کی زندگی گزارتے رہے لہٰذا اس فرقے نے بھی بحیثیت گروہ ابھرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ خاموشی سے اپنے امام کی پیروی واتباع کرتے رہے۔ یہاں تک کہ لوگوں نے خود حضرت علیؑ کا انتخاب کرلیا۔

جب حضرت علیؑ مسلمانوں کے چوتھے خلیفہ کی حیثیت سے تخت نشین ہوئے تو ارباب حکومت میں سے زیادہ تر افراد غیر شیعہ تھے۔ لیکن اس موقع پر شیعوں کو بھی یکجا ہونے کا موقع مل گیا اور انھوں نے آزادی کے ساتھ اپنے عقائد واعمال کا مظاہرہ کیا اور بقول مولانا فیاض حسین مبارکپوری۔

"ان میں سے کوئی بھی، حجاز ہو یا عراق، شام ہو یا یمن، ایران ہو یا مصر، افریقہ ہو یا ہندوستان جدھر جدھر بھی حکام وعمال سرکاری کی ماتحتی میں یا خود عامل یا حاکم ہوکر گیا اپنے ساتھ شیعیت کو لے کر گیا اور اس طرح شیعیت عرب سے بڑھ کر دیگر ممالک میں پہنچی۔" (رافضیت)

"حضرت عثمان کے قتل کے بعد جب بغاوتوں نے سر اٹھایا اور جمل اور صفین اور نہروان کی جنگیں ہوئیں تو اس موقع پر صحابہ کی اکثریت نے حضرت علیؑ اور انکے شیعوں کا ساتھ دیا۔ امیر معاویہ کی بغاوت پر صفین میں عمار یاسر، خزیمہ ذوالشہادتین اور ابو ایوب انصاری جیسے اسی سربرآوردہ صحابی جو تقریباً سب کے سب بدری اور عقبی تھے ابوتراب کی حمایت میں شامل ہوگئے اور اکثروں نے اپنی جانیں امام پر نثار کردیں"۔ (اصل واصول شیعہ۔ صفحہ ۳۴)

جب حضرت علیؑ نے عراق میں سکونت اختیار کی تو کوفہ اور بصرہ کے عوام کی ایک بہت بڑی اکثریت نے شیعیت قبول کرلی اور جب حضرت علیؑ کے عمال مختلف حصوں میں پھیلے تو وہاں کے

باشندوں میں شیعیت کی توسیع بھی ہوتی گئی۔ چنانچہ مکّہ، مدینہ، طائف، یمن، مصر اور اس کے علاوہ عراق اور بصرے میں شیعوں کی ایک بہت بڑی تعداد پیدا ہو گئی۔ یمن کے کم و بیش تمام باشندے شیعہ تھے۔ جن میں اثنا عشریوں کی خاصی تعداد تھی۔ اسی طرح اس زمانے میں مصریوں کی زیادہ تعداد حضرت علیؑ کے طرفداروں میں سے تھی اور کم لوگ عثمانی تھے۔

بہر حال پھر بھی یہ دور شیعیت کے لیے اتنا سازگار نہ تھا جتنا عہدِ رسولؐ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ شیعہ آزادی سے اپنے عقائد کا اظہار کرتے رہے کہ ان کا امام ہی عالمِ اسلام کا خلیفہ تھا۔ لیکن شہادت حضرت علیؑ کے بعد جب امام حسنؑ نے ۴۱ھ میں بسبب رفع فتنہ وشر کے معاویہ کی پیش کش پر اُن سے صلح کر لی تو معاویہ مسلمانوں کے خلیفہ ہو گئے۔

عہدِ معاویہ میں شیعیت کا ایک فرقے کی حیثیت سے نمایاں رہنا مشکل ہی نہیں بلکہ محال تھا کیونکہ چن چن کر شیعوں کا قتل کیا جاتا تھا اور حضرت علیؑ کو سرِ منبر گالیاں دی جاتی تھیں صحیح مسلم و ترمذی و نسائی وغیرہ میں سعد سے روایت ہے کہ امیر معاویہ نے ان کو جناب ابوترابؑ پر سب کرنے کے لیے حکم کیا اور کہا کہ تم ان پر سب کیوں نہیں کرتے؟ (شعلۂ نور۔ صفحہ ۸۲)

مولوی اہلِ سنت حکیم سید نظیر حسن دہلوی اپنے ''قصیدۂ عروۃ الوثقیٰ'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

''تمام ممالک اسلامیہ میں حضرت علیؑ کی ابتداء خلافت ۳۵ھ سے عمرِ ثانی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی زمانِ خلافت ۹۹ھ سے ۱۰۱ھ کے درمیان تک نماز جمعہ میں علیؑ اور انکی اولاد پر ہر مسجد میں سرِ منبر تبرا ہوتا رہا۔''

علامہ ابن ابی الحدید معتزلی شرح نہج البلاغہ جلد ۳ ص ۶۳ مطبوعہ مصر میں لکھتے ہیں۔

''معاویہ اور ان کے اصحاب ہر جمعہ بر سرِ منبر علانیہ حضرت علیؑ پر لعنت کیا کرتے تھے۔ مکّہ، مدینہ اور تمام اسلامی شہروں میں جگہ یہ رسمِ تبرا جاری تھی اور خوارج اس مکروہ امر میں ان کے شریک تھے۔

مورخین کہتے ہیں کہ یہ رسم سنت پیروان معاویہ میں ۹۹ھ تک جاری رہی اور سلاطین بنی امیہ کی حکومت کی بقا کا راز اسی میں تھا کہ عوام آلِ محمدؐ کی عظمت و منزلت سے جاہل رکھے جائیں۔ لیکن عمر ابن عبدالعزیز اموی نے حکماً بند کرا دیا۔ لیکن عوام اس حرکت کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ اس حکم پر عمر بن شعیب نے کہا تھا۔

''ویل ہو سنت پر کہ اس نے (علیؑ پر) لعنت کو ترک کر کے سنت کو مٹا دیا اور جمعہ کو ختم کر دیا''۔ (علامہ ابن شہر آشوب مناقب جلد ۳ صفحہ ۲۴)

عہدِ معاویہ میں شیعوں کو سب سے زیادہ تکلیف زیاد ابن ابیہ کے ہاتھوں سے پہنچی جو اس وقت بصرہ و کوفہ کا گورنر تھا۔ اس نے شیعیانِ کوفہ پر کافی مظالم ڈھائے۔ کسی کو نیزوں سے مروایا، کسی کو دیواروں میں چنوایا کسی کے ہاتھ پاؤں کٹوائے۔ کسی کے بدن کا پارہ پارہ کیا۔ کسی کو خوف جان کے باعث تقیہ اختیار کرنا پڑا۔ چنانچہ اس کے عہد میں حجر بن عدی، صیفی، عبداللہ بن خلیفہ طائی وغیرہ جیسے بہت سے صحابی رسول شہید کیے گئے۔ (مصائب الابرار در محبت آل اطہار از مولوی سید محمد حسین نوگانوی)

اس عہد میں تاریخ کی سب سے پہلی کتاب لکھی گئی جس کا مصنف عبید بن شریہ نامی ایک شخص تھا جس کو معاویہ نے صفا سے بلایا اور کاتب اور محرر متعین کئے کہ جو کچھ وہ بیان کرتا جائے، قلم بند کرتے جائیں۔ نتیجتاً اس وقت جو کتابیں لکھی گئیں وہ فضائل علیؑ اور آلِ علیؑ سے محروم تھیں۔ اور چونکہ علماء کی مرضی کے خلاف، زبردستی یہ کتابیں لکھوائی گئیں (جبکہ وہ خود بھی ان کا لکھنا پسند نہ کرتے تھے۔) (سیرۃ النبی جلد ۱۔ صفحہ ۱۳) لہٰذا ان میں بنوامیہ کے فضائل و مناقب میں کثرت سے حدیثیں وضع کی گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے ان بے بنیاد حدیثوں کو مقبروں پر بیٹھ کر پڑھنا اور دوسروں کو سنانا شروع کیا۔ مکتبوں میں بچوں کو معلموں نے یہی حدیثیں پڑھائیں۔ گھروں میں اپنی عورتوں، خدمتگاروں اور مصاحبوں میں بھی اسے پھیلا دیا۔ اور اس طرح فضائل اہلبیت کو ختم کرنے کی بلکہ یکسر مٹا دینے کی کوشش کی گئی اور ہر شہر میں امیر معاویہ کی جانب سے یہ فرمان بھیجا گیا کہ جو شخص بھی شیعۂ علیؑ و آلِ علیؑ ہو اس کا نام حکومت کے دفتر سے مٹا دیا جائے اور جس شخص پر شیعۂ علیؑ ہونے کا الزام بھی ہو تو اسے سخت سزا دی جائے۔ ان فرمانوں کی تعمیل میں سب سے زیادہ آفت عراق اور کوفے کے شیعوں پر نازل ہوئی۔ خوف و دہشت، تردّد، پریشانی اور گھبراہٹ سے یہاں کے شیعوں کی حالت اس درجہ کو پہنچ گئی کہ اگر کسی شیعہ کے پاس اس کا کوئی نہایت سچا، قابل اعتبار اور وفادار دوست بھی ملاقات کی غرض سے جاتا تو وہ دوسرے لوگوں کے ڈر سے اپنے اس دوست سے باہر ملاقات بھی نہیں کر سکتا تھا بلکہ کسی بند کمرے میں تنہائی میں اسے اپنی مصیبت کا

احوال سناتا اور وہ بھی اس وقت جب تک اس سے بڑی سخت قسمیں نہ کھلوا لیتا کہ وہ اپنی ان باتوں کو اپنے ہی حد تک محدود رکھے گا کسی پر بھی ظاہر نہ کرے گا۔

(اعجاز الولی جلد اول مطبع اصطلاح کھجوا۔ تیسرا ایڈیشن۔)

''اس کے باوجود بھی شیعیت مٹ نہ سکی۔ کیونکہ عہد معاویہ میں ایک طرف تو دنیاداری کی اہمیت ہوگئی اور دوسری جانب پیغمبر کے موجود الوقت صحابی جمہور اسلام کو علیؑ اور اولاد علیؑ کے ان فضائل سے واقف کرا رہے تھے جو انھوں نے رسول کی زبان فیض ترجمان سے سنے تھے۔ اس صورت حال کا یہ اثر ہوا کہ عام کلمہ گو تشیع کی جانب مائل ہونے لگے اور اس فرقے کے لیے ترقی کی راہیں کھل گئیں۔'' (اصل واصول شیعہ)

لیکن شیعیت کے فروغ کا سب سے بڑا سبب کربلا کا وہ خونچکاں واقعہ فاجعہ ہے جس نے تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ دنیا میں ایک عظیم انقلاب برپا کر دیا اور پسر معاویہ یزید کو باطل اور شر کی علامت، اور سبط رسولؐ امام حسینؑ کو حق و خیر کی علامت بنا کر دنیا کو ایک لافانی سبق دے دیا۔ یہی دور شیعیت کی توسیع اور اسکے ارتقاء و فروغ کا دور ہے۔ شہادت امام حسینؑ سے اسلام تو بچا ہی شیعیت بھی بقائے دوام حاصل کر گئی۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ جب تک دنیا میں حق و باطل کی کشمکش رہے گی لوگ واقعہ کربلا کو یاد کریں گے اور جب تک واقعہ کربلا زندہ رہے گا، شیعیت زندہ رہے گی۔

واقعہ کربلا اور شیعیت کی توسیع

جنگ و جدل، فتنہ و فساد، تقابل و تصادم انسانی فطرت کا خاصہ رہے ہیں۔ اگر یہ جنگ، یہ تصادم اور یہ تقابل اپنے اندر تعمیری پہلو رکھتا ہے تو وہ عالم انسانی کے لیے خطرہ نہیں ہوسکتا۔ مثلاً حالات سے جنگ کرنا، بپھرتے ہوئے طوفانوں کا مقابلہ کرنا، مصیبتوں سے ٹکرانا وغیرہ۔ لیکن اگر اس میں تخریبی پہلو کارفرما ہو تو وہ تمام انسانوں کے لیے مضر اور انسانیت کے لیے باعث ننگ ہے۔ تاریخ عالم گواہ ہے کہ جب بھی ایسا تصادم یا جنگ دنیا میں وقوع پذیر ہوئی ہے ایک نئے انقلاب نے جنم لیا ہے۔ جب بھی کفر و ضلالت کی تیرہ و تار گھٹاؤں نے ایمان کی روشن شمعوں کو بجھانے کی کوشش کی ہے، جب بھی مادیت کے کانٹے روحانیت کے سینے میں چبھوئے گئے ہیں،

جب بھی باطل کی آندھیوں میں، گناہوں نے سر اٹھایا ہے، پاکیزگی دم توڑنے لگی ہے، خلاق عالم نے نسل انسانی کی فلاح کے لیے ایک روحانی پیشوا زمین پر اتارا ہے۔ چنانچہ جہاں شیطان کے لیے آدمؑ، فرعون کے لیے موسیٰ، نمرود کے لیے ابراہیمؑ اور ابوسفیان کے لیے محمدؐ کو پیدا کیا وہیں یزید کے لیے حسینؑ کی تخلیق کی۔ احسن الخالقین کی یہ تخلیق بھی اپنا نظیر آپ تھی جس نے ابد تک کے لیے باطل کا سرنگوں کر دیا۔ شر کو کچل کے رکھ دیا۔ حق کا بول بالا ہو گیا اور خیر زندہ ہو گیا۔

پس منظر :

واقعہ کربلا کی نوعیت کو جاننے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ وہ کونسے اسباب و علل تھے جن کی بناء پر یہ زبردست واقعۂ ظہور پذیر ہوا۔ اس سلسلے میں ہمیں ظہور اسلام کی ان خوبصورت گھڑیوں پر بھی نظر ڈالنی ہوگی جب ہادی عرب نے ایک اجہل، گنوار، بدتہذیب، وحشی اور صحرائی قوم کو توحید کا پیغام سنایا اور بتوں کی جاہلانہ پرستش سے باز آنے کی تلقین فرمائی۔ لیکن سچائی ہمیشہ کڑوی ہوتی ہے اور اس تلخی کو چپ چاپ برداشت کر لینا ہر حلقوم کے بس کی بات بھی نہیں ہوتی۔ خاص طور پر وہ بدّ و دماغ جو خود سر جہالت سے بھرے پڑے تھے اس حقیقت کو برداشت نہ کر سکے اور دعوت عشیرہ سے تادم آخر اسلام، بانی اسلام اور حامیان اسلام کے دشمن بنے رہے۔ ابتداً تمام اہل مکہ نے اس کی مخالفت کی جن میں پیش پیش ابولہب و ابوسفیان تھے جو بنوامیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک زمانے سے ہاشمیوں سے ان کی خاندانی دشمنی چلی آرہی تھی۔ پھر وہ یہ کیسے برداشت کرتے کہ ابوطالب کے زیر سایہ پلا ہوا یہ ہاشمی نوجوان انھیں ان کے بتوں کی پرستش سے منع کرے۔ لہٰذا دعوت عشیرہ کے موقع پر ہی ابوسفیان نے آپ کا مضحکہ اڑایا۔ اور اس وقت بھی آپ کی آواز پر لبیک کہنے والا ایک ہاشمی بچہ ہی تھا۔

ابوسفیان کا پیغمبر کے موقف کی شدید مخالفت کا سبب آپ کے خاندانی عظمت و برتری تھی جسے بنوامیہ کبھی برداشت نہ کر سکے۔ آپ کی ذات اقدس سلب ابراہیمؑ سے تھی۔ وہ ابراہیم جو بین الاقوامی حیثیت رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کے علاوہ یہود و نصاریٰ بھی جن کو تسلیم کرتے ہیں۔ جنھوں نے راہ خداوندی میں اپنے عزیز فرزند حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی دینے سے دریغ نہ کیا۔ لیکن یہی

قربانی آگے چل کر ایک "ذبح عظیم" کے لیے اٹھالی گئی اور یہ ذبح عظیم بھی اسی مقدس سلسلۂ نسب سے تعلق رکھتا ہے جو امام حسینؑ کی ذات پر مکمل ہوگیا۔ یعنی حضرت اسمٰعیلؑ سے ہوتا ہوا یہ سلسلہ نصر بن کنانہ تک پہنچا جن کی اولاد 'قریش' کہلائی۔ اسی قریش میں جناب ہاشم تولد ہوئے جو اپنے بھائی عبد شمس سے توام ہونے کی وجہ سے پشت سے تلوار سے الگ کئے گئے اور یوں شمس کی اولاد بنوامیہ ہاشمیوں سے ہمیشہ منازعت پر آمادہ رہی۔

ویسے بھی ہاشمیوں اور امویوں میں ایک فطری تضاد موجود تھا۔ بنی ہاشم اگر روحانی اور اخروی مفاد کے لیے ہمیشہ مصروف جدوجہد رہتے تھے۔ تو بنی امیہ دنیاوی منفعت اور مادّی مفاد کے متلاشی تھے۔ بنی ہاشم فیاض، سخی اور عوامی فلاح و بہبود کے علمبردار تھے تو بنی امیہ بخیل، طامع اور ذاتی اغراض کے بندے تھے۔ بنی ہاشم صاف گو، راست گفتار، حق کے لیے مر مٹنے والے اور ربّانی سیاست کے نقیب تھے تو بنی امیہ چالباز، اپنی اغراضِ فاسدہ کی کامیابی کے لیے حق، ناحق کی پروانہ کرنے والے، مادّی سیاست کے مجسمے تھے۔ بنی ہاشم اولاد ابراہیمؑ میں امتِ مسلمہ تھے۔ موحد و خدا پرست تھے۔ تو بنی امیہ جاہلیت عرب کی جیتی جاگتی تصویر، مشرک اور بت پرست تھے۔ (رضا کار لاہور سید الشہدا نمبر "کربلا کی ابتداء و انتہا"۔ از خواجہ محمد لطیف انصاری صفحہ ۱۶۱۔)

صفات کے اس تضاد کی وجہ سے باہمی مخالفت و منازعت کا سلسلہ جاری رہا۔ سرکار رسالتؐ کے جدِّ امجد حضرت عبدالمطلب ایسے باعزت بزرگ تھے کہ لوگوں نے انکو "سید البطحا" کا خطاب عطا کیا اور یوں ان کی اولاد سادات کہلائی۔ انھیں حضرت عبدالمطلب کے فرزند حضرت عبداللہ کے گھر پیدا ہونے والے اور حضرت ابوطالب کے ہاتھوں میں پلنے والے محمدؐ نے جب مبعوث بہ رسالت ہوکر اسلام کا پیغام سنایا تو امویوں نے اسے اپنی ہتک سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ روزِ اوّل ہی سے اسلام، بانی اسلام اور حامیانِ اسلام کی شدید مخالفت کرتے رہے۔ نتیجتاً لڑائیوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ جس میں فرزندِ ابوطالب، علیؑ نے نصرت رسول کی پوری پوری داد دی۔ بنوامیہ کے صنادید علیؑ کی تلوار سے ختم ہو رہے تھے۔ جنگ بدر کے بعد احد بھی لڑی گئی اور بنی امیہ کے مرد تو مرد عورتوں نے بھی سفا کی اور شقاوت قلب کا مظاہر کیا۔ چنانچہ شبلی نعمانی احد کے ذکر میں تحریر فرماتے ہیں۔

"خاندان قریش نے انتقام بدر کے جوش میں مسلمانوں کی لاشوں سے بدلہ لیا۔ ان کے کان

ناک کاٹ لیے۔ ہند (معاویہ کی ماں) نے انھیں پھولوں کا ہار بنایا اور اپنے گلے میں ڈالا۔ حضرت حمزہ کی لاش پر گئی اور ان کا پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکالا اور چبا گئی لیکن گلے سے نیچے نہ اتر سکا اس لیے اگل دینا پڑا"۔ (سیرۃ النبی جلد ا صفحہ ۳۷۲)

مخالفت کا یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا یہاں تک کہ اسلام ایک قوی طاقت بن گیا اور مسلمانانِ عرب نے مکہ فتح کر لیا لیکن بقول صالحہ عابد حسین۔

"فتح مکہ کے بعد، جو تائید الٰہی سے آنحضرت کو ایک قطرہ خوں بہائے بغیر حاصل ہوئی۔ ساری عرب دنیا حلقہ بگوش اسلام ہوگئی۔ اس وقت بنوامیہ مجبور ہوئے کہ اسلام قبول کرلیں۔ ان میں سے بعض نے دل سے اسلام قبول کیا ہوگا مگر زیادہ تر ایسے لوگ تھے جن کا یہ اقرار صرف زبان سے تھا، دل سے نہیں۔ دل میں اب بھی اقتدار اور امارت کی ہوس باقی تھی۔ مگر اب وہ اسے تلوار سے نہیں تدبیر سے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ (خواتین کربلا کلام انیس کے آئنے میں صفحہ ۹)

عہد رسولؐ میں تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکے کیونکہ خود رسولؐ ان کے نفاق سے واقف تھے۔ مگر رسول اللہ کی رحلت کے فوراً بعد ہی انھوں نے دھیرے دھیرے اپنا خول اتارنا شروع کیا۔ ابوسفیان نے حضرت علیؑ کو استحاقِ خلافت کے بہانے اکسا کے اسلام میں داخلی جنگ کی ترغیب دلانی چاہی لیکن وہ یہ بھول رہا تھا کہ سامنے جو شخص کھڑا ہے وہ ملک و مال کا حریص نہیں۔ اس کی درویشانہ فطرت تو ایک نانِ جویں سے زیادہ کی خواہش نہیں کرسکتی۔ لہٰذا یہاں بھی اموی شاطروں کو زبردست مات کھانی پڑی۔ لیکن جب عہد خلافت ابوبکر میں مسلمانوں نے شام پر چڑھائی کی تو اولاد ابوسفیان کو فتوحات کے دروازے سے ایوان سیاست میں داخل ہونے کا موقع مل گیا۔ یوں ۱۵ھ میں یزید ابن ابوسفیان اور اسکے انتقال پر ۱۹ھ میں معاویہ ابن ابوسفیان (عہد حضرت عمر میں) شام کے گورنر مقرر ہوئے اور چہرۂ شریعت اسلامیہ پر ہلکی ہلکی خراشوں کا سلسلہ یہیں سے شروع ہوگیا۔ چنانچہ تاریخ طبری جلد ۶ صفحہ ۱۸۴ پر مرقوم ہے۔

"حضرت عمر ملکِ شام میں گئے تو معاویہ نہایت شان و شوکت سے صبح و شام ملنے کے لیے آتے۔ اس غیر اسلامی شان و شوکت پر حضرت عمر نے اعتراض کیا تو معاویہ نے کہا قیصر و روم قریب ہے۔"

(رضا کالا ورسا ربعین نمبر "خلافت اسلامی اور آل محمد کی تحریک قیام حکومت ربانی" از ڈاکٹر حسین فاروقی)

اس کے بعد حضرت عثمان کا دور شروع ہوا جو اتفاق سے خود ہی اموی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ لہٰذا عبداللہ بن عامر، مغیرہ بن شعبہ، عبداللہ بن ابی سرح، عمر بن عاص، معاویہ بن ابوسفیان، ولید بن عتبہ، مروان بن حکم اور اسی قسم کے دوسرے اموی سرداروں کو خوب عروج حاصل ہوا۔ نتیجتاً غیر اموی سردار بغاوت پر آمادہ ہو گئے اور اس ہنگامے میں مدینہ ایک طاقتور امیر محمد بن ابی بکر اور ان کے مصری ساتھیوں کے قبضے میں آ گیا۔ محمد ابن ابی بکر چاہتے تو خود خلیفہ بن جاتے۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ حضرت علیؑ کو خلافت قبول کرنے پر مجبور کیا۔ حضرت علیؑ کے انکار کے باوجود جب مصریوں کا اصرار بڑھتا رہا تو آپ نے خلافت قبول کر لی۔

جب حضرت علیؑ کا دور خلافت شروع ہوا تو انھوں نے حکومت کے تمام شعبوں میں ان اسلامی اصولوں کا عملی اطلاق شروع کیا جو غلامی کو ختم کرنے اور انسانی آزادی کو بحال کرنے کے لیے قرآن نے پیش کئے تھے۔ وہ خود ایک سخی اور صاحب فقر انسان تھے۔ لہٰذا بیت المال سے نہ اپنے ذاتی کام کے لیے ایک پائی لی اور نہ ہی عزیز و اقرباء کو اس کی اجازت دی۔ خود محنت مزدوری کرتے اور اسی پر خاندان کی گذر بسر ہوتی۔ دولت دنیا انھیں کبھی اپنی طرف راغب نہ کر سکی۔ نہ دنیوی حرص و ہوس ان کے فقر پر ایک ہلکی سی ضرب بھی لگا سکی۔ جتنے بلند کردار کے وہ خود تھے، ایسی ہی توقع وہ اپنے عمال و حکام سے بھی رکھتے تھے۔ لیکن چونکہ مسلمانوں کے نفوس کافی حد تک بگڑ چکے تھے اور حکومت و دولت کا نشہ دماغوں پر پوری طرح سے مسلط ہو چکا تھا اسلیے مسلمانوں کا وہ مفاد پرست طبقہ جو خلیفۂ وقت کو خود اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنے کا عادی بن چکا تھا امیر المومنین کے خلاف سازشوں میں مصروف ہو گیا۔

(رضا کالا ورسا ربعین نمبر "خلافت اسلامی اور آل محمد کی تحریک قیام حکومت ربانی" از ڈاکٹر حسین فاروقی)

اسی بات کو صالحہ عابد حسین یوں لکھتی ہیں۔

"حضرت علیؑ سے خاندانی اور نسلی دشمنی کے علاوہ مخالفت کی اور بھی کئی وجوہ تھیں۔ وہ محمدؐ کے چہیتے چچازاد بھائی تھے۔ انھیں سے آپ نے اپنی لاڈلی بیٹی سیدۃ النساء فاطمہ زہراؑ کا عقد کیا تھا۔ اُن کے بیٹے حسنؑ اور حسینؑ فرزند رسول کہلاتے تھے اور رسولؐ اللہ انھیں بے انتہا چاہتے تھے۔ پھر

حضرت علیؑ نے رسولؐ اللہ کے ساتھ دشمنوں سے ہمیشہ نہایت بہادری کے ساتھ جہاد کیا تھا اور جانے کتنے لوگ انکے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ پھر جب حضرت علیؑ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے ہر قسم کی وہ مراعات جو لوگوں کو ملی ہوئی تھیں، بند کر دیں۔ وہ خدا اور رسولؐ کے حکم کے مطابق بیت المال کی تقسیم کرتے۔ اپنے عمال پر انصاف اور مساوات کی تاکید رکھتے۔ جن لوگوں کو گذشتہ زمانے میں بہت سے فائدے اور مراعات حاصل تھیں ان کا مخالف بن جانا کوئی حیرت کی بات نہیں کہ اب نہ اقربا پروری کی گنجائش تھی نہ کسی رعایت کی امید۔ حضرت علیؑ نے تو اسلام کی سچی روح اور اصلی تعلیم کے مطابق سیدھی، سادی حق، انصاف اور مساوات پر مبنی حکومت قائم کی تھی اور کسی حال میں، کسی قیمت پر اس سے روگردانی نہ کرتے تھے۔ چنانچہ بنوامیہ اور انکے ساتھی کھلم کھلا حضرت علیؑ کے مقابلے پر آ گئے اور علم بغاوت بلند کر دیا۔ شام میں امیر معاویہ نے (جو اس وقت بنوامیہ کے بڑے با اثر اور مدبر لیڈر تھے) ایک متوازی حکومت قائم کر لی اور خلیفۂ رسول ہونے کا دعویٰ کیا ---- (انیس کے مرثیے۔ مرتبہ صالحہ عابد حسین۔ ترقی اردو بورڈ نئی دہلی ۱۹۷۷ء صفحہ ۲۱، ۲۲)

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت علیؑ کے خلاف سازشیوں اور باغیوں میں اموی پیش پیش تھے۔ جن کو ناجائز مراعات کی عادت پڑ چکی تھی اور سابقہ حاصل شدہ سہولتیں اور آزادیاں اب زیر دام شرع نظر آنے لگی تھیں۔ خاص طور پر معاویہ اس بات کو برداشت نہ کر سکے۔ لہٰذا حضرت علیؑ کی مثالی حکومت اور معاویہ کا تصادم لازمی امر تھا۔ نتیجتاً حضرت علیؑ کو معاویہ سے جنگ کرنی پڑی۔ جس میں فتح تو حسب معمول صاحب ذوالفقار ہی کے حصے میں آئی لیکن ایک خارجی کی تلوار نے ۴۰ھ میں حالت سجدہ میں آپ کو ضرب پہنچا گئی اور یوں دنیا پرست شقاوت نے حق پرست خلافت کو شہادت کی منزل تک پہنچا دیا۔

شہادت حضرت علیؑ کے سلسلے میں مشہور سنّی صحافی کلام حیدری ایک نیا خیال پیش کرتے ہیں۔ "ہمیں تاریخ کی اس روایت پر اسلیے یقین نہیں آتا کہ حضرت علیؑ کو شہید کرنے والا فرقۂ خارجیہ سے تعلق رکھتا تھا کیونکہ ہر مجرمانہ قتل کے پیچھے کوئی ایک مقصد ہوتا ہے۔ اس قتل کے پیچھے جو مقصد آگے چل کر ظاہر ہوا وہ یہ تھا کہ حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد معاویہ نے اپنی حکومت مستحکم اور اپنے حامیوں کی تعداد میں کثیر دولت خرچ کر کے نہ صرف اضافہ کیا بلکہ بے اصولی طور پر اپنی

خلافت کا اعلان بھی کر دیا"۔ (ہفت روزہ مورچہ ۹ دسمبر ۸۷ء شمارہ ۴۹ اداریہ از کلام حیدری)

اسی بے اصولی کو ظاہر طور پر اصولی بنانے کی خاطر معاویہ نے امام حسینؑ سے (جنھیں تمام مسلمانوں نے متفقہ طور پر علیؑ کے بعد اپنا خلیفہ تسلیم کیا تھا) بیعت کا تقاضا کیا۔ حضرت امام حسنؑ نے محض اس وجہ سے صلح کو مقدم نہیں سمجھا کہ وہ مصلحت پسند تھے اور اپنی وجہ سے نقص امن کو اچھا نہیں سمجھتے تھے بلکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ جانتے تھے کہ رسولؐ اللہ اور حضرت علیؑ کے بعد اسلام کے تحفظ و بقا کی پوری ذمہ داری ان کے اور امام حسینؑ کے شانوں پر تھی۔ اسی لیے جب معاویہ نے صلح کی پیش کش کی تو انھوں نے اس معاہدے پر دستخط کر دیے مگر مشروط طریقے پر۔ چند شرطیں جو اس معاہدے میں رکھی گئی تھیں ان کے ذریعہ امام حسینؑ نے عالم اسلام پر واضح کر دیا کہ حقیقت حال کیا ہے اور تاریخ اس کی گواہ بن گئی وہ چند شرطیں یہ تھیں۔

۱- معاویہ حکومت اسلام میں کتابِ خدا اور سنّتِ رسول اور خلفائے راشدین کے طریقے پر عمل کریں گے۔ (اس سے ظاہر ہے کہ معاویہ کی حکومت کس قسم کی تھی ورنہ امام حسنؑ کو اس شرط کی ضرورت نہ تھی۔)

۲- معاویہ کو اپنے بعد کسی کو خلیفہ نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔ (اور بعد میں کیا ہوا۔ اس کی گواہی تاریخ دے رہی ہے)

۳- شام، عراق، حجاز اور یمن سب جگہ کے لوگوں کو امان ہوگی... (شرط سے ظاہر ہے کہ نقصِ امن کا خطرہ لاحق تھا۔)

۴- حضرت علیؑ کے اصحاب اور شیعہ جہاں بھی رہیں ان کے جان و مال، ننگ و ناموس اور اولاد محفوظ رہیں گے۔ (اور کیا کیا ہوتا رہا اس کی تاریخ شاہد ہے)

۵- معاویہ حسنؑ بن علیؑ، ان کے بھائی حسینؑ اور خاندانِ رسالت کے کسی فرد کو نقصان پہنچانے یا ہلاک کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ نہ خفیہ نہ اعلانیہ بلکہ ان میں سے کسی کو ڈرایا، یا دھمکایا یا وحشت میں مبتلا نہیں کیا جائے گا۔ ربیع الاول ۴۱ھ

(صواعق محرقہ ابن حجر مکی۔ صفحہ ۸۱۔ مطبوعہ مصر بحوالہ سرفراز محرم نمبر ۵۱۔

معاویہ نے صلح کے وقت تو یہ شرائط قبول کر لیں لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ ان پر عمل نہیں کیا گیا۔

تمام مساجد کے ممبروں سے علی الاعلان علیؑ ابن ابی طالب پر تبرا ہوتا رہا۔

امام حسنؑ کے جگر کو زہر ہلاہل سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔ اسلام کے بہادر و جانباز مجاہد مالک اشتر کا کام زہر سے تمام کر دیا گیا۔ حجر ابن عدی کو ان کے چھ اصحاب کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ دیگر اصحاب نبیؐ و علیؑ اور طرفداران آل رسولؐ ظلم و ستم کا نشانہ بنائے جاتے رہے۔ غرضیکہ خون اور زہر کا ایسا طوفان تھا جو کسی طرح ختم نہ ہونے میں نہیں آتا تھا۔ آخر میں اپنے فرزند یزید کو عالم اسلام کے سر پر مسلط کر کے بچی کچی شرط کو ٹھکرا دیا گیا۔

یہیں سے حق و باطل کا وہ معرکہ شروع ہوا جس کی مثال تاریخ عالم میں آج تک نہیں ملتی۔ یہ جنگ دو شہزادوں کی جنگ نہ تھی، دو اصولوں کی جنگ تھی۔ ایک طرف خیر تھا دوسری طرف شر۔ ایک طرف حق تھا دوسری طرف باطل۔ ایک طرف خدا پرستی تھی دوسری طرف دنیا پرستی۔ ایک طرف روحانیت تھی دوسری طرف مادیت۔ ایک طرف فقر و بے نیازی تھی دوسری طرف طمع دنیا و حرص و ہوس۔ ایک طرف تقویٰ و پرہیزگاری تھی دوسری طرف تنعم و تعیش۔ ایک طرف حسینیت تھی دوسری طرف یزیدیت۔

اس فرق کو سمجھنے سے پہلے ہمیں ایک نظر امام حسینؑ اور یزید کے کردار پر ڈالنا چاہیے تبھی واقعۂ کربلا کے صحیح مفہوم، معنی اور مقاصد ہماری سمجھ میں آسکتے ہیں۔

اس حقیقت سے کون واقف نہیں کہ امام حسینؑ کی تعلیم و تربیت رسولؐ کی آغوش میں ہوئی وہ رسولؐ کے دوش مبارک پر کھیلتے ہوئے پلے بڑھے۔ مباہلہ کے موقع پر بھی رسولؐ ان کو اپنے ساتھ لے گئے۔ انھیں قرآن کا مفہوم رسولؐ نے سمجھایا۔ دوسری طرف حضرت فاطمۃ الزہراؑ کی سیرت کے اثرات بھی انکے خون میں کارفرما تھے۔ سایہ پدری بھی نصیب ہوا تو اس عظیم شخص کا جس کا جواب عالم انسانی میں نہیں۔ جو فقر و زہد کا پیکر بنا۔ خانہ نشین ضرور رہا لیکن جب بھی اسلام پر کوئی سخت گھڑی آئی تو ذوالفقار ہاتھ میں تھامے جہاد کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ جس کی شمشیر کے آگے دیو پیکر کفار کے لشکر تنکے کی مانند ہوا میں اڑ گئے۔

غرضیکہ حسینؑ کا ماحول توحید کی صداؤں، قرآن کی آوازوں، جہاد کے ہنگاموں اور اسلام کی تشریحات کا ماحول تھا۔ ظاہر ہے ایسے ماحول میں پرورش پانے والا حسینؑ کسی فاجر و فاسق حکمران

کی عیش پرستی پر بیعت کیسے کرلیتا؟ ان کی فطرت میں تو زہد واتقاء ورع وحلم، صبر وثبات عزم واستقلال، رافت ومحبت، اخلاق وکرم، سلوک وعمل، جودوسخا، خداپرستی وخداترسی اور عفوودرگذر کے عناصر اس طرح مکمل مل گئے تھے کہ عبادت وریاضت کی انتہا ہوگئی تھی اور اس میں اتنا انہماک تھا کہ دنیاوی چیزوں کی طرف رغبت نہ رہی تھی۔ راتیں بیداری میں گذارتے تھے۔ زندگی میں پچیس حج پیادہ پا کئے۔ آپ عربی کے ماہر تھے اور آپ کا کلام فصاحت کے ساتھ ساتھ انتہائی بلیغ ہوتا تھا۔ آپ کی سخاوت وفیاضی کا یہ عالم تھا کہ کوئی سائل بھی آپ کے آستانہ عالیہ پر آکر محروم نہ جاتا تھا۔ بردباری اور تحمل کا مادہ آپ کو حضرت علیؑ سے وراثت میں ملا تھا۔ جذبۂ حریت آپ میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ایک جانباز، بہادر، غیور، حساس، مدبر اور جری سپاہی تھے۔ حضرت علیؑ کی طرح آپ بھی اسلامی علوم کے انتشار میں کافی فرائض انجام دیتے رہے۔ آپ کو قدرت نے ایسا ملکۂ خطابت عطا کیا تھا جس میں طلاقتِ زبان، حسنِ بیان، حسنِ صوت اور حسین اشارے بھی موجود تھے۔ آپ میں عملی قوت بے انتہا تھی۔ صبر واستقلال آپ کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ آپ صاحب گفتار ہی نہیں، صاحب کردار بھی تھے۔ حق گوئی وبے باکی آپ کی فطرت میں داخل تھی۔ غرضیکہ یہ آپ کے اسوۂ حسنہ کی چند مثالیں تھیں ورنہ اگر تفصیل سے لکھا جائے تو دفتر کے دفتر بھی کافی نہ ہوں اب اسکے برعکس یزید کا کردار ملاحظہ کیجئے کہ صرف امام حسینؑ ہی نہیں بلکہ تمام عالم اسلام اس کو زانی وشرابی اور فاسق وفاجر سمجھتا تھا۔ کسی بھی دور کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے یزید کی بدکرداری، بداخلاقی، بدنفسی اور مذہب بیزاری کی داستان سناتی نظر آئیگی اور ستم ظریفی یہ تھی کہ اسی مذہب بیزار شخص کے ہاتھوں میں زمانے نے مذہب کی زمام تھمادی تھی۔

دراصل یزید نے جن وجوہ سے اسلامی تعلیمات کی مخالفت کی انکی نوعیت صرف سلبی نہیں بلکہ وہ ایک ایجابی بنیاد پر بھی قائم ہے۔ وہ صرف یہی نہیں کہ اسلامی تعلیمات اور اس کے قائم کئے ہوئے حدود وقیود کو غلط سمجھتا تھا بلکہ انکو مٹا بھی دینا چاہتا تھا کیونکہ وہ اسی نظام کا نمائندہ تھا جس کی تدوین وتشکیل رسولِ اکرم کی زندگی ہی میں الٰہی نظام کے مقابل کی گئی تھی۔ وہ اسی خاندان کا فرد تھا کہ جس کے پیش رو اپنی اسلامی دشمنی میں نہایت نمایاں تھے اور جنھوں نے حالات سے مجبور ہوکر بظاہر حق کو قبول کرلیا تھا۔ مگر ان کے دل اسی طرح سخت وسیاہ تھے۔

(رضا کار لاہور سید شہدا نمبر ۶۴ مولانا سید محمد جعفر "حسین اور اسلام" صفحہ ۱۱۵)

یزید نے اپنے کردار کی سیاہی سے تاریخ اسلام کے صفحات کو تاریک کرنا چاہا تھا مگر نورِ اقدس رسالت سے ٹوٹی ہوئی شعاعِ حسینی نے اس ظلمت پر فتح پائی۔ البتہ تاریخ یزید کے ذلیل ارادوں اور عزائم کی گواہ بن گئی۔

جسٹس امیر علی "اسپرٹ آف اسلام" میں لکھتے ہیں۔

"یزید ظالم اور غدار تھا۔ اس کی خبیث طبیعت رحم وانصاف سے ناآشنا تھی۔ وہ مذہبی پیشواؤں کی تذلیل اسی طرح کرتا تھا کہ ایک بندر کو علماء وفقہا کا لباس پہنا کر ایک سجے ہوئے گدھے پر سوار کرکے اپنے ساتھ ہر جگہ لے جاتا تھا"۔ (ایضاً)

ابن الفوطی اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں۔

"یزید نے اس بندر کی کنیت ابوقیس قرار دی تھی۔ وہ اسکو اپنے ساغر کی بچی ہوئی شراب پلاتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ بنی اسرائیل کا ایک بزرگ ہے جو گناہ کرنے کی وجہ سے مسخ ہوگیا ہے"۔

واقدی نے عبداللہ بن حنظلہ غسیل الملائکہ کی زبانی روایت کی ہے کہ "وہ ایسا شخص تھا جو اپنی سوتیلی ماؤں اور اپنی بیٹیوں تک کو نہیں چھوڑتا تھا۔ شراب آزادی سے پیتا تھا اور نماز ترک کرتا تھا"۔

رسولِ اکرم سے محبت اور ان کا ادب اس کے دل میں کتنا تھا اس کا اندازہ شاہ عبدالحق محدث دہلوی کی اس روایت سے ہوسکتا ہے کہ حضرت عائشہ کے حسن وجمال کو سن کر آپ کے بارے میں ہوس کی۔ جب لوگوں نے منع کیا تو باز آیا۔ (مدراج النبوۃ صفحہ ۱۴۵) (بحوالہ رضا کار لاہور صفحہ ۶۴)

اسی طرح مصر سے شائع ہونے والے دیوانِ یزید کے اشعار اس کے غیر اسلامی خیالات سے لبریز ومملو ہیں۔ ان اشعار میں قوانینِ شریعت کا مضحکہ اڑایا گیا ہے اور قرآن وحدیث کے ساتھ تمسخر کیا گیا ہے۔ اسکے اشعار اسکے کردار اور رنگِ طبیعت کے آئینہ دار ہیں۔ مثلاً یہ اشعار جن میں محرماتِ شرعیہ کے ارتکاب کی جرت دلائی گئی ہے اور ممنوعاتِ شرعیہ کی طرف رہبری کرتے ہوئے احکامِ شریعت کا مذاق اڑایا گیا ہے۔

فان حرمت یوما علیٰ دین احمد   فخدھا علیٰ دین المسیح ابن مریما

(اگر دین احمد میں شراب پینا حرام ہے تو خیر دین مسیح پر ہوکر پی لو)

اسی طرح ایک دوسرے شعر میں جرأت بادہ نوشی دلاتا ہے۔

ماقال ربك الله اشربوا بل قال ربك ويل لّ لمصلّين

(خداوند عالم شراب پینے والوں کو ویل اللشاربین کہیں نہیں کہتا بلکہ کلام پاک میں نمازگذاروں کو ویل للمصلین ضرور کہا ہے۔)

مولوی سید محمد باقر شمس لکھنوی لکھتے ہیں۔

"بنی امیہ کا نوجوان نفس پرست بادشاہ تختِ حکومت پر بیٹھا۔ ممالک اسلامیہ میں ظلم وستم کا دور ہوگیا اس نے احکام شرعیہ کو الٹ پلٹ کردیا۔ احکام الٰہی کی بالاعلان مخالفت کی۔ شراب خواری، زنا کاری، قمار بازی اس کے طرز معاشرت کا اہم جزو ہوگئی۔ سرِ بازار اصحاب رسول کو کوڑوں سے پٹوایا۔ احکام شرعیہ کا مضحکہ کیا۔ ماں بہنوں سے زنا کی۔ خدا کی عبادت کرنا اسکی اجازت پر منحصر ہوا۔ اس کی فہرستِ مظالم کا ایک جزو یہ بھی ہوا کہ جب مدینہ پر فوج کشی کی گئی تو اسکے لشکر نے تین سو کنواری لڑکیوں سے زنا کیا۔ سات سو قاریانِ قرآن، تین سو اصحابِ رسول قتل کئے گئے کئی روز تک مسجد نبوی کی بے حرمتی کی گئی اور وہ معطّل پڑی رہی۔ یہاں تک کہ اس میں کتے اور درندے داخل ہوئے اور کتوں نے منبرِ رسولؐ پر پیشاب کیا۔ اس نے تختِ خلافت پر گل رخسار، پری جمال معشوقوں کے جھرمٹ میں جام بدست بیٹھ کر خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین کے لقب اختیار کئے"۔

("شہادت حسین کے اسباب ونتائج" مولوی سید محمد باقر شمس لکھنوی سرفراز محرم نمبر ۱۳۵۵ھ۔

واقدی نے عبداللہ بن حنظلہ کی زبانی اس روایت کو نقل کیا ہے کہ" خدا کی قسم یزید کے دورِ خلافت میں ہم کو اس کا یقین ہوگیا تھا کہ آسمان سے ہم پر پتھر برسیں گے"۔

حقیقت تو یہ ہے کہ یزید کبھی مسلمان نہیں ہوا۔ اپنی عیسائی ماں کے ساتھ عیسائی قبیلہ میں پرورش پائی۔ شکار، لہو لعب، شراب خواری اور زنا کاری اس کے مشاغل تھے۔ وہ دھوکے باز اور ظالم تھا۔ اس کی ذلیل طبیعت میں رحم وانصاف کا مادّہ نام کو نہ تھا۔ اس کے ساتھی کمینہ وبدخصلت تھے۔ وہ بزرگانِ دین کی توہین کرتا تھا۔ ناہموار فطرت، کج اخلاق شقاوت اور خشونت کا معدن تھا۔ سرمایہ داری کا بھوت اس پر سوار تھا۔ وہ نہ کسی اخلاقی مسلک کا قائل تھا نہ معاشرتی مسلک کا سالک۔ اسکو اسلام سے نفرت اور کفر کی محبت اپنے خاندانی ورثے میں ملی تھی۔ اسکی نظروں میں

اسلام کا لایا ہوا انقلاب بے معنی تھا اور اسلام کا عطا کردہ نظام حیات بے کار ونا قابلِ عمل۔ حقوق راعی ورعایا اس کی نگاہ میں بے حقیقت تھے اور قیود اخلاق ومروّت بے اصل۔ جنت ودوزخ کو وہ تصوّر وہم خیال کرتا تھا۔ تقدس وتقویٰ اسے خام خیالی نظر آتے تھے۔ وہ خدا رسولؐ اور دین کا منکر تھا۔ وحی الٰہی سے اسے سراسر بدگمانی تھی اور اسلام کی انقلاب آفرینی اسکے نزدیک بنو ہاشم کی ایک چال تھی، جو حصولِ اقتدار کے لیے چلی گئی تھی۔

انکار بیعت :-

امام حسینؑ اور یزید کے کردار کے تقابلی جائزے کے بعد اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کربلا کا واقعہ دو شہزادوں کی جنگ نہیں تھی بلکہ وہ اصولوں اور دو نظریوں کی جنگ تھی۔ حسینؑ یزید کے طرز حکومت کو ناپسند کرتے تھے اور اسکی جگہ نظام محمدی قائم کرنا چاہتے ہتے۔ یزید اسلام کے نام پر ملوکیت وقیصریت کی بقا چاہتا تھا اور حسینؑ انکار بیعت کے نام پر روحانیت اور الٰہیت کو سربلند کرنا چاہتے تھے دونوں حریف اپنے اپنے موقف پر جمے رہے۔ نہ یزید نے باطل کو چھوڑا نہ حسینؑ حق سے ایک انچ ہٹے۔ یزید بیعت پر اصرار کرتا رہا اور حسین بیعت سے انکار کرتے رہے یہاں تک کہ یزید نے ولید بن عتبہ حاکم مدینہ کو نامہ لکھا کہ "حسینؑ سے میری بیعت لو اور اگر بیعت نہ کریں تو انھیں قتل کردو"۔ (ترجمہ اعثم کوفی۔ طبع بمبئی صفحہ ۳۵۰۔) لیکن حسین نے بیعت سے انکار کردیا۔

مدینے سے روانگی :-

انکار بیعت کے بعد دوسری صورت یہی تھی کہ حسینؑ راہ فرار اختیار کرلیتے۔ لیکن جس کا باپ کرّار، غیر فرّار ہو جس کا نانا ہزاروں کفار کے درمیان بھی تبلیغ دین کرتا رہے، جس کا دادا ہزاروں دشمنوں کے درمیان بھی پرورشِ رسولؐ سے باز نہ آئے، بھلا وہ حسینؑ ایسا کیونکر کرسکتا تھا۔ اور پھر ان کی روپوشی سے کوئی فائدہ بھی نہ تھا۔ بلکہ اسلام اور خطرے میں پڑ جاتا۔ یزید احکام الٰہی کی توہین کرتا۔ شریعت اسلامی اور زیادہ مذاق اڑاتا اور دنیا یہ سمجھنے پر مجبور ہوجاتی کہ اسلام کا کوئی محافظ نہیں۔ اور حسینؑ کی روپوشی خود بھی سیاسی مقصد کا نتیجہ سمجھی جاتی اور ممکن تھا کہ مدینہ اس وجہ سے خونریزی کا میدان بن جاتا۔ اس لیے آپ نے خونریزی سے پرہیز کرتے ہوئے مدینے کو خیرباد

کہااور مکّہ کی طرف کوچ کیا۔

مکّہ سے کربلا کا سفر :-

مکّہ پہنچنے کے بعد بھی جب آپ نے محسوس کیا کہ مکّہ بھی فتنہ وفساد سے محفوظ نہیں رہ سکتا اور یزید کے ساتھی خانۂ خدا کو آپ کے خون سے رنگنا چاہتے ہیں تو آپ فریضۂ حج ادا کیے بغیر مکّہ سے روانہ ہوگئے لیکن مکّہ سے بھی آپ اس وقت تک نہیں نکلے جب تک دنیا کے حاجیوں کی آمد نہ ہوئی۔ مکّہ میں بھی اگر آپ وعظ و پند کرتے۔ حاجیوں کو رسولِ مقبول کی وہ محبت جو آپ سے تھی، یاد دلاتے تو بھی مکّہ، مدینہ اور یمن سے اچھا خاصا گروہ آپ کا مددگار ہو جاتا۔ مگر چونکہ آپ کو ذاتی جنگ سے کوئی واسطہ نہ تھا اسلیے حج کو عمرہ سے بدل کر مکّہ چھوڑ دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ مکّہ ہی میں آپ کو اہلِ کوفہ کے خطوط موصول ہوئے تھے اور خطوط بھی مذہبی رہنمائی کے لیے آئے تھے اسلحوں سے امداد کرنے کے لیے نہیں آئے تھے۔ امامؑ جانتے تھے کہ وہاں کے زیادہ تر باشندوں کے دل و دماغ کیسے ہیں لیکن پھر بھی دنیا کو انکی حقیقت بتانے کے لیے اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کو کوفہ روانہ کر دیا اور خود کربلا کا رخ کیا۔

ورودِ کربلا :-

۸ رذی الحجہ ۶۰ھ کا دن وہ اہم دن ہے جب امام حسین تاریخ عالم میں ایک ناقابل فراموش باب کا اضافہ کرنے کی خاطر مکّہ سے کوفہ کی جانب روانہ ہوئے۔ کاروانِ حسینی ابھی منزل تک پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ ثعلبیہ کے مقام پر جنابِ مسلم کی شہادت کی خبر موصول ہوئی۔ امام حسینؑ سمجھ گئے کہ آگے کونسی منزل ہوگی۔ اس کے بعد کا سفر آپ کو منزل زبالہ کے قریب لے آیا جہاں حُر بن یزید ریاحی ایک ہزار سواروں کے ساتھ آپ کے راستے میں مزاحم ہوا کیونکہ عبداللہ ابن زیاد کا حکم تھا کہ ''حسینؑ کے ساتھ سختی سے کام لو اور ان کو اترنے پر مجبور کرو ایک خشک زمین پر، جہاں کوئی پناہ لینے کا ٹھکانا اور پینے کے لیے پانی موجود نہ ہو۔ میں نے قاصد سے کہہ دیا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ رہے جب تک کہ میرے حکم کی تعمیل نہ ہو جائے''۔

نتیجتاً امام حسینؑ کا یہ چھوٹا سا قافلہ اس زمین پر وارد ہو گیا جسے آج دنیا کربلا کے نام سے جانتی ہے۔ امام حسین اپنی شہادت گاہ کو پہچان کر گھوڑے سے اتر پڑے قافلے کو پڑاؤ کا حکم دیا۔ سب

سے پہلے کربلا کی زمین ساٹھ ہزار درہم میں خرید فرمائی۔ یہ وہی سرزمین تھی جس کی پیشین گوئی رسولؐ اسلام نے پہلے ہی فرمادی تھی جس کی مقدس مٹی جناب ام سلمہ کو مرحمت فرمائی تھی۔ نہر فرات سے دور خیمے نصب کیے گئے اسلیے کہ شامی فوجیوں نے آپ کو پانی سے قریب ٹھہرنے کی اجازت نہ دی۔ یہ محرم الحرام کی تیسری تاریخ تھی۔ ۶ محرم کو تقریباً تیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل یزیدی لشکر کربلا میں جمع ہوا لیکن اس پر بھی حسینؑ کے ساتھی خوفزدہ نہ ہوئے تو ساتویں محرم سے یہ سخت اقدام کیا گیا کہ ان پر پانی بند کر دیا گیا۔

۹ رمحرم کی شام بھی نہ ہونے پائی تھی کہ امام حسینؑ پر بے اطلاع حملہ کر دیا گیا۔ جب حضرت عباس استفسار کو پہنچے تو انکو جواب ملا کہ ''امیر ابن زیاد کا حکم آیا ہے کہ تم لوگوں سے امیر کی اطاعت قبول کرنے کا مطالبہ کیا جائے اور نہیں تو پھر جنگ ہو''۔ حضرت عباس نے امام حسینؑ تک پیغام پہنچایا۔ امام حسینؑ نے اسی سلسلے میں ایک رات کی مہلت مانگی کہ وہ خدا کی عبادت کر لیں صبح کو دیکھا جائے گا۔ اس رات حسینؑ نے عبادت تو کی ہی لیکن یہ بات بھی دنیا پر ثابت کر دی کہ اگر رات کے اندھیرے میں لڑائی شروع ہوتی تو دنیا دیکھ نہ پاتی کہ کس نے انکا گلا کاٹا۔ کس نے خیمے جلائے۔ کس نے لاشوں پر گھوڑے دوڑائے۔ کس نے ششماہے پر تیر چلائے۔ کس نے اہلِ بیت کو لوٹا۔ صبح کے اجالے میں وہ انکار بھی کر دیتا اور تاریخ میں سرخرو ہو جاتا۔

اس رات امام حسینؑ نے اپنے ساتھیوں کو واپس لوٹ جانے کا موقع بھی عطا کیا لیکن بجھی ہوئی شمع کی لو جب دوبارہ روشن ہوئی تو پتہ چلا کہ اصحاب حسینی کس آہنی ارادے کے مالک تھے۔

شب عاشور تمام ہوئی۔ سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی حُسینؑ اور انکے ساتھیوں پر دوران نماز ہی دوشمن کی جانب سے تیروں کی بارش ہونے لگی۔ اس طرح دنیا کی اس جنگ کا آغاز ہوا جس کی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی اور عصر تک امام حسین اور انکے بہتر ساتھیوں نے راہ حق میں اپنی جانیں فدا کر دیں۔

تاراجئی خیام :-

دشمنوں کے مظالم یہیں پر ختم نہیں ہوئے۔ بعد شہادتِ حسین خیمے لوٹے گئے۔ چادریں چھینی گئیں۔ گوشوارے چھینے گئے۔ یتیموں کو طمانچے مارے گئے۔ خیموں میں آگ لگائی گئی۔ عابد بیمار

کا بستر کھینچا گیا۔ ان کی گردن میں طوق ڈالا گیا انھیں پا بہ زنجیر کیا گیا ناموسِ اہل بیت کے بازوؤں میں رسن باندھے گئے اور بے مقنع و چادر شام کے بازاروں میں پھرایا گیا۔

کربلا سے کوفه و شام تك :۔

حرم رسول کا یہ لٹا ہوا قافلہ بلاؤں پر بلائیں اور مصیبتوں پر مصیبتیں جھیلتا ہوا کربلا سے کوفہ اور پھر کوفے سے دمشق کی طرف لے جایا گیا۔ اور وہ بھی اسی صورت سے کہ نہ کجاوہ تھا نہ عماری۔ نہ پردہ تھا نہ سواری۔ آگے آگے نیزوں پر شہدائے کربلا کے سر تھے اور پیچھے پیچھے اہل بیت رسولؐ۔ لیکن اس عالم میں بھی نہ حضرت زینب نے جرائت کا دامن چھوڑا۔ نہ سیّد سجادؑ نے صبر و ہمت، بیبا کی و حق گوئی کو ہاتھ سے جانے دیا۔ حق پرست زبانیں باطل کے ظلم سے خموش نہ ہو سکیں۔ دربار یزیدی میں وہ خطبے دیے کہ دنیا پر حق آشکار ہو گیا۔

جس زمانے میں اہل بیت رسولؐ قید شام میں تھے، مملکت یزید میں انقلابی آثار ہو رہے تھے۔ اس نے یہ خیال کیا کہ اس انقلاب کو روکنے کے لیے اہل بیت رسول کو رہا کر دینا چاہئے ورنہ سلطنت تباہ ہو جائیگی۔ بعض موزخوں کا یہ خیال ہے کہ مردان نے یزید سے یہ کہا تھا کہ مناسب یہ ہے کہ ملک میں جو بے چینی پھیلی ہوئی ہے اسکو دبانے کے لیے اہل بیت رسول کو سید سے رہا کر دیا جائے ورنہ سلطنت تباہ ہو جائیگی۔ بہر کیف یزید نے اپنی سلطنت کو بچانے کے لیے اسیرانِ کربلا کو رہا کر دیا اور ایک سال تک زندان یزید میں اذیتیں برداشت کرنے کے بعد مدینے لوٹے۔

واقعه کربلا کی اهمیت :۔

واقعہ کربلا دنیا کی تاریخ کا وہ عظیم اور عجیب و غریب واقعہ ہے جو نہ آج تک دنیا کے کسی گوشے میں ظہور پذیر ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ عام طور پر جو جنگیں ہوتی ہیں وہ اکثر دو باشاہوں میں ہوتی ہیں لیکن یہاں تو ایک طرف جابر و ظالم حکمراں تھا اور دوسری طرف ایک روحانی پیشوا جو فقر و فاقہ کا عادی تھا۔ ایک طرف ہزاروں کی فوج تھی تو دوسری طرف بہتر نفوس اور وہ بھی بھوکے اور پیاسے۔ یزید کے ان بے شمار سپاہیوں میں عرب کے مانے ہوئے پہلوان، طاقتور اور شجاع سپاہی موجود تھے جبکہ بہتر نفوس کے حسینی قافلے میں ساٹھ ستر سالہ بوڑھے بھی تھے جن کی کمریں

خمیدہ تھیں۔ ہاتھوں میں رعشہ تھا اور بینائی جواب دے چکی تھی۔ ایسے جوان بھی تھے جن کی مسیں بھیگ رہی تھیں، ایسے بچے بھی تھے جو گھوڑے پر خود چڑھ کر بیٹھ بھی نہ سکتے تھے، ایسے کم سن سپاہی تھے جنکے ننھے ننھے ہاتھوں میں نیچے سنبھلتے نہ تھے اور وہ ششماہا بھی تھا جس کے ہونٹوں پر کا دودھ بھی نہ سوکھا تھا۔ ایک طرف سیراب سپاہی تھے تو دوسری طرف بھوکے پیاسے اور نقاہت کے مارے جاں نثار۔ اسکے باوجود بھی حسینی قافلے کے یہ جیالے سپاہی ہمت و جرأت، صبر و استقلال اور ایثار و قربانی کی وہ مثالیں پیش کر گئے کہ جن کا جواب دنیا آج تک نہ دے سکی۔

تاریخی حیثیت سے کسی واقعے کی اہمیت کا اندازہ لگانا ہو تو اسے تین پہلوؤں سے دیکھنا ہوگا۔ ایک تو یہ کہ اسکے ظہور پذیر ہونے کی مدّت کتنی ہے؟ دوسرے یہ کہ اس نے کتنی توسیع پائی۔ تیسرے یہ کہ وہ کیوں ظہور پذیر ہوا؟

واقعۂ کربلا کے اسباب و علل سے تو ساری دنیا واقف ہے۔ عام طور پر جنگ کرنے والوں کا اپنا ذاتی مفاد جنگ کا باعث ہوتا ہے۔ یا توسیع حکومت کی شکل میں، یا حصول اقتدار کی شکل میں، یا تحصیل مال و زر کی خاطر۔ دنیا کے زبردست سے زبردست فاتحین نے اسی مقصد کے تحت جنگ کی۔ نپولین ہو یا سکندر، دارا ہو یا قیصر۔ ہر ایک کا مقصد یہی تھا۔ اسی لیے ان جنگوں سے عالم انسانیت کو کوئی فائدہ نہ پہنچ سکا۔ سکندر نے دنیا فتح کر لی تو تمام انسانوں کو کیا ملا؟ نپولین روس تک آ پہنچا تو دنیا نے کیا پایا؟ ان جنگوں کا مقصد محض خونریزی اور تباہی تھا۔ لیکن فاتح اعظم حُسینؑ نے جو جنگ کی وہ انسانیت کی بقا کی خاطر تھی۔ یزید کربلا میں اس گروہ کی نمائندگی کر رہا تھا جس میں ہمیشہ سے طلب جاہ چلی آ رہی تھی اور جو اپنے مقصد کے حصول کی خاطر اسلامی اصولوں کو مٹانے کے درپے تھا۔ اس کا خیال تھا دنیا میں ہر شئے کا وجود مادّی قوت پر منحصر ہے۔ حُسینؑ جس گروہ کی نمائندگی کر رہے تھے اسکا اصول قطعیٔ جداگانہ تھا۔ وہ ظلم کو رحم سے مٹانا چاہتے تھے۔ غصہ کو حلم سے فرد کرنا چاہتے تھے۔ زعم باطل کو صبر سے مٹانا چاہتے تھے۔ یزید اپنی قوت کا زعم کم نہیں کر سکتا تھا حسینؑ اپنا اصول چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ اس معرکہ میں حسینؑ کی فتح یہی ہے کہ باوجود تمام نمائشِ ظلم کے وہ اپنے طریق پر قائم رہے۔ مختصر یہ کہ واقعہ کربلا کا عموم انسانیت پر یہ احسانِ عظیم ہے کہ وہ بلا استثناء ہر انسان کو خواہ وہ کسی مذہب و ملت کا ہو، کسی ملک و قوم کا ہو۔ اپنے بے پناہ درد میں شریک

کر لیتا ہے اور اس سے دل میں وہ لطافت اور نرمی پیدا ہوتی ہے جس سے آئینہ شرافت کو جلا اور شمع دیانت کو ضیاء حاصل ہوتی ہے۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ اس واقعے کے ظہور پذیر ہونے کی مدت کتنی ہے؟ ۶۱ھ میں یہ واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ اس وقت تقریباً چودہ سو سال سے زیادہ گذر چکے ہیں لیکن آج بھی وہ اتنا ہی تازہ ہے جیسے کل کا واقعہ ہو۔ دنیا کی بڑی بڑی جنگیں ہوئیں اور انکی یادیں کچھ دنوں تک باقی رہیں پھر انسانی ذہن انھیں فراموش کر گیا لیکن واقعۂ کربلا وہ جنگ ہے جس میں بہائے جانے والے خون کی مہک آج بھی دلوں کو گرما رہی ہے آج تک اس موضوع پر مضامین نظم ونثر کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ لگا ہوا ہے واقعات کربلا کے متعلق اب تک جس قدر طویل ومختصر مضامین، نظمیں، مقالے اور خاکے لکھے جا چکے ہیں شاید ہی کسی اور واقعے کے متعلق اتنا لٹریچر مہیا ہو سکا ہو اور نہ صرف اُس علاقے میں جہاں یہ ظہور پذیر ہوا بلکہ دنیا کے گوشے گوشے میں۔ بقول کفل

معبود کے مقصد کی طرح پھیل گئے
ہر ملک میں، ہر قوم میں، ہر گھر میں حسینؑ

اخلاقی اصلاح کے جتنے پہلو اس واقعے سے ملتے ہیں شاید ہی کسی اور واقعے سے ملیں واقعۂ کربلا اور اصل کربلا دراصل اخلاقیات کا ایک مکمل باب ہے جس کا مطالعہ انسانی تہذیب کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ مولانا شہید صفی پوری نے ایک بہت ہی باریک نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

''انھیں (امام حسینؑ) قانونِ فطرت کے پر حکمت ہونے کا یقین تھا وہ انسانی صلاحیتوں سے واقف تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ نظام اجتماعی کی خرابیاں انسان کے جہل کا نتیجہ ہیں وہ انسان کے مستقبل سے مایوس نہ تھے۔ اگر ان کی نظر میں نوع انسانی کے روشن مستقبل کا تصور نہ ہوتا تو وہ کبھی اتنی بڑی قربانی ان کی اصلاح کے لیے نہ کرتے۔ نوع انسانی کی اصلاح کے لیے اتنا حیرت انگیز اقدام وہی شخص کر سکتا ہے جو انسان کی اعلیٰ صلاحیتوں کی طرف سے پر امید ہو۔ حسینؑ نے کربلا میں بتایا کہ نوع انس کی پستی سے یہ نتیجہ نہ نکالنا کہ اس کی اصلاح ممکن نہیں ہے۔ حق کی تبلیغ کئے جاؤ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب انسان حقیقی معنوں میں انسان بن جائے گا۔

(رضا کار لاہور صفحہ ۱۶۷ شہید صفی پوری ''کربلا اسکی ہمہ گیر تعلیمات)

کل تو آئے گی وہ سحر آخر
کیا ہوا آج اگر نہیں آتی

حسینؑ جانتے تھے کہ یزید کی حکومت بظاہر اسلامی ہے مگر بباطن اس پر قیصریت غالب ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ امام حسینؑ یزید کے مقابلے پر نہیں آئے تھے بلکہ اس ملوکیت، سرمایہ داری، ڈپلومیسی اور غیر اسلامی نظریہ کے خلاف صف آراء تھے جو عوام الناس کے حقوق چھین کر خود لہو لعب میں مصروف تھا۔ امام حسینؑ دیکھ رہے تھے کہ عرب میں انھیں کے پاس دولت ہے جو حکومت سے تعاون کر رہے ہیں دار الامارۃ نے بڑے بڑے ایرانی اور رومی بادشاہوں کی آرائش اور عیش آرام کو مات کر دیا ہے۔ لہٰذا وہ غریبوں کی اس حق تلفی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے جس کا اسلام مخالف ہے۔ وہ تمام انسانوں کو برابر کے حقوق دلوانا چاہتے تھے اور اسی لیے یزید کی بیعت سے انکار کر دیا اور ایک انقلاب کے نقیب بن گئے۔ کربلا کے میدان میں امام حسینؑ کے جو ساتھی تھے وہ غریبوں اور مزدوروں ہی کے نمائندے تھے۔

جنگ کربلا نے قانونِ فطرت پر عمل کے راستے کھول دئے۔ میدان کربلا میں حسینؑ نے صبر شجاعت ایثار ورواداری، رحم وکرم، محبت ورفاقت، اعزا کا باہمی برتاؤ، دوستی کی حقیقت وغیرہ کے ذریعے انسانی نفسیات کی عملی مثالیں قائم کر دیں اور فوج یزید نے بداخلاقی اور ظلم وستم کو انتہا پر پہنچا دیا۔ دنیا میں فطرت انسانی پر صحیح عمل کے لیے جنگ کربلا سے بہتر سبق حاصل نہیں ہو سکتا۔

واقعۂ کربلا کے زیر اثر شیعیت کی توسیع :-

یہی وہ خونچکاں واقعہ ہے جو درحقیقت شیعیت کے فروغ کا سب سے بڑا سبب ثابت ہوا جس نے اسلامی دنیا میں ایک عظیم انقلاب پیدا کر دیا۔ حجۃ الاسلام محمد حسین آل کاشف الغطاء فرماتے ہیں:

''۶۱ھ کا یہ دردناک سانحہ جسے المیہ کربلا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اپنی نوعیت کے لحاظ سے بڑا موثر ثابت ہوا۔ شہادت حسینؑ کے اثرات نے عمومیت اختیار کر لی۔ جابر ابن عبداللہ

انصاری، سہل ابن سعد عدی اور انس ابن مالک جیسے صحابہ بھی زندہ تھے۔ فرجا درد سے تڑپ اٹھے اور بتقاضائے فرض و محبت فضائل اہل بیت کی تشہیر میں انھوں نے اپنی سرگرمیاں وار تیز کر دیں۔ اموی جفاؤں نے ان کا پیچھا کیا اور یہ بقیۃ الصحابہ بھی "سیف وسم" کا شکار ہو گئے"۔

(اصل واصول شیعہ صفحہ ۴۰)

"ان واقعات کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ جوق در جوق علیؑ اور اولادِ علیؑ کا دم بھرنے لگے۔ نیز شیعوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہونے لگا۔ جس سرعت سے بنوامیہ کا ظلم بڑھ رہا تھا اسی رفتار سے عوام میں اہل بیت کی محبت جاگزیں ہوتی جارہی تھی۔ آل امیہ نے بہت ستایا۔ جی بھر کے ستم ڈھائے لیکن ہر عمل کا ردِ عمل ہوا اور بڑی شدت سے۔ (اصل واصول شیعہ صفحہ ۴۱)

شہادت امام حسینؑ سے مسلمانوں کی اکثریت بری طرح متاثر ہوئی یہاں تک کہ امویوں میں سے بھی لوگوں نے اس کا اثر لیا۔ انھیں اہل بیت کے فضائل اور ان پر ہونے والے مظالم زبردست احساس ہوا اور وہ اپنی ناواقفیت اور غفلت پر بڑے پشیمان ہوئے کہ وہ اہلِ بیت کا ساتھ نہ دے سکے۔ لہٰذا ان میں سے اکثر لوگ امویوں کے مخالف ہو گئے ہاشمیوں کی طرف عموماً اور علویوں کی طرف خصوصاً راغب ہوئے۔ نتیجتاً شیعوں میں اضافہ ہوا۔ تابعین اور تبع التابعین میں شیعوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا جو بعدِ رسالت حضرت علیؑ کا اوّلین حقِ خلافت تسلیم کرتے تھے۔

شیعہ اور بنوامیۃ :۔

جیسے جیسے شیعیت میں اضافہ ہوتا رہا بنوامیہ کے مظالم بھی ان پر بڑھتے رہے۔ مصنف فجر الاسلام تو یہاں تک لکھتا ہے کہ.....

"...یہ لوگ بنوامیہ کے لیے شدید خطرہ بن گئے تھے اور وہ برابر ان سے چوکنے رہتے تھے۔ ہر طرف انھوں نے شیعوں کا پتہ لگانے کے لیے جاسوس پھیلا رکھے تھے اور انھوں نے شیعوں کو بری طرح پامال کیا۔ انھوں نے امام حسینؑ کے خلاف سازش کی۔ انکے پہلو میں خنجر مروایا۔ لیکن وہ اس زخم سے بچ گئے۔ پھر امام حسنؑ کی فوج میں انھوں نے بددلی پھیلائی۔ حتّٰی کے وہ انھیں چھوڑ کر الگ ہو گئے۔ پھر امام حسینؑ کو کربلا میں شہید کیا۔ اس کے بعد چن چن کر اہل بیت کو

ذلیل و خوار کیا۔ کہیں انھیں قتل کیا۔ کبھی کو تہمت لگا کر ان کے ہاتھ پاؤں کٹوا دئے۔ جس شخص پر انھیں شیعانِ علیؑ میں سے ہونے کا گمان ہوا، اسے قید کر دیا۔ اسکا مال و اسباب لوٹ لیا۔ اسکا گھر گروا دیا .... (فجر الاسلام از علامہ احمد امین اردو ترجمہ از عمر احمد عثمانی طبع دوم صفحہ ۷۷)

"بنوامیہ کی عیاشیاں یوں بھی عوام کے لیے ناقابل برداشت ہوتی جارہی تھیں کیونکہ بنوامیہ کے اکثر نوجوان جس قسم کی زندگی بسر کرتے تھے اسے جاہلیت سے تو قریب تر کہا جا سکتا تھا مگر اسلام سے قریب تر نہیں کہا جا سکتا۔ شراب، شکار، عورتوں سے عشق اور شاعری میں اس کا اظہار انکا دلچسپ مشغلہ تھا۔ شام کا وقت عموماً اُن خلفاء کی تفریح اور لوگوں سے ملنے ملانے کا ہوا کرتا تھا۔ عبدالملک مہینے میں ایک بار شراب پیتا تھا لیکن بہت زیادتی کے ساتھ۔ یزید ثانی نغمہ و سرور کا بڑا شائق تھا اور اپنی دو مغنی کنیزوں سلامہ اور حبابہ سے حد درجہ مانوس تھا اس کا بیٹا ولید ثانی شراب خواری میں سب سے بازی لے گیا جو شراب کے حوض میں پیرتا تھا اور اتنی شراب پی جاتا تھا کہ شراب کی سطح کم ہو جاتی تھی۔ یہ رقص و سرور کی محفل میں شراب پیتا اتنا بدمست ہو جاتا تھا کہ عام و خاص کی تفریق نہ رہتی۔" ("عہد بنی امیہ کا مالیاتی وثقافتی نظام" از نیاز فتح پوری۔ نگار مارچ ۵۵)

"یہ تمام خلیفہ کتوں کے ذریعے شکار کے شوقین تھے اور جوئے کے دلدادہ۔ عورتیں ان کی کمزوری تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر ان کی بیویوں کا کافی اثر تھا" (نیاز فتح پوری۔ نگار مارچ ۵۵)

چونکہ ان میں دنیا بھر کی کمزوریاں تھیں لہٰذا اپنی ان خامیوں کو جائز قرار دینے کی غرض سے وہ ہمیشہ فضائل اہل بیت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے رہے تا کہ عوام ان سے منحرف نہ ہوں۔ یہی نہیں باقاعدہ حضرت علیؑ پر تبرا بازی بھی ہوتی رہی۔ حدیثیں بھی گھڑی جاتی رہیں اور خلاف پروپیگنڈہ بھی ہوتا رہا۔

علامہ شبلی اس سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں :

"حدیث کی تدوین بنوامیہ کے زمانے میں ہوئی جنھوں نے پورے نوّے برس تک سندھ سے ایشیائے کوچک اور اندلس تک مساجد میں آلِ فاطمہ کی توہین کی اور جمعہ میں سر منبر حضرت علیؑ پر لعن کہلوایا۔ سیکڑوں ہزاروں حدیثیں امیر معاویہ وغیرہ کے فضائل میں بنوائیں۔ عباسیوں کے زمانے میں ایک ایک خلیفہ کے نام پیشین گوئیاں حدیثوں میں داخل ہوئیں لیکن نتیجہ کیا ہوا؟ عین

اُسی زمانے میں محدثین نے علانیہ منادی کرادی کہ یہ سب جھوٹی روایتیں ہیں۔آج حدیث کافن اس خس وخاشاک سے پاک ہے اور بنوامیہؓ اور بنوعباسیہ جو ظل اللہ اور جانشین پیغمبر تھے اسی مقام پر نظر آتے ہیں جہاں ان کو ہونا چاہئے تھا۔" (سیرۃ النبی حصہ اول صفحہ ۶۱)

ظاہر ہے ایسے عالم میں فضائلِ اہل بیت بیان کرنے کے لیے کون زبان کھول سکتا تھا اور جو ہمت کرتا تھا اسکو سخت سے سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور جان سے ہاتھ دھونے پڑتے تھے۔اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ ولائے آل محمدؐ نا قابلِ معافی گناہ اور حکومت کے لیے زبردست خطرہ تھا۔اسی وجہ سے نہ جانے کتنے شیعوں کے خون بہائے گئے۔ان کے گھر منہدم، ان کے مال و اسباب ضبط اور ان سے قید خانے بھر دئے گئے۔جس شخص کو بھی حکومت کے عتاب کا ڈر ہوتا یا خطرہ محسوس ہوتا کہ کہیں حکومت کی مخالفت کا الزام مجھ پر عائد نہ ہو جائے اسکے لیے آسان ترین تدبیر یہ تھی کہ اہل بیت کی عداوت اور انکے شیعوں کی مذمت کرے۔خواہ نظم میں یا نثر میں۔کتاب لکھ کر، حدیث وضع کر کے یا تصنیف کر کے۔

سنّی عالم محمدؐ عسکری رقم طراز ھیں :۔

"بنوامیہؓ کے زمانے میں اہل بیت اطہار علیہم السلام کے خلاف اعلانیہ سب کچھ آزادی کے ساتھ کہا جاتا تھا۔اس کے بعد بھی یہی سلسلے جاری رہا اور اسکا اثر ابتک اتنا باقی ہے کہ اُن حضرات سے محبت جتنی ہونی چاہئے ہمارے قلوب میں نہیں ہے۔فضائلِ اہل بیت کرام اس وقت بیان کرنے کی کسے ہمت تھی۔دوسری صدی کے امام فقہاء مجتہد حضرت امام شافعی نے ہمت کی۔نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جان سے تو بچ گئے مگر رفض کی تہمت سے نہ بچ سکے اور اس طعن وتشنیع سے تنگ آ کر پکار پکار کر فرماتے تھے (اگر اہل بیت علیہم السلام رفض ہے تو جن وانس گواہ ہیں کہ میں رافضی ہوں۔"

(رسالہ دارالعلوم دیوبند جولائی ۱۹۵۷ء صفحہ ۳۵)

امام عبدالرحمٰن احمد ابن شعیب نسائی جب حضرت علیؑ اور اہل بیت اطہار کے مناقب لکھ کر فارغ ہوئے تو چاہا کہ دمشق کی جامع مسجد میں پڑھ کر سنائیں تا کہ بنوامیہؓ کی سلطنت کے اثر سے

عوام میں ناصبیت کی طرف جو رجحان پیدا ہو گیا ہے اسکی اصلاح ہو جائے۔ابھی اس کا تھوڑا سا ہی حصہ پڑھنے پائے تھے کہ ایک شخص نے ان سے امیر معاویہ کی فضیلت کے بارے میں سوال کیا۔انھوں نے کوئی منہ توڑ جواب دیا جس کی وجہ سے لوگ ان پر ٹوٹ پڑے اور شیعہ شیعہ کہہ کر اتنا مارا کہ نیم جان کر دیا۔آخر کار آپ کا انتقال ہو گیا۔

(ترجمان السنہ جلد اول از مولانا بدر عالم رسالہ دارالعلوم دیوبند جولائی ۵۷ صفحہ ۳۵)

عبیداللہ ابن زیاد قاتلِ حسینؑ کے زمانے میں تو شیعوں پر عرصہ زیست تنگ ہو گیا تھا زیاد کے بعد حجاج آیا جس نے بہت بری طرح سے انھیں قتل کیا اور ہر تہمت اور ہر سازش میں ان کو پکڑا۔حتی کہ اس کا یہ حال ہو گیا تھا کہ اگر کسی شخص کے متعلق اس کے سامنے کہا جاتا کہ وہ زندیق یا کافر ہے تو یہ بات اس سے کہیں زیادہ گوارا تھی کہ اس کے سامنے کہا جائے کہ وہ شیعہ علیؑ میں سے ہے۔لوگوں کا بیان ہے کہ ایک آدمی نے (خیال یہ ہے کہ وہ شخص اصمعی کے دادا تھے) حجاج کے سامنے کھڑے ہو کر کہا "اے امیر! مجھ پر میرے گھر والوں نے بڑا ہی ظلم کیا ہے کہ میرا نام علیؑ رکھ دیا ہے۔ورنہ میں ایک محتاج اور ضرورت مند آدمی ہوں اور مجھے امیر کی صلۂ رحمی کی سخت ضرورت ہے۔حجاج کو اس بات پر ہنسی آ گئی اور اسے کسی خدمت پر مقرر کر دیا۔مدائنی کا بیان ہے کہ زیاد بن سمیہ شیعوں کو چن چن کر پکڑتا تھا کیونکہ اسے ان کا پورا حال معلوم تھا کیونکہ حضرت علیؑ کے دورِ حیات میں وہ خود ان کے ساتھ شریک رہ چکا تھا۔

چناں چہ زیاد نے ہر پتھر اور ہر ڈھیلے کے نیچے قتل کیا اور ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ کاٹ کر انھیں انتہائی خوف زدہ کر دیا تھا۔اسنے انکی آنکھوں میں دہکتی ہوئی سلائیاں پھیریں۔انھیں کھجوروں کے تنوں پر سولیاں دیں۔انھیں منتشر کر کے عراق سے اس طرح ملک بدر کیا کہ وہاں مشہور ومعروف شیعہ باقی نہ رہا۔" (فجر الاسلام از احمد امین اردو ترجمہ عمر عثمانی صفحہ ۷۶،۷۷)

امیر معاویہ نے اپنے تمام گورنروں کو ہر طرف لکھ دیا تھا کہ شیعانِ علیؑ اور اہل بیت کے کسی آدمی کی شہادت قبول نہ کی جائے۔مدائنی کا بیان ہے کہ "امیر معاویہ نے اپنے گورنروں کو یہ بھی لکھ بھیجا تھا کہ تحقیق کرو۔جن لوگوں کے متعلق یہ بات ثابت ہو جائے کہ وہ حضرت علیؑ اور انکے اہل بیت سے محبت کرتے ہیں ان کا نام دیوان سے کاٹ دو اور اسکا روزینہ اور وظیفہ بند کر دو۔" (ایضاً)

علامہ طباطبائی لکھتے ہیں :

شیعہ کہ اساساً اختلاف نظر اساسی شان با اکثریت تسنن در سر دو مسئلہ خلافت اسلامی و مرجعیت دینی بود، در این دورۂ تاریک روزگاری تلخ و دشواری می گزرانیدند۔ ولی شیوۂ بیدادگری و بی بند و باری حکومت ہائے وقت و قیافۂ مظلومیت و تقویٰ طہارت پیشوایان اہل بیت آنان را روز بروز در عقاید شان استوار تر میساخت و مخصوصاً شہادت دلخراش حضرت حسین پیشوای سوم شیعہ در توسعہ یافتن تشیع و بویژہ در مناطق دور از مرکز خلافت مانند عراق و یمن و ایران کمک بسزائی کرد۔

(''شیعہ در اسلام'' از علامہ طباطبائی صفحہ ۲۵)

شیعہ اور بنو عباس :

شیعوں پر مصائب و آلام کا سلسلہ یوں ہی جاری رہا۔ یہاں تک کہ عباسیوں کی حکومت شروع ہوئی۔ بقول مصنف فجر الاسلام۔

''یہ شیعوں کے حق میں بنوامیہ سے بھی دس قدم آگے نکلے۔ مصیبت یہ تھی کہ عباسیوں کو ان کے پوشیدہ ٹھکانوں اور پناہ گاہوں تک کا پورا پورا علم تھا۔ کیونکہ بنوامیہ کے دور میں یہ لوگ شیعوں کے ساتھ مل جل کر کام کرتے تھے۔'' (فجر الاسلام ص ۲۷۷)

عباسی خلفاء بھی عیاشی میں امویوں سے کم نہ تھے۔ خلوت و جلوت دونوں میں شراب کا دور چلتا تھا۔ خلفاء، خلفاء زادے، امراء، قضاۃ، سب شراب پیتے تھے اور صحبتوں میں شاعروں، مغنیوں کا شریک ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ عہد بنی امیہ میں مکہ کے اندر ایک کلب ایسا پایا جاتا تھا جہاں نرد اور شطرنج کا کھیل ہوتا تھا۔ یہ سلسلہ عہد بنی عباسی میں جاری رہا... نو عمر لڑکے (جنھیں وہ غلمان کہتے تھے) نہایت زرق برق لباس میں عورتوں کی طرح آراستہ رہتے تھے... گھوڑ دوڑ کا بھی خلفاء کو بہت شوق تھا اور وہ اس سلسلے میں بازی بھی لگاتے تھے... جواری (کنیزوں) میں اکثر رقص و موسیقی کی ماہر ہوتی تھیں۔ (''عہد عباسیہ کی معاشرت اور صنعت و تجارت'' از نیاز فتح پوری ص ۶ نگار اپریل ۵۵ء)

عباسیہ خاندان کے یہ عباسی خلیفہ عام طور پر اہل بیت رسولؐ کے دشمن رہے۔

امیر حسن صدیقی اپنی تالیف ''خلافت و سلطنت'' صفحہ ۲ میں لکھتے ہیں۔

''متوکل کو شیعی فرقے سے اس درجہ نفرت ہوگئی تھی کہ ۲۳۶ھ۔ ۸۵۰ء میں اس نے اس مقبرہ اور اسکی تمام ملحقہ عمارتیں شہید کر دینے کا حکم صادر کر دیا جو سبط رسول حسین بن علی کی طرف منسوب تھا۔''

''...... یہاں تک کہ اس نے نجف میں حضرت علی اور کربلا میں حسین کے قبور کو مسمار کروایا۔ اسکے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور آخر کار شیعوں نے مجبوراً جان بچانے کے لیے تقیہ رائج کیا۔''

(نگار اپریل ۵۵ء عہد عباسیہ کے مختلف دبستان خیال از نیاز فتح پوری ص ۷)

چناں چہ عہد متوکل کا ایک شاعر کہتا ہے۔

ترجمہ (خدا گواہ ہے کہ اگر آل امیہ نے رسول کو ظلم سے شہید کر ڈالا تو یہ بنی عباس جو اپنے تئیں عم رسول کی اولاد کہتے ہیں کسی طرح بھی ستم آرائی میں اموی خاندان سے پیچھے نہیں رہے۔ دیکھو نا! ان جفا کاروں نے تو قبر تک منہدم کر لی۔ ہاں ہاں! بنی عباس پچھتاتے ہیں۔ دست تاسف ملتے ہیں کہ انھوں نے بنوامیہ کے دوش بدوش حسینؑ کا خون ناحق بہانے میں کیوں حصہ نہ لیا اور اب مظلوم کی لحد مسمار کر کے تلافی مافات کی کوشش کی ہے۔

آل مروان اور سلاطین عباسی کی سیرت کے ان چند نمونوں کے مقابلے میں علی اور اولاد علی کی پاکیزہ زندگی کی نقشے لوگوں کے دلوں پر مرتسم ہونے لگے اور یہی شیعیت کے پھیلنے کا ایک زبردست سبب بن گیا۔ اولاد علی گوشہ نشین ہو کر بھی عوام کو اسلام کی حقیقی تعلیمات کا درس دیتی رہی۔ امام حسینؑ کے بعد حضرت زین العابدینؑ نے اس فرض کو سمجھا اور حسن بصری، طاؤس یمانی، ابن سیرین اور عمرو بن عبید جیسے شاگرد، اسکے بعد امام محمد باقرؑ اور پھر امام جعفرؑ صادق تبلیغ کا کام انجام دیتے رہے۔ ان سے مسلمانوں کو بروقت اور زبردست ہدایت ملتی رہی۔

بنوامیہ اور بنو عباسیہ کی بے پناہ جاہ طلبی، طوفانی تشدد، حد سے گزری ہوئی دنیا پرستی پھر غیر محدود رنگ رلیاں اور اس کے برعکس فرزندان علی کی علم دوستی، عبادت گزاری حق پسندی اور غلط سیاست سے احتراز یہ ایسے صریح اور قوی موثرات تھے جو تشیع کے دامن کو وسیع سے وسیع تر کرتے گئے..... آل محمد قرآن کا مخزن اور دانش و آگاہی کا مخزن و معدن تھے۔ ان ہی خوبیوں کے باعث عوامی

ذہنیت پر نہ صرف ان کی برتری کے نقوش ثبت ہو گئے۔ بلکہ یہ عقیدہ بھی مسلمانوں کے دل نشیں ہوتا گیا کہ رسول مقبول کے سچے وارث یہی ہیں..... پھر یہ عقیدہ اس درجہ مستحکم ہوتا گیا کہ اس جماعت میں شریک ہونے والے دنیا کے ہر خطرے کو ہیچ سمجھنے لگے۔ (اصل واصول شیعہ ص ۴۵)

پروفیسر جی۔ای۔براؤن کے خیال کے مطابق۔"جس کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ خلافت کی ایک رقیب سلطنت شمالی افریقہ اور مصر میں دولت فاطمیہ کے نام سے قائم ہوگئی۔اسی طرح فلسفیانہ اختلاف کی شدت اس جماعت کی بانی ہوئی جو"اخوان الصفا" کے نام سے مشہور ہے...زنگی بغاوت نے جو زیدی تحریک کا نتیجہ تھی۔ثابت کردیا کہ شیعانِ علی کو علم بغاوت بلند کرنے پر آمادہ کر دینا کس قدر آسان ہے۔" (اصل واصول شیعہ صفحہ ۴۵)

شیعیت کا ارتقاء :۔

اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ پہلی صدی اور دوسری صدی ہجری (آٹھویں صدی عیسوی) نے امید وبیم کے باوجود شاہان مصر اوران کی بے راہ روی سے بیزاری کا اظہار کیا اور اہل بیت مصطفوی کی تعریف کی۔اس سلسلے میں ابوفراس کے مقبول عام قصیدے کا یہ شعر فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

الدّین مخترمٌ و الحق متفهمٌ و فیْ آل رسول الله مقتسم

(دین ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔حق نشانہ ستم بن گیا اور آلِ رسول کا حصہ آپس میں بانٹ لیا گیا)

امام جعفر صادق کا زمانہ شیعیت کا عہد زرین کہا جاسکتا ہے کیونکہ اموی اور عباسی طاقتیں تھک چکی تھیں۔اضمحلال پیدا ہوگیا تھا۔علانیہ ظلم وستم کے مواقع جاتے رہے تھے بنابریں دبی ہوئی صداقتیں اور چھپی ہوئی حقیقتیں سورج کی طرح ابھریں اور روشنی کی طرح پھیل گئیں۔خوف وخطر کے باعث جو لوگ تقیہ میں تھے وہ بھی کھل گئے فضا موافق تھی اور راہیں ہموار۔امامِ عالی مقام نے تبلیغ وتلقین میں رات دن ایک کردئے...لوگ جوق در جوق مذہب جعفری قبول کرنے لگے۔قبل ازیں اس کثرت سے اور کھلم کھلا مسلمان شیعیت کی جانب رجوع نہیں ہوئے تھے۔" (اصل و اصول شیعہ ص ۴۴۔۴۵)

یہ وہی زمانہ تھا جب ابن حنبل کو تازیانے لگائے گئے۔ابوحنیفہ کو قید کیا گیا اور امام جعفرؑ صادق

کو زہر دیا گیا۔

سلطنت عباسیہ کے زوال پذیر ہوتے ہوتے مختلف امیروں نے اپنی خودمختار ریاستیں قائم کر لی تھیں اور عباسیوں کے ہاتھوں میں سوائے خطبے کے اور کچھ باقی نہیں رہا تھا۔عراق اور فارس میں آل بویہ، موصل، حلب اور دمشق میں ہمدانی اور افریقہ، المغرب مصر، شام اور حجاز میں فاطمیوں کی حکومت قائم ہوگئیں۔اس طرح اکثر مسلم ریاستیں شیعہ حکمرانوں کے زیر اقتدار آگئیں جس کی وجہ سے ان ریاستوں میں شیعوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔مثلاً عرب ذمصر، المغرب، شام، اور عراق کہ بہت سے شہر، حلب اور طرابلس، اسی دوران ایران میں شیعوں کی تعداد میں بے انتہا اضافہ ہو گیا اور شیعیت اسپین میں بھی داخل ہوگئی۔

اسی دوران مختلف حصوں میں شیعی تحریکیں زور پکڑ گئیں جن کے زیر اثر عباسیوں کے مقابلے پر حریف ریاستیں جگہ جگہ قائم ہوگئیں۔جیسے شمالی افریقہ اور مصر میں دولتِ فاطمیہ، جنوبی عراق میں زیدیوں کی حکومت سلطنتِ آل بویہ وغیرہ جنھوں نے عباسی خلافت کی اہمیت کو قطعاً نظر انداز کردیا۔

اس دور کے مشہور شاعر دعبل نے رشید، امین، مامون اور معتصم کی خوب خوب ہجو کی اور اسکے برعکس امام جعفرِ صادقؑ، امام موسیٰ کاظم اور امام رضاؑ کی شان میں بڑے بڑے قصیدے نظم کیے اور اس جرأت کے ساتھ کہ.......

"چالیس برس سے میں اپنی موت کا سامان لیے پھر رہا ہوں۔مگر ابھی تک کسی نے قاتل بننا منظور نہیں کیا۔" (اصل واصول شیعہ ص ۴۸)

تیسری صدی ہجری (نویں صدی عیسوی) کے آغاز میں شیعیت نے دوبارہ زندگی پائی۔ فلسفہ، سائنس کی بہت کتابیں، یونانی، شامی اور دیگر زبانوں سے عربی میں ترجمہ کی گئیں اور اس طرح عوام نے بڑے اشتیاق سے علوم عقلی کا حصول کرنا شروع کیا۔عالمانہ بحث وتمحیص کا چلن عام ہوا۔ماموں رشید خود معتزلی تھا۔اپنے فکری فلسفہ کی تبلیغ کی خاطر مختلف عقائد کے ماننے والوں کو مذہبی آزادی دی۔شیعی علماء نے اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شیعیت کی تبلیغ شروع کردی۔

چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسویں) میں پھر ایسے حالات پیدا ہو گئے جنھوں نے شیعیت کی توسیع میں مزید تقویت پہنچائی اور آل بویہ نے نہ صرف ایران بلکہ بغداد تک اپنے

اثرات قائم کر لیے۔ اس زمانے میں اکثر عربی ریاستیں شیعہ ہوگئیں۔ بہت سے مشہور شہر مثلاً ہجر ،عمان، ساعدہ وغیرہ شیعہ مذہب کے مرکز بن گئے۔ بصرہ اور کوفہ میں بھی شیعوں کی ایک بڑی تعداد پیدا ہوگئی۔ تریپولی، نبلوس، نیشاپور ہرات وغیرہ شیعہ ریاستیں تھیں۔ احوض اور خلیج فارس کے ساحلی علاقے بھی شیعہ تھے۔ مصر میں فاطمی حکومت بھی شیعہ تھی۔

پانچویں سے نویں صدی ہجری تک (گیارہوں سے پندرہویں صدی عیسوی تک) شیعیت نے کافی رقبے پر اپنا تسلط جما لیا۔ اکثر حکمران شیعہ تھے۔ اسمٰعیلی حکومت کے علاوہ سادات مرشی نے بھی ایک عرصے تک ماژندران میں حکومت کی۔ منگول بادشاہ محمد خدابندہ بھی شیعہ ہوگیا تھا اور اس کے جانشین کئی سال تک ایران میں حکومت کرتے رہے اور شیعیت کی توسیع کرتے رہے۔ اسکے علاوہ فارس، کرمان اور تبریز میں بھی شیعوں کی حکومت رہی۔ لیکن ایوبی طاقت کے ابھرنے اور فاطمی حکومت کے خاتمے سے مصر اور شام کی شیعی آبادی کی مذہبی آزادی جاتی رہی۔ بہت سے شامی شیعہ قتل کردئے گئے۔ مثلاً شہید اول محمد ابن مکی کو ۱۳۸۴ء میں دمشق میں قتل کردیا گیا۔ اس عہد میں شیعہ مذہب حکومت کا مذہب نہ رہا۔

دسویں اور گیارھوں صدی ہجری (سولھویں اور سترویں صدی عیسوی تک) میں اسمٰعیل (جو شیخ صفی الدین اردبیلی کے خاندان سے تھے اور مشہور شیعہ صوفی تھے) نے اردبیل میں بغاوت کی۔ اس طرح انھوں نے ایران کو فتح کیا اور ایک آزاد شیعہ حکومت قائم کی۔ شاہ اسمٰعیل کے بعد ایک اور صوفی بادشاہ نے دوبارہ ایران فتح کیا اور شیعہ مذہب کو سرکاری مذہب بنادیا۔ شاہ عباس صفوی نے اس حکومت کو کافی مستحکم کیا۔

بارھویں سے چودھویں صدی ہجری (اٹھارویں سے بیسویں صدی عیسوی تک) شیعہ مذہب قدرتی طور پر پھیلتا گیا یہاں تک کہ عراق، ایران، افغانستان، آذربائیجان، ترکستان، روس، چین، ڈونیشیا، افریقہ، بلوچستان، پاکستان اور ہندوستان تک شیعیت کی توسیع ہوگئی اور اس وقت شیعہ مذہب ایران اور یمن میں سرکاری مذہب کی حیثیت رکھتا ہے اور عراق کی آبادی کی اکثریت اسی مذہب کی پیرو ہے۔ یوں جہاں کہیں بھی دنیا میں مسلمان پائے جاتے ہیں ان میں کچھ شیعہ ضرور ملیں گے۔

شیعوں کی چند مشہور کتابیں

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ چونکہ شیعوں کو ابتدا ہی سے مخالفین کا سامنا کرنا پڑا لہٰذا اکثر علمائے مذہب شیعہ بحث و مباحثہ کے ذریعے اپنے حریفوں کو جواب دیتے رہے۔ خاص طور پر دوسری اور تیسری صدی ہجری میں جب معتزلیوں کا عروج ہوا اور اکثر علمائے سنت سے بحث و مباحثہ ہوتا رہا۔ لہٰذا شیعہ علم کلام میں ہمیشہ سب سے آگے رہے۔ ویسے بھی دیکھا جائے تو متکلمین اہل سنت میں بھی چاہے وہ اشاعرہ میں سے ہوں یا معتزلہ میں سے، ان کا سلسلہ حضرت علیؑ تک ہی پہنچتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیعوں نے علم کلام، فلسفہ اور علوم عقلیہ حضرت علیؑ سے حاصل کیا۔ حکومت استبداد کے باوجود ہر دور میں شیعہ آئمہ گوشہ نشین رہ کر علم کی تبلیغ کرتے رہے۔ امام جعفر صادق نے تقریباً چھ سو کتابیں لکھیں جن میں سے اکثر استداد زمانہ کی نذر ہوگئیں۔ پھر بھی حضرت علیؑ کی 'نہج البلاغہ' اور امام زین العابدین کی صحیفۂ کاملہ وغیرہ آج بھی شیعوں کے نزدیک حرز جاں کی سی اہمیت رکھتی ہیں۔

نہج البلاغہ :

نہج البلاغہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام کے بعد علیؑ کی ذات تھی جس نے رسول اللہ کی تحریک علمی کو آگے بڑھایا اور دنیا سے جہل اور نادانی کو دور کیا۔ آپ نے اپنے خطبات کے ذریعے علوم و معارف کے متعلق تعقل وتفکر پر زور دیا۔ تحقیق وتنقید کے دروازے کھول دیے۔ آپ ہی نے عقل کی رہبری کے ساتھ شریعت پر عمل پیرا ہونے کی تعلیم دی۔

سید محمود حسین لکھتے ہیں :

''دراصل عربی ادب میں نثر کی تاریخ اسلام کے بعد سے شروع ہوتی ہے جس کا سرنامہ خطیب عرب امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالب کی ذات گرامی ہے جنھوں نہ پہلی مرتبہ اپنے خطبوں میں موضوع کے لحاظ سے بلندی پیدا کی اور انکو اتنا جاندار بنایا کہ علمی دنیا جس قدر ترقی کرتی جائیگی انکی عظمت میں اضافہ ہوتا رہے گا، چنانچہ آپ کے جس قدر خطبے نہج البلاغہ اور اس کے علاوہ دوسری کتابوں میں ملتے ہیں ان سب کو اگر مضامین کے اعتبار سے مرتب کیا جائے تو مختلف علوم و فنون پر الگ الگ کتابیں تیار ہوسکتی ہیں۔'' (تدوین کلام علیؑ بن ابی طالب ضمیمہ کلام علیؑ سے

عربی ادباء کا استفادہ از سید محمود حسین قیصر امروہی)

آپکے کلام کی غیر معمولی اہمیت اور شہرت عام کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ قدیم ادب کے قریب قریب ہر کتاب میں آپ کے امثال وحکم اور خطبوں کے اقتباسات ملتے ہیں ۔'نہج البلاغہ' کے خطبوں میں ایسے بلند افکار ومضامینِ فلسفیانہ علم کی بحثیں ہیں جن کا وجود اس عہد میں نہ تھا۔ خصوصاً عہد نامہ مالک اشتر۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ علیؑ بن ابی طالب سب سے پہلے مفکر اسلام تھے۔

"نہج البلاغہ...اخت القرآن...کی حیثیت سے ادب عربی میں قرآن کے بعد دوسری کتاب ہے جس کا جواب لانے سے ادباء عرب عاجز وقاصر ہیں بلکہ وہ اسکو "معجزات اللسانی" "بدائع العقل البشری" سمجھتے ہیں۔" (تاریخ الادب العربی احمد حسن الزیات ص ۱۰۰ طبع مصر بحوالہ اصلاح جولائی ۶۷ء ص ۱۷)

خلیل الرحمٰن اعظمی اپنے مضمون "فن خطابت اور اہل عرب" میں تحریر فرماتے ہیں۔ "ڈیما ستھینز خطبائے یونان کا امام مانا جاتا ہے لیکن اس کے کل خطبات ۶۱ سے زیادہ نہ تھے۔ مسلمانوں میں حضرت علیؑ مرتضٰی کے خطبات سیکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ جن کو شریف مرتضٰی نے 'نہج البلاغہ میں جمع کردیا ہے۔ ان خطبات میں جہاں ایک طرف فصاحت وبلاغت کی حلاوت پائی جاتی ہے وہیں دوسری طرف ایسا زور بیان اور جوش وخروش پایا جاتا ہے کہ سننے والوں کے دل لرز اٹھتے ہیں۔ پھر زورِ خطابت کا عالم وہاں اور واضح نظر آتا ہے جہاں حضرت علیؑ نے قوم کو جنگ کے لیے ابھارا ہے اور ان کے دلوں میں شجاعت وبہادری کے شریف جذبات برانگیختہ کئے ہیں"۔ (نگار ۳۸ء فنِ خطابت اور اہلِ عرب، از خلیل الرحمان اعظمی ص ۳۱)

حضرت علیؑ کے وہ صدہا خطبات جو نہ صرف خطابت وبلاغت کی جان سمجھے جاتے ہیں بلکہ حمیت دینی، غیرت مذہبی، خدا پرستی اور اسکی رضا جوئی کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ اٹھا کر دیکھئے آپ کو صاف معلوم ہوجائے گا کہ کن وجوہ کی بنا پر انھوں نے مذہب ودین کے مقدس صفحات پر عزت ونام پایا ہے۔ مثال کے طور پر وہ خطبہ جو ابوسفیان کی جانب سے بیعت کی پیش کش کے جواب میں آپ نے بیان فرمایا تھا۔

"یہ (ذمہ داری) تو ایک گندا پانی ہے۔ وہ لقمہ ہے جس کے کھانے والے کو اچھو ہو جاتا ہے"۔ (بحوالہ ماہنامہ فیض الاسلام علی مرتضٰی نمبر ۶۷ء ص ۱۷)

بلاغت وفصاحت کا اندازہ ان جملوں سے لگایئے جو آگے چل کر بیان فرماتے ہیں۔

"اگر اب خلافت کے بارے میں کچھ کہوں تو لوگ کہیں گے "یہ امارت کی حرص ہے" اور اگر خاموش رہوں تو ایسے لوگ بھی ہیں جو کہیں گے "مرنے سے اور جان دینے سے ڈرتا ہے" افسوس! میں چھوٹے بڑے ہر طرح کے مصائب جھیل چکا ہوں۔ خدا کی قسم ابوطالب کا بیٹا موت سے اس سے زیادہ مانوس ہے جتنا طفلِ شیر خوار پستان مادر سے۔ نہیں یہ بات نہیں۔ میرے سکوت کا راز وہ اسرار ہیں کہ جو کچھ میں جانتا ہوں اگر اسے افشا کردوں تو تم یوں لرزنے اور کانپنے لگو گے جس طرح گہرے کنویں میں ڈول کی رسیاں لرزتی اور کانپتی ہیں"۔ (صفحہ ۱۴۶ نہج البلاغہ)

مدیر ماہنامہ فیض الاسلام، علی مرتضٰی نمبر ۱۹۶۷ء تحریر فرماتے ہیں۔

نہج البلاغہ حضرت امیر کے خطبات، ارشادات، مکتوبات، رقعات، ملفوظات، نصائح اور پیش گوئیوں پر مشتمل ہے۔ ابن ابی الحدید (متوفی ۶۵۵ھ) اور مشہور فقیہہ وادیب امام حافظ (متوفی ۱۲۵ھ یا ۲۵۵ھ) سے لے کر علامہ مفتی محمد عبدہ مصری (متوفی ۱۳۲۳ھ) تک سب نے دل کھول کر اس کی بے مثل خوبیوں کا اعتراف کیا ہے۔ یہاں تک کہ عیسائی مورخین جرجی زیدان، خواد افرام، جارج جورواق وغیرہ بھی اس باب میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ (ماہنامہ فیض الاسلام)

نقد وادب کے معاصر فاضل علامہ طٰہٰ حسین مصری نے تمام مدائح ومحاسن کا خلاصہ ایک شاندار فقرے میں ادا کیا ہے۔

("اگر کتاب نہج البلاغہ نہ ہوتی تو ہم فصاحت قرآن کا مرتبہ سمجھنے سے قاصر رہتے" (ماہنامہ فیض الاسلام۔ علی مرتضٰی نمبر ص ۱۰۲)

آج تک اسکی تقریباً دو سو شرحیں لکھی جاچکی ہیں۔ حاجی سید علی نقی ایرانی اپنی شرح نہج البلاغہ مطبوعہ تہران ۱۳۲۹ھ کے جزو پنجم کے دیباچے میں کتاب کی مدح میں لکھتے ہیں۔

"کلام انبیا کا نچوڑ، قرآن کریم کے حقائق واسرار کو بیان کرنے والی، گمراہوں اور گرفتاروں کو نجات دینے والی کتاب ہے۔ خونریزی، تباہی، ظلم، منافقت، خود غرضی اور بدبختی دنیا والوں سے

دور نہیں ہوسکتی۔ دوستی، آسائش، انصاف، اتفاق اور نیک بختی دنیا میں پائیدار نہیں ہوسکتی۔ مگر امیر المومنین کی گفتار و کردار کی پیروی سے جس کا نمونہ سید شریفؒ نے مقدس کتاب نہج البلاغہ میں فراہم کیا ہے اور چونکہ اس میں انسانی زندگی اور آسائش بشر کے متعلق کوئی بات چھوڑی نہیں گئی اسلیے وہ اپنے عامل کی بزرگی اور نیک بختی کی ضامن ہے۔ یہ پختہ کلام علم وعقل کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہے۔ لغو بے ہودہ نہیں ہے۔۔۔ جو شخص خیر و نیکی اور آسائش وخوشی کا طالب ہے اسے چاہیے کہ نہج البلاغہ کو اپنا دستور العمل بنائے''۔ (فارسی سے ترجمہ)

پیام شاہجہاں پوری نہج البلاغہ کے خطبات کے متعلق رقمطراز ہیں۔

''ان خطبات کا زور بیان، نادر تراکیب، حسین اور اثر انگیز تشبیہیں عدیم النظیر استعارے اور تلوار کی سی کاٹ رکھنے والے فقرے صاف صاف بتا دیتے ہیں کہ یہ الفاظ اسی زبان سے نکلے ہیں جو کوثر و تسنیم سے دُھلی ہوئی تھی۔ (علی اور ان کی خلافت از پیام شاہجہاں پوری ص ۲۳۹)

اسی کتاب میں، جو نہج البلاغہ کی شرح ہے، حضرت علیؑ کی علمی ہمہ گیری کے متعلق پیام صاحب فرماتے ہیں۔

''حضرت علیؑ کے خطبات کا جائزہ لیتے وقت ایک قاری کے ذہن پر جو سب سے پہلا تاثر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت علیؑ کے خطبات میں بڑی ہمہ گیری ہے۔ دین اور دنیا کا کوئی موضوع ایسا نہیں ہے جو ان کے خطبات میں نہ ہو۔ ان میں اس عہد کے سیاسی اور تمدنی حالات پر بھی تبصرہ ملتا ہے۔ اس عہد کے عوام وخواص کی فطرت اور طریق کار پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ داخلی اور خارجی امور بھی سامنے آتے ہیں۔ رفقائے کار کی روش کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مخالفین کے طور طریقوں سے بھی نقاب کشائی ہوتی ہے۔ فوجی مہمات کا حال بھی معلوم ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود حضرت علیؑ کے نقطۂ نگاہ اور طریق کار کی بھی وضاحت ہوتی ہے۔ ان کے مشرب اور مسلک کا بھی علم ہوتا ہے۔ ان خطبات میں فلسفہ بھی ہے اور منطق بھی، الٰہیات بھی ہے اور سیاست بھی، نکتہ طرازی بھی ہے اور دقیقہ سنجی بھی۔ گویا حضرت علیؑ کے خطبات کیا ہیں اس دور کی تاریخ ہے اور اسکے ساتھ اسلام کا دستور عمل ہے حضرت علیؑ کی خودنوشت سوانح عمری ہے۔ انکی سیرت وکردار کا مرقع ہے۔ اگر انھیں حسن کے ساتھ ترتیب دے دیا جائے تو حضرت علیؑ کی زندگی کی مستند دستاویز

تیار ہو جائے''۔ (ایضاً ۲۵۷۔۲۵۸)

نہج البلاغہ عربی ادب کی ایک قابل قدر تخلیق تو ہے ہی ساتھ ہی ساتھ شیعوں کی مذہبی کتاب کی حیثیت بھی رکھتی ہے کیونکہ اس میں اسلامی مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ لہٰذا شیعوں کے علماء اور مجتہدین اکثر فقہی مسائل کے سلسلے میں حضرت علیؑ کے خطبات سے استفادہ کرتے ہوئے فتویٰ دیتے ہیں۔ اس طرح یہ شیعی ادب کی ایک مقدس کتاب ہے اور دنیا کی تاریخ میں ادبی و مذہبی شاہکار کی حیثیت سے بھی مانی جاتی ہے۔

صحیفہ کاملہ (زبور آل محمدؐ)

بنی امیہ نے اسلام کے عقائد میں فساد پیدا کرنے اور مسلمانوں کے ''فساد عقائد'' سے فائدہ اٹھا کر اپنے تصور لادینی کو غالب کرنے کے لیے اپنے زرخرید علماء ومحدثین کے ذریعے طرح طرح کی نظریاتی بدعات کو رواج دیا۔۔۔ امام زین العابدین حکومت وقت کی ان نظریاتی تدلیس کاریوں اور سیاسی چالبازوں کو بخوبی سمجھتے تھے۔ چنانچہ آپ نے مسلمانوں کو اس گمراہی کے طوفان سے بچانے کے لیے حسب معمول جہاد باللسان میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ بنی امیہ اپنی حکومت کی استواری کے لیے یہ چاہتے تھے کہ عوام عقائد فاسدہ سے اس طرح ٹکر نہ لیں جس طرح رسولؐ کریم نے تبلیغ حق میں ان کا مقابلہ کیا تھا۔ کیونکہ بنی امیہ کے پاس ان طاقتوں میں سے ایک بھی نہ تھی اس لیے عوام کے عقائد سے ٹکرا کر انھیں اپنی ناکامی کا یقین تھا چنانچہ انھوں نے عوام کی ذہنیت بدلنے کی جدوجہد کے بجائے اسلام کے نظریات بدلنا زیادہ آسان سمجھا اور امام عالی مقام نے کفر وزندقہ کے ان بڑھتے ہوئے طوفانوں کا مقابلہ ان زندۂ جاوید تعلیمات سے کیا جو صحیفہ کی صورت میں ہم تک پہنچی ہیں۔ آپ نے ان دعاؤں میں جابجا خدائے عز وجل کے اوصاف کی تصویریں ایسے موثر الفاظ میں کھینچی ہیں جنھیں پڑھ کر عظمت الوہیت اور جلالت قدس کی اہمیت سے دل لرزنے لگتا ہے۔ امام زین العابدین کی یہ دعائیں سوز عبدیت، گداز بندگی، کرب عبادت، کیفیت ارتقاء اور روح تقدس سے بھرپور ہیں۔

جامعہ ازہر کے فیلسوف اعظم علامہ طنطاوی جوہری اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں:

''اس میں (صحیفہ) بہترین مواعظ مضمر ہیں۔ جن سے شیعہ سنی سبھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

اس قسم کی دعاؤں کو حقیقتاً تعلیمی سبق سمجھنا چاہیے جو موعظۂ ہدایت کی خاطر مسلمانوں کے سامنے پیش
کیے گئے ہیں ورنہ درحقیقت یہ مقدس ذاتیں ہرگز گناہوں سے آلودہ نہ تھیں۔ چونکہ بارگاہِ الٰہی میں
تقرب زیادہ تھا اس لیے انہیں خدا کا خوف بھی سخت تھا اور چونکہ مسلمانوں کے لیے ایک پیشوا کی
حیثیت رکھتے تھے اس لیے انھوں نے مسلمانوں کے لیے مثال پیش کی اور یہی وہ طریقہ ہے جو دنیا
کی ہدایت کے لیے بہترین ہوسکتا ہے۔"

(خدام الزائرین جلد ۱ شمارہ ۲۲ فروری ۱۹۷۵ء صفحہ ۱۰)

صحیفۂ کاملہ کے متعلق نسیم امروہوی یوں رقمطراز ہیں:

"کربلا کے حادثۂ کبریٰ کے بعد جس پیغمبرانہ عزیمت اور روحانی استقامت اور الٰہی
سیاست کے ساتھ امامؑ نے اپنے خانوادۂ مقدس کی (اور بالفاظ دیگر اسلام کی) روحانی تحریکات
اور تعلیمات کو جاری رکھا اس کو دیکھتے ہوئے حیرت ہوتی ہے اور ایک باشعور انسان اس نتیجہ پر پہنچ
جاتا ہے کہ اگر شہادت حسینؑ کے بعد علی بن الحسینؑ یہ سیاسی رویہ نہ اپناتے تو ممکن تھا کہ رسول کے
نواسے کی بے مثال قربانی سے جو روحانی نتائج مرتب ہونے جاتے تھے ان میں تاخیر ہوجاتی۔
لیکن سیّد سجادؑ کی روحانی بصیرت، اخلاقی تنظیم اور روح پرور سیاست نے اس مشن کو زندہ رکھا جس
کی تاسیس و ترویج میں رسول اسلام نے ہر قسم کے مصائب جھیلے تھے اور جس کے احیائے ثانیہ کے
لیے آپ کے پدر بزرگوار نے وادی نینوا میں ہولناک قربانیاں پیش کی تھیں۔ صحیفۂ کاملہ کے مطالعہ
وتفحص سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ امام زین العابدینؑ نے بنی امیہ کے سیاسی اقتدار کے
بدترین دور میں اصلاح امت اور قیام دین کے لیے کیسا نادر نفسیاتی طریقہ تبلیغ و تعلیم اختیار کرلیا
تھا"۔ (خدام الزائرین ۱۵ مئی ۱۹۷۵ء ص ۸)

دعاؤں کے ذریعے تبلیغ دین اور تشہیرِ حق کی ایک وجہ امام زین العابدین کی وہ سیاسی بصیرت
ہے جس نے شہادت حسینؑ کے بعد اسلام کو زندۂ جاوید کردیا۔ انھوں نے جس دور میں یہ کارنمایاں
انجام دیا وہ ایسا دور تھا کہ زمانہ ان کو اس بات کی اجازت نہ دے سکتا تھا وہ اپنے جدّ امجد حضرت علی
ابن علی طالب کی طرح خطبات و تقادیر کے ذریعے دنیا کو علوم و معارف الٰہیات و مادّیات،
اقتصادیات ونفسیات، اخلاق ومعاشرت وغیرہ کی تعلیم دے سکتے۔ نہ ان کے لیے ایسے مواقع فراہم

تھے کہ وہ اپنے بیٹے امام محمدؑ باقر یا پوتے امام جعفر صادقؑ کی طرح شاگردوں کے مجموعے میں علمی
ودینی مسائل حل کرسکتے۔ ایسے نامساعد حالات میں انھوں نے ایک تیسرا طریقہ اختیار کیا جو ایسا
پرامن طریقہ کار تھا جسے روکنے کا دنیا کی کسی طاقت کو کوئی بہانہ نہیں مل سکتا اور وہ یہ تھا کہ تمام دنیا
والوں سے منہ موڑ کر وہ اپنے خالق سے مناجات کرتے اور دعائیں پڑھتے تھے۔ یہ مناجاتیں اور
دعائیں کیا تھیں، الٰہیات کا خزانہ، معارف وحقائق کا گنجینہ، خالق ومخلوق کے باہمی تعلق کا آئینہ تھیں۔
ان دعاؤں کا مجموعہ صحیفۂ کاملہ، صحیفۂ سجادیہ اور زبور آل محمد کے ناموں سے اس وقت تک موجود ہے
۔ اس میں انسانوں کو وہ سب کچھ مل جاتا ہے جو اسے بڑے بڑے خطبوں اور تقریروں میں شاید اتنے
پرتاثیر انداز سے نہ ملتا۔ (بحوالہ رہنمایان اسلام)

غرضیکہ امام زین العابدین نے دعاؤں کی شکل میں ایک ایسا علمی وادبی شاہکار چھوڑا ہے
جس کی مثال عالمی ادب میں نہیں ملتی۔ یہ ایسی دعاؤں کا مجموعہ ہے جس میں خالق کائنات کے
وجود اور خالق ومخلوق کے باہمی تعلقات کا ذکر، حقوق الناس کا ذکر، اعمال انسانی کے حساب و
کتاب کا تذکرہ، اچھے اور برے اعمال کے اثرات، شیطانی وسوسوں کی پیدائش، ان سے بچنے کے
طریقے، جنت وجہنم کے تذکرے، سبھی موضوعات چاہے وہ ملی ہوں، معاشیاتی ہوں، سیاسی ہوں
یا اخلاقی موجود ہیں۔

(پیام عمل لاہور جون ۱۹۶۵ء ص ۲۶ ماہنامہ زد کراچی جنوری ۱۹۵۸ء ص ۴۔)

اس لیے یہ دعائیں مسلمانوں کے لیے مشعل ہدایت کا کام کرتی ہیں۔ خاص طور پر شیعہ
حضرات ان سے خوب استفادہ کرتے ہیں اور ان دعاؤں کے ورد کو باعث نجات و برکت سمجھتے
ہیں۔ شیعوں کے نزدیک یہ کتاب محض روحانی اہمیت ہی کی حامل نہیں بلکہ ایک تاریخی، تبلیغی اور
تعلیمی اہمیت بھی رکھتی ہے۔ اردو شعراء نے ان دونوں کتابوں یعنی نہج البلاغہ اور صحیفہ کاملہ سے
تعلیمات وخطبات کا استفادہ کرتے ہوئے شاعری میں شیعی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ لہٰذا یہاں
انھیں دو کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے ورنہ شیعی ادب ومذہب کی بے شمار کتابیں ہیں جن کا جائزہ ہر
زاویے سے تشریح طلب ہے۔

باب دوم

شیعوں کے بنیادی عقائد

یہ حقیقت ہے کہ نسلِ انسانی کے مختلف النوع مسائل کا تعلق دو چیزوں سے ہوتا ہے۔ایک عقل اور دوسرے جسم۔یہی وجہ ہے کہ مذہب شیعہ کی بنیاد دو شاخوں پر قائم ہے۔ایک علم یعنی جن مسائل کا تعلق عقل سے ہوتا ہے۔شیعہ علم سے تعلق رکھنے والے مسائل کو ''اصول دین'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔اور عمل سے تعلق رکھنے والے مسائل کو ''فروع دین'' کی حیثیت سے مانتے ہیں۔

شیعہ اثنا عشری کے عقائد کے مطابق اصول دین پانچ ہیں۔

(۱) توحید (۲) نبوت (۳) امامت (۴) عدل (۵) معاد

جہاں تک توحید کا تعلق ہے۔کوئی مسلمان اس عقیدے کے بغیر مسلمان نہیں ہوسکتا۔کیونکہ ''لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ'' ہی وہ اعتراف ہے جو ایک مسلمان کو مسلمان بناتا ہے۔یہ خدا کی وحدانیت کا روحانی اقرار ہے۔اس وحدانیت میں کوئی اس کا شریک نہ تھا۔نہ ہوگا۔شیعیانِ امامیہ کے اعتقاد کے مطابق بھی ہر ہوش مند پر یہ واجب ہو جاتا ہے کہ وہ عرفانِ ربوبیت حاصل کرے۔اور اس بات پر یقین رکھے کہ خلق و رزق، موت و حیات اور ایجاد و اعدام خدا ہی کی ذات سے متعلق ہے۔

خدا کی توحید کا اقرار چار پہلوؤں سے کیا جاسکتا ہے۔

(۱) توحید ذات (۲) توحید صفات (۳) توحید افعال (۴) توحید عبادت

توحید ذات کا اعلان قرآن شریف میں یوں نظر آتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِی فِی السَّمَاءِ وَاِلٰه وفِی الارض اِلٰه وَهُوَ الحکیم العلیم وَتَبَارَكَ الَّذِی لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ والارض وَمَا بَیْنَهُمَا وَعِنده علم الساعته وَاِلَیْهِ ترجعون ٥

(وہی ہے جس کی عبادت زمین اور آسمان میں کی گئی۔اور وہ حکیم اور تمام کاموں کا درست کرنے والا اور دانا ہے۔پاک اور بہت برکت والا ہے۔اور زمین اور تمام آسمان اور زمین اور آسمان کے درمیان جو کچھ ہے۔سب پر اسی کی بادشاہی ہے۔اور علم و دانائی اس کے پاس ہے۔اور قیامت میں تم اسی کے پاس واپس جاؤ گے۔)

توحید صفات کا اندازہ اس آیت سے ہوتا ہے۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْم ط

(وہی اوّل و آخر اور پوشیدہ و ظاہر ہے اور ہر چیز سے دانا ہے)

یعنی خدا میں کچھ صفتیں پائی جاتی ہیں اور کچھ صفتیں ایسی ہیں جن سے وہ بری ہے۔شیعہ ان صفتوں کو جو خدا میں پائی جاتی ہیں، صفات ثبوتیہ کہتے ہیں۔وہ آٹھ ہیں۔

(۱) قدیم:- یعنی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اور اس کا عدم و فنا نہیں ہے۔جیسا کہ خود قرآن میں ارشاد فرماتا ہے۔

كُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ ط وَّیَبْقٰی وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَام ط

(۲) دوسرے قادر:- یعنی ہر کام کے کرنے اور نہ کرنے پر قدرت رکھتا ہے اور اختیار حاصل ہے۔چاہے کرے چاہے نہ کرے۔

(۳) عالم:- یعنی ہر ظاہر و باطن چیز کا جاننے والا ہے۔اور کوئی شے اس سے پوشیدہ اور مخفی نہیں ہے۔اس کا علم ہر شئی کے ہونے سے قبل اور ہونے کے بعد برابر ہے۔یعنی اس کے علم میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔

(۴) حی:- یعنی زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔موت و فنا اس کے لیے نہیں ہے۔

(۵) مرید:- یعنی اس کا ہر کام اس کے ارادہ وعلم وحکم ومصلحت کے موافق ہوتا ہے۔ اور جس چیز میں مصلحت وحکمت نہیں سمجھتا اسے بااختیار خود ترک کرتا ہے۔

(۶) مدرک:- یعنی خداوند عالم آنکھ کے بغیر دیکھتا ہے۔ کان کے بغیر سُنتا ہے۔ ناک کے بغیر سونگھتا ہے۔ اور زبان کے بغیر بات کو پیدا کرتا ہے۔

(۷) متکلم:- یعنی کلام پیدا کرنے والا ہے۔ یعنی حق تعالیٰ کلام کو جس چیز میں چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ جس طرح حضرت موسیٰ کے لیے شجرہ طور میں کلام پیدا کیا۔

(۸) صادق:- یعنی اس کا کلام سچا ہے اور اس نے قرآن شریف میں جو وعدے کئے ہیں انھیں ضرور وفا فرمائے گا۔

توحید افعال یعنی وہ صفات خدا جن سے بری ہے۔ وہ آٹھ ہیں۔ اور انھیں صفات سلبیہ کہتے ہیں۔

(۱) شریک:- یعنی خداوند عالم اپنا شریک نہیں رکھتا۔ اور سوا خدائے یکتا کے اور کوئی دوسرا خدا نہیں ہے۔ جیسا کہ خود فرمایا ہے۔ قُلْ هُوَ اللهُ احد۔

(۲) ترکیب:- یعنی خدا کسی چیز سے ترکیب پا کر نہیں بنا۔ جیسا کہ انسان مختلف عناصر سے ترکیب دیا ہوا ہے۔

(۳) خدا مجسم نہیں ہے۔ اس کا کوئی جسم اور صورت نہیں ہے۔ اور نہ کسی شئے سے مشابہ یا مثل ہے۔

(۴) لامکاں:- خدا کسی مکان کا محتاج نہیں ہے۔ وہ کسی خاص جگہ یا خاص مقام میں نہیں ہے بلکہ ہر جگہ اور ہر مقام پر اپنی قدرت کاملہ سے حاضر اور موجود ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا ہے۔

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْد ط

(۵) حلول:- حلول ایک دوسرے جسم میں سما جانے کو کہتے ہیں۔ جیسے انسان کے بدن میں روح داخل ہوتی ہے۔ ذات باری تعالیٰ کے لیے حلول روا نہیں۔ یعنی وہ کسی جسم میں نہیں سماتا۔ اور نہ ہی کسی چیز سے متحد ہوتا ہے۔

(۶) خدا محلِ حوادث نہیں۔ یعنی اس کی ذات میں تغیر وتبدل نہیں ہوتا۔ وہ جس طرح سے

ہمیشہ سے تھا اسی طرح ہمیشہ رہے گا۔

(۷) غیر مرئی:- یعنی اس کو دنیا و آخرت میں کوئی دیکھ نہیں سکتا۔ جیسا کہ خود فرماتا ہے لن ترانی اَبوا کیونکہ وہ جسم وجسمانیت سے بری ہے۔

(۸) خدا کے صفات زائد برذات نہیں ہیں۔ ایسا نہیں کہ اس کی ذات اور ہو، اور صفات اور مختصر یہ کہ توحید کا تیسرا پہلو توحید افعال ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَا مِنْ تَشَاء وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاء وَتعِزّ مَنْ تَشَاءَ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاء وَبِيَدِكَ الْخَيرِ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِير ط

(کہو اے خدائے صاحب ملک تو ملک کو جیسا چاہتا ہے دیتا ہے۔ اور اس کو جیسا چاہتا ہے۔ واپس لے لیتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے عزیز رکھتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔ نیکی تیرے ہی ہاتھ میں ہے اور تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔)

توحید کا چوتھا پہلو توحید عبادت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اِنَّ اللهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوه هٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيْم ط

(البتہ خدا ہی میرا اور تمھارا پروردگار ہے۔ پس اسی کی عبادت کرو۔ کہ یہی راہِ مستقیم ہے)

(تحفۃ العوام ص۹ تا ۱۲ تصحیح الاعمال ص۶۔ ۱۵ اسلام وعقائد شیعہ ص۶۱)

نبوت:- اسی طرح ہر شیعہ پر واجب ہے کہ توحید کے ساتھ ساتھ نبوت کا بھی اقرار کرلے۔ اور اعتقاد رکھے کہ حضرت آدمؑ سے لے کر حضورِ رسالت مآب تک۔ جتنے انبیاء خلق پر مبعوث ہوئے ہیں وہ سب برحق اور خدا کی جانب سے ہیں۔ اور جو کتابیں ان پر نازل ہوئیں۔ وہ سب خدا کی طرف سے ہیں۔ اور جو معجزات ان کے ہاتھوں سے واقع ہوئے ہیں۔ وہ سب صحیح اور درست ہیں اور وہ سب انبیاء معصوم ہیں۔ یعنی اوّل عمر سے آخر عمر تک گناہانِ صغیرہ وکبیرہ سے عمداً وسہواً پاک ہیں اور تمام عیوب مثلِ کینہ وبغض وحسد وکج خلقی وغیرہ سب سے بری ہیں۔ اور جتنی چیزیں سبب کمال وخوبی ہیں۔ سب سے آراستہ ہیں اور ہر قسم کے جسمانی عیب سے مبرا ہیں۔ مثلاً جذام، کوڑھ، اندھا، گونگا، بہرا ہونا۔

شیعوں کا اعتقاد یہ ہے کہ انبیاء وپیغمبر ایک لاکھ چوبیس ہزار ہیں اور ان کی نبوت کا اقرار

ضروری دینِ اسلام ہے۔ پس جو شخص ایک نبی کا بھی انکار کرے گا۔ یا ان میں سے کسی ایک کو بھی حقیر سمجھے گا تو کافر ہو جائے گا۔ اور ان سے زیادہ کسی ایک کو بھی سمجھے گا تو بھی خارج از اسلام ہوگا۔ آخری پیغمبر حضرت محمدؐ ہیں۔ جن پر دینِ مکمل ہوا۔ ان کی نبوت و شریعت قیامت تک باقی رہے گی۔ اور وہ کتاب جو اس وقت مسلمانوں کے ہاتھوں میں قرآن کے نام سے رہتی ہے۔ یہ وہی ہدایت نامہ ہے جسے پروردگار عالم نے معجزہ بنا کر نازل کیا اور اس کے ذریعہ احکام دین کی تعلیم دی۔ نہ اس میں کوئی کمی ہوئی نہ زیادتی۔ شیعہ تحریف کے مخالف ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جو لوگ تحریف کے قائل ہیں۔ وہ خطا پر ہیں۔ کیونکہ اس اعتقاد سے "نصِ کتاب" اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُون ۔ کی تردید ہوتی ہے۔ شیعہ امامیہ کا یہ عقیدۂ راسخہ ہے کہ حضرت محمدؐ مصطفٰے کے بعد جو شخص بھی نبوت یا نزولِ وحی کا دعویٰ کرے وہ کافر ہے اور واجب القتل ہے۔

(اصل و اصول شیعہ ص ۶۳)

معاد :- توحید اور نبوت کے علاوہ مسلمانوں کی طرح شیعہ بھی معاد کے قائل ہیں یعنی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خالقِ باری سزا و جزا اور حساب و کتاب کے لیے قیامت کے دن تمام خلق کو زندہ محشور کرے گا۔

اس سے ظاہر ہے کہ اصول کے مسئلے میں شیعہ ان تینوں اصول کو حق مانتے ہیں جنھیں حضرات اہلِ سنت اصولِ دین یا اصولِ اسلام کہتے ہیں۔ یعنی توحید نبوت اور معاد۔ ان پر شیعہ دو اصول کا اضافہ مانتے ہیں۔ یعنی توحید کے بعد عدل اور نبوت کے بعد امامت۔ اسی دو اصول سے شیعیت کی تشخیص ہوتی ہے۔

عدل :- شیعوں کے نزدیک عدل سے مراد یہ ہے کہ مومن یہ اعتقاد رکھے کہ خدا عادل ہے۔ کوئی برا کام نہیں کرتا۔ اور نہ کوئی امرِ واجب و بہتر ترک کرتا ہے۔ بلکہ اپنے بندوں کو بھی حکم کرتا ہے کہ عدل و انصاف کریں۔ اور کسی پر ظلم و ستم نہ کریں۔ یعنی خداوندِ عالم کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ اور نہ اس سے کوئی ایسا فعل سرزد ہوتا ہے۔ جسے عقلِ سلیم بُرا سمجھے۔ اسی اعتقاد کا نام عدل ہے۔ خدا خود قرآن میں فرماتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْد (بے شک اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا)

ایک اور جگہ اور ارشاد ہوا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَظْلِمُ النَّاسَ شَیْئًا وَّ لٰکِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ۔

(بے شک خدا انسان پر ذرا بھی ظلم نہیں کرتا۔ بلکہ انسان خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔)

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ط (آلِ عمران پ ۳ آیت ۱۸)

(خدا اور ملائکہ اور تمام صاحبانِ علم گواہ ہیں۔ کہ سوا اللہ کے کوئی خدا نہیں ہے۔ اور وہ صفت عدل کے ساتھ قائم و دائم ہے۔

قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ قف ۔ (الاعراف پ ۸ آیت ۲۹)

(کہہ دو کہ میرے پروردگار نے مجھ کو عدل و انصاف کا حکم دیا ہے۔)

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (نحل پ ۱۴)

(بے شک اللہ تم کو عدل و انصاف، نیکی و احسان کا حکم دیتا ہے۔)

وَنَضَعُ الْمَوَازِیْنَ الْقِسْطَ لِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَیْئًا وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَیْنَا بِهَا ط وَكَفٰی بِنَا حٰسِبِیْنَ ہ (انبیاء پ ۱۷ آیت ۴۷)

(ہم قیامت کے دن عدل کی ترازوئیں کھڑی کر دیں گے۔ لہٰذا کسی شخص پر کچھ بھی ظلم نہ ہوگا اور اگر رائی کے دانہ کے برابر بھی کسی کا عمل ہوگا تو ہم اس کو سامنے لے آئیں گے اور ہم سے بڑھ کر کون حساب کرنے والا ہو سکتا ہے۔)

اس قسم کی تقریباً چالیس آیتوں کا حوالہ مولانا سید علی نقی صاحب نے اپنی کتاب "اصول دین اور قرآن" میں دیا ہے۔ جن سے عدلِ خداوندی کا ثبوت ملتا ہے۔ (ص ۵۲-۶۰)

لہٰذا شیعی نقطۂ نظر سے ایک مسلمان حقیقی طور پر اسی وقت مسلمان اور مومن ہو سکتا ہے جب وہ عدلِ خداوندی پر ایمان رکھے۔ اسی لیے مولوی نقی فرماتے ہیں۔

"عدل کا اعتقاد رکھنے کے ساتھ جس طرح ایک مومنِ کامل، باری تعالیٰ سے ظلم کی نفی کرتا ہے۔ اسی طرح ظلم کے جتنے فروع اور متعلقات ہیں۔ ان کی بھی ذاتِ احدیت سے نفی کر دیتا ہے۔ ظلم اور بے انصافی کو خدا پر جائز سمجھنے والے اس کے ساتھ بہت سے لوازم کے پابند ہونے پر

مجبور ہوتے ہیں"۔ (ص ۵۱-۵۰)

شیعوں کا عقیدہ ہے کہ عدل خدائے تعالیٰ کی صفتوں میں سے ایک صفت ہے۔ جس کا وجود جامعیت صفات کمال وجمال الٰہیہ کے لیے ضروری اور شانِ توحید کے واسطے لازم سمجھا جاتا ہے۔ امامیہ نظریئے کے مطابق حسن وقبیح کا فیصلہ عقل کے ہاتھ ہے شریعت کو کوئی دخل نہیں۔ البتہ شرعی احکام سے تاکید اور ہدایت ہوتی ہے۔ عقل بعض افعال کو اچھا سمجھتی ہے۔ اور بعض کو برا۔ اور اسی عقل کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ فعل قبیح ذات باری کے لیے محال ہے۔ کیونکہ وہ کلیم ہے۔ اور فعلِ قبیح منافی حکمت۔ فرمانبردار کو مبتلائے عذاب کرنا ظلم ہے۔ اور ظلم فعل قبیح ہے جو پروردگار سے ہرگز واقع نہیں ہوسکتا۔ (اصل اصول شیعہ ص ۴۷)

شیعوں کی دلیل ہے کہ عدل کے لیے ظلم سے برأت لازمی ہے۔ کیونکہ ظلم عقل کی راہ سے بری چیز ہے۔ اور برا کام کرنے کے لیے کئی سبب ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ جو برا کام ہے۔ اسی برائی سے ناواقف ہو۔ دوسرے یہ کہ اس کام کو بُرا جانتا ہو مگر اس کے ترک کرنے پر اختیار نہ رکھتا ہو۔ تیسرے یہ کہ برائی کو جانتا ہو اور اس کے نہ کرنے پر بھی اختیار رکھتا ہو۔ مگر احتیاج کے سبب سے برا کام اختیار کرے چوتھے یہ کہ احتیاج بھی نہ رکھتا ہو اور بے کسی سبب کے برا کام کرے۔ اور خدا پر جاہل ہونا اور عاجز ہونا اور فعلِ عبث کرنا جائز نہیں ہے۔ اسلیے کہ یہ صفات بد ہیں۔ اور جس میں صفات بد ہیں یا پائی جائیں وہ ناقص ہوگا۔ اور جو ناقص ہو خدا نہیں ہوسکتا۔ پس اس دلیل سے کسی طرح پر ظلم کرنا جائز نہیں ہوسکتا۔ (صحیح الاعمال ص ۶)

مگر اشاعرہ، اہلِ سنت کہتے ہیں کہ خدا سے فعلِ عبث ہوسکتا ہے اور یہیں سے جبر واختیار کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے جس پر آئندہ صفحات میں بحث کی جائے گی۔

شیعہ عدلِ خداوندی کو دیگر دلائل سے بھی ثابت کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ (۱) ظلم قبیح ہے۔ لہٰذا خدا کے لیے جائز نہیں۔ یعنی خداوند عالم کوئی ایسی بات نہیں کرتا جو خلاف انصاف ہو۔

(۲) ظلم کسی ضرورت واحتیاج کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اور خدا محتاج نہیں۔

(۳) خداوند عالم نے دوسروں کو ظلم کی ممانعت فرمائی ہے۔ تو خود بھلا کیسے ظلم کرے گا؟

(۴) تمام کتابیں جو خدا نے نازل فرمائی ہیں۔ ان میں اس نے اپنے عدل کی خبر دی ہے۔

(۵) نظامِ خلقت عالم خود ہی عدلِ خداوندی کو نمایاں کرتا ہے۔

(۶) اگر خدا کے لیے ظلم کا احتمال بھی ہو تو اس کی سچائی کے متعلق اعتماد جاتا رہے گا۔ (عملیہ ص ۱۷)

مختصر یہ کہ شیعی عقائد کے مطابق عدل کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کوئی غلط یا بیکار کام نہیں کرتا۔ اس ہر فعل درست ہی ہوتا ہے۔ اور ہر فعل مطابق عدل ہے۔ جو کر چکا وہ عدل تھا۔ جو کرے گا وہ عدل ہوگا۔ کسی کو دولت دے تو عدل کسی کو غربت دے تو عدل۔ کسی کو صحت دے تو عدل کسی کو مرض دے تو عدل۔ اس کا کوئی کا خلافِ عدل ہوا۔ نہ آئندہ ہوگا۔ وہ وہی کام کرتا ہے۔ جس میں کوئی رجحان اور اچھائی ہو۔ کیونکہ ایسا نہ کرنا اس کے کمال علم وقدرت کے خلاف ہے۔ (تاریخ وعقائد شیعہ امامیہ ص ۱۸۹-۹۵)

مولانا فیاض حسین مبارک پوری عدل کی مزید توضیح یوں کرتے ہیں:

"عدل مساوات کو نہیں کہتے۔ عدل اس کام کے کرنے کو کہتے ہیں جس میں کوئی اچھائی اور رجحان ہو۔ اور خدا سے ایسے فعل کا برابر صادر ہونا جبر نہیں ہے۔ جس طرح کسی مومن کامل کا کمالِ ایمان کی وجہ سے برابر فرائض وواجبات کو ادا کرتے رہنا جبر نہیں ہے۔ مذہب وشریعت کی بنیاد خدا کی عدالت پر قائم ہے۔ کیونکہ اگر خدا کو عادل نہ مانا جائے تو نہ رسولؐ و نبی کی آمد کی خوبی پر یقین ہوگا۔ نہ کفر وشرک کے سبب جہنم میں داخل ہونے پر۔ اور ظاہر ہے کہ ایسا ہے نہیں۔ خدا نے ہر نبی ورسول کو بھیجا۔ اسلیے کہ اس میں خوبی تھی۔ اور دین وشریعت کی پابندی کا حکم دیا۔ اس لیے کہ اس میں اچھائی تھی۔ اسی طرح فرمانبرداروں کے لیے جنت کو خلق کیا۔ اور نافرمانوں کے لیے جہنم کو۔ اس لیے کہ اس میں رجحان تھا"۔

اسی طرح خدا نے بندوں کو جو تکلیف دی ہے۔ وہ ان کی طاقت سے کم ہے بندے پانچ وقت سے زیادہ نماز پڑھ سکتے ہیں سال میں ایک مہینہ سے زیادہ روزے رکھ سکتے ہیں عمر میں ایک دفعہ سے زیادہ حج کر سکتے ہیں۔ مگر خدا نے اس سے زیادہ کا حکم نہیں دیا۔ اسی طرح خدا نے بندوں

کو ان کے کاموں میں نہ اتنا مجبور کیا ہے کہ وہ ضرور ہی اس کام کو کریں۔ اور نہ اتنا آزاد کیا ہے کہ خدا اگر چاہے تو ان کو اس کام سے روک ہی نہ سکے۔ بلکہ بیچ کا راستہ مقرر کیا ہے۔ تاکہ نہ جبر رہے نہ تفویض رہے۔ اور یہی اسکی عدالت کی دلیل ہے"۔ (تاریخ وعقائد شیعہ ص ۱۹۱۔۹۰)

لیکن سُنّی اس باب میں بالکل شیعوں کے برخلاف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا کے لیے عادل ہونا ضروری نہیں۔ اس نے بندوں کو ان کے افعال میں کچھ اختیار نہیں دیا کوئی خیر وشر وہ خود نہیں کر سکتے۔ سب کچھ خدا ہی ان کے ہاتھوں سے کراتا ہے۔ پھر اس پر جو وہ جزا وسزا دے گا۔ اس میں کوئی ظلم نہیں اور ظلم ہو بھی تو خدا کے لیے کوئی عیب نہیں۔ جو چاہے سو کرے۔ اور جو کرے وہی حق و درست ہے۔ (الایمان ملقب بہ مظہر ضمیر یہ از مولوی سید مظہر حسن ص ۱۷)

شیعوں کا کہنا ہے کہ کسی فلسفہ یا مذہب نے عدل پر اس طرح اور ان معنوں میں زور نہیں دیا۔ جس طرح اور جن معنوں میں اسلام نے اس کی تعلیم دی ہے۔ عام طور پر دنیا کی عظیم ہستیوں نے یہ پیغام دیا کہ انسان کو چاہئے کہ آپس میں اپنے تعلقات میں عدل سے کام لے۔ لیکن اسلام نے اس کے علاوہ انسان کی گفتگو میں اور اس کے فضائل اور عادات واطوار میں بھی عدل کو بہت اہمیت دی ہے۔ ظلم سے نفرت اور عدل کی خواہش انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ لیکن جس طرح اسلام نے ظلم سے اجتناب کرنے کی ہدایت اور عدل کی اہمیت کو ظاہر کیا ہے اس طرح کسی فرقے یا مذہب میں نہیں ہے اسلام کا ہر حکم، ہر ہدایت، ہر امر اور ہر نہی عدل پر مبنی ہے۔ یہاں تک کہ جو قوانین واحکام شرع اسلام میں مقرر کئے گئے ہیں۔ مثلاً تقیہ، قوانین قرض وسود، نکاح، متعہ، طلاق حقوق وفرائض زوجین، قانون وراثت وغیرہ ان سب قوانین کا اصلی جز وعدل ہے۔ چونکہ دنیا میں ظلم عام ہے۔ لہٰذا اسلام عدل کی خاص طور پر تعلیم دیتا ہے۔

(فلسفہ اسلام حصہ اول ص ۳۶۳۔۳۶۴ از آغا محمد سلطان محمد دہلوی)

امامت :-

عدل کے علاوہ امامت وہ دوسرا اصول دین ہے۔ جس میں سنّی اور شیعوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اور یہی وہ امتیازی مسئلہ ہے جس کی بناء پر شیعہ فرقہ عام فرقوں سے الگ تھلگ نظر آتا

ہے۔ اور یہی وہ اساسی وبنیادی فرق ہے۔ جو اس کتب خیال کو عام مکاتب سے علیحدہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ جو اختلافات ہیں ان کی حیثیت اصولی نہیں فروعی ہے۔

حالانکہ مسئلہ امامت کی اہمیت اور اسکے وجود سے حضرات اہلِ سُنّت بھی انکار نہیں فرماتے۔ لیکن بحث اس میں ہے کہ امام منصوص باللہ ہو یا امت خود منتخب کرلے۔ شیعہ یہ کہتے ہیں کہ جس طرح انبیاء اللہ کی طرف سے آئے۔ ائمہ کو بھی اللہ ہی کی طرف سے ہونا چاہئے۔ حضرات اہلِ سنت یہ کہتے ہیں کہ یہ حق مسلمانوں کے اہلِ حل وعقد کے مشورے پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

امام کے لغوی معنی پیشوا کے ہیں۔ اہلِ سنت کی دلیل ہے کہ شرعی اصطلاح میں بھی یہ لفظ اپنے عام معنی ہی میں استعمال ہوا ہے۔ اہلِ سنت کے یہاں امامت کے لیے کوئی خصوصیت نہیں۔ اور نہ مسئلہ امامت ضروریات دین سے ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ نہ قرآن امامت کے بارے میں کچھ کہتا ہے نہ احادیثِ رسول سے کوئی خاص بات مستنبط ہوتی ہے۔

(نگار ستمبر ۳۷ء ص ۲۱۔۱۱)

شرح مواقف (مطبع نول کشور لکھنو) میں صفحہ ۳۲۷ پر نظریۂ امامت کی تشریح یوں کی گئی ہے:

"تیرا مقصد (بحث امامت کا) ان طریقوں کے بیان میں جن سے امامت ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ امامت کی لیاقت اور شرائطِ امامت کے اجتماع سے کوئی امام نہیں ہو جائے گا۔ بلکہ اس کے لیے کچھ اور بھی ضروری ہے۔ اس کا ایک طریقہ رسول اور سابق امام کی نص ہے۔ یہ طریقہ باجماع درست ہے۔ اور دوسری صورت اہل حل وعقد کا بیعت کرنا۔ یہ اہلِ سنت والجماعت اور معتزلہ اور فرقۂ زیدیہ کی جماعت صالحیہ کا مسلک ہے۔ لیکن شیعوں کی اکثریت اس کی مخالف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سوائے نص کے کوئی طریقہ نہیں"۔

(نگار جنوری ۳۸ء ص ۱۴۵)

صواعق محرقہ ابن حجر مکی مطبوعہ مصر صفحہ ۵ پر تحریر ہے:

"امامت ثابت ہوتی ہے۔ یا تو امام وقت کے نص سے کسی قابل شخص کو اپنے بعد خلیفہ مقرر کرنے کے ساتھ یا اہل حل وعقد کے مقرر کرنے سے کسی لائق شخص

کواور یا دوسرے طریقوں سے جو اپنے محل پر بیان ہوئے ہیں"۔

(نگار جنوری ۳۸ء ص ۱۴۵)

معلم اصول الدین امام فخر الدین رازی جو مصر میں محصل امام رازی کے حاشیہ پر طبع ہوئی ہے اس میں صفحہ ۱۵۸ پر ہے:

"تمام امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ امامت نص کے ذریعے سے ثابت ہوتی ہے لیکن عام افراد کے انتخاب کے ذریعہ سے بھی ہوسکتی ہے یا نہیں۔ اہل سنت اور معتزلہ قائل ہیں کہ ہوسکتی ہے اور فرقۂ اثنا عشریہ قائل ہے کہ بغیر نص کے نہیں ہوسکتی۔" (نگار جنوری ۳۸ء ص ۱۴۵)

ابطال الباطل میں لکھا ہے:

"امامت رسول اور گذشتہ امام کے نص سے اجماعاً ثابت ہوتی ہے۔ اور اہل حل وعقد کی بیعت سے بھی اہل سنت و جماعت اور معتزلہ اور زیدیہ صالحیہ کے نزدیک ثابت ہوجاتی ہے۔ لیکن فرقۂ شیعۂ امامیہ اس کے مخالف ہے۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ سوائے نص کے کوئی طریقہ نہیں ہے۔

(نگار جنوری ۳۸ء ص ۱۴۵)

غرضیکہ اہل علم نے لفظ امام کی مختلف انداز میں تعریف کی ہے۔ عوام کی اکثریت کے نزدیک امام اس کو کہتے ہیں جو کسی مسجد میں نماز جماعت پڑھائے۔ اور بس۔ بعض کے نزدیک امام وہ ہے جو کسی بڑی مسجد کا پیش نماز ہو۔ اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مسلمان بادشاہ جو مذہب اثنا عشری نہ رکھتا ہو، امام ہے۔ اور بعض کے نزدیک وہ شخص امام ہے۔ جس کے علم فقہ وتفسیر میں کوئی تصنیف ہو۔ اور بعض کے نزدیک امام وہ ہے جس کی حکومت نص یا شوریٰ یا اجماع یا غلبہ سے ثابت اور مسلم ہوجائے۔ (البرہان مرتبہ سید محمد سبطین سرسوی ص ۳ ماہ جمادی الاول ۱۳۳۳ھ)

چنانچہ علامہ سید محمد حسین طباطبائی رقم فرماتے ہیں:

"امام وپیشوا بکسی گفتہ میشود کہ پیش جماعتی افتادہ رہبری ایشانی را در یک میر اجتماعی یا مراد سیاسی یا مسلک علمی یا دینی بعہدہ گیرد والبتہ بواسطۂ ارتباطی کہ با

زمینۂ خود دارد، بہ روسعت وضیق تابع زمینۂ خود خواہد بود"۔

(شیعہ در اسلام ص ۱۰۹)

دراصل امامت کے سلسلے میں امت میں بعد وفات پیغمبرؐ شروع ہی سے اختلاف ہوا سوال یہ تھا کہ خداوند عالم پر امام کا مقرر کرنا واجب ہے۔ بعض قائل ہوئے کہ واجب ہے۔ بعض نے کہا کہ نہیں واجب ہے۔ پھر جو لوگ واجب ہونے کے قائل ہوئے ان میں بھی دو جماعتیں ہوگئیں۔ ایک کا نظریہ ہے کہ یہ کلام عقلاً اللہ پر واجب ہے۔ دوسری جماعت کہتی ہے کہ بحکم عقل امت پر واجب ہے۔ اشاعرہ اور محدثین اور فرقۂ معتزلہ میں ابوعلی جبائی اور ان کے فرزند اس بات کے قائل ہوئے کہ امام کا مقرر کرنا بہ نص شرعی امت پر واجب ہے۔ باقی معتزلہ کا مسلک یہ ہے کہ عقلاً امت پر واجب ہے۔ امامیہ کا مسلک یہ ہے کہ بہ حکم عقل اللہ پر امام کا مقرر کرنا واجب ہے۔ شیعۂ امام کا اس بات پر اجماع واتفاق ہے کہ امام کا ہونا شرعاً بھی واجب ہے۔ اور عقلاً بھی۔ اور اس کے تقرر کا اختیار صرف اللہ کو حاصل ہے اس لیے کہ امام بھی ایک طرح کا لطف خداوندی ہے۔ جو بندوں کو طاقت سے قریب کرتا ہے اور معاصی ومنکرات سے روکتا ہے۔

(اصلاح نومبر ۱۹۷۲ ص ۱۶۷)

اہل سنت اپنے مسلک پر یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ امام کا وجود اگرچہ خداوند عالم سے قریب اور معاصی سے دور کرنے والا ہوتا ہے۔ اتنی ہی سی بات کی وجہ سے اس کا مقرر کرنا اللہ پر واجب نہیں ہوجائے گا۔ اس لیے کہ ہوسکتا ہے کہ امام کے مقرر کرنے میں کوئی مخفی فساد اور خرابی ہو۔ اور بندے اس کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔ تو جب تک یہ یقین نہ ہوجائے کہ کوئی فساد اور خرابی نہیں پیدا ہوگی۔ اس وقت تک اس کا حل مقرر واجب نہ ہوگا۔

اس کا جواب اہل تشیع یہ دیتے ہیں کہ جب یہ بات تسلیم ہے کہ امام طاعت سے قریب کرنے والا ہے تو اس کے مقرر کرنے میں کسی قسم کی خرابی یا فساد کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اور محض اس احتمال کی بناء پر کہ ہوسکتا ہے کہ امام کہ مقرر کرنے میں کوئی خرابی پیدا ہو۔ وجوب تعین امام میں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔ مزید برآں جو لوگ امام کے نصب وتقرر کو واجب سمجھتے ہیں ان کا مسلک یہ ہے کہ امام کا مقرر کرنا خدا پر واجب ہے۔ اور خداوند عالم سے مصالح اور مفاسد کوئی بھی پوشیدہ نہیں۔

(اصلاح نومبر ۱۹۷۲ء ص ۱۶۷)

اس ضمن میں مولانا سید علی نقی اپنے رسالے "وجود حجت" میں فرماتے ہیں:

"اگرچہ امام کا لفظ اپنے مفہوم کے اعتبار سے وسیع ہے امام کے لغوی معنی پیشوا کے ہیں اور اسی حیثیت سے جماعت میں نماز گزاروں کے مقتدا کو امام کہا جاتا ہے۔ لیکن جناب اقدس الٰہی کی قرارداد کے مطابق امامت ایک خاص منصب اور مرتبہ کا نام ہے۔ جس کو وہ صرف اپنے انتخاب سے قابلیت واستعداد کا لحاظ رکھتے ہوئے جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے"۔

(وجود حجت ص ۱۲۳ اگست ۳۳ء)

چنانچہ سید مصطفیٰ میر تقی لکھتے ہیں:

"امامت مانند نبوت ایک منصب الٰہی است، بایں تفاوت کہ امام بوی وحی نمی شود بلکہ دستورات واحکام دیں راز طریق پیغمبر دریافت با مسلمانان اعلام و ابلاغ نمودہ بہ مورد اجرائی گذارد۔ بعبارت دیگر پیغمبر مبلغ الٰہی و امام مبلغ پیغمبر است۔" (اسلام وعقائد شیعہ ص ۲۳۵)

مصنف "اصل واصول شیعہ" کا بیان ہے:

"امامیہ فرقہ کے نزدیک امامت وہ "منصب الٰہی" ہے جو نبوت کی طرح پروردگار عالم کی جانب سے ہدایت خلق کے لیے عطا ہوتا ہے۔ اور ان کا یہ عقیدہ ہے کہ جناب باری عز اسمہ نے پیغمبر کو حکم دیا کہ وہ علیؑ بن ابی طالب کو اپنا جانشین کریں۔ تاکہ ختم نبوت کے بعد تبلیغ جاری رہے۔"

(اصل واصول شیعہ ص ۶۴)

اب سوال اٹھتا ہے کہ آخر پیغمبروں کے بعد امام کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی یا اللہ نے امام کیوں بھیجے؟ شیعوں کے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت تو خاتم النبیینؐ پر آ کر ختم ہو گئی۔ اور دین مکمل ہو گیا۔ لیکن نبیؐ کے بعد بھی اس دین کے دقائق اور حقائق سے روشناس کرانے کے لیے کسی ایسی ہستی کی ضرورت پھر بھی باقی رہی۔ جو قیامت تک اہل دنیا کو باطل سے دور رکھ سکے۔ اور

بدی کو رفع کر کے نیکی کی تعلیم عام کرے۔ وہ کتاب خدا کی حقیقی معنوں سے روشناس کراتا ہے اور لوگوں کو اطاعت الٰہی پر قائل کرے۔ یہ کام عام دنیاوی شخصیتوں کے بس کا نہ تھا۔ لہٰذا امام منصوص کیے گئے۔ اس کے علاوہ عمرانی وسماجی اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جہاں ایک سماج یا جماعت کا وجود ہوتا ہے وہاں ان کے حقوق وفرائض سے آگاہی کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ نیز حقوق کی حفاظت کا مسئلہ بھی درپیش ہوتا ہے۔ اس لیے ایک ایسے شخص کا وجود لازمی ہو جاتا ہے جس کا حکم سب مانیں۔ اور امن سے رہیں۔ ہر امام نے رسول کے بعد وہی کام انجام دیئے۔ امام کی ضرورت کا ایک اور سبب یہ بھی تھا کہ شریعت واحکام رسول کی حفاظت واجب تھی۔ تاکہ اس میں تحریف لفظی ومعنوی نہ ہو اور دیگر مذاہب کی طرح اسلامی تعلیمات میں بھی کسی قسم کی کمی وبیشی یا تغیر وتبدل نہ ہونے پائے۔ ائمہ کرام نے اسی حفاظت کا فرض انجام دیا۔ نیز ایک مشکل یہ بھی تھی کہ آیات قرآنی مجمل ہیں۔ اور اکثر احکام کا مفہوم واضح نہیں ہے۔ اس لیے لازم تھا کہ کوئی شخص مامور من اللہ مسائل شرعیہ کا مفصل استنباط آیات سے کرے۔ یہ ہر شخص کے بس کی بات بھی نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ائمہ کرام اللہ کی جانب سے منصوص کیے گئے۔

امامت منصوص باللہ کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ شیعوں کے نزدیک امام کا معصوم ہونا واجب ہے اور عصمت کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اللہ ہی پر اس کا تقرر لازم ہے۔ اور چونکہ آدمؑ سے حضور اکرامؐ تک تمام انبیاء اپنا جانشین مقرر کرتے رہے۔ اور خود آنحضرت بھی جب مدینہ سے مکہ کی طرف جاتے تھے تو کسی کو مدینہ میں اپنا جانشین چھوڑ جاتے تھے۔ عمال اور دیگر اولی الامر کا تقرر بھی آنحضرت کی قائم مقامی ہی ہے۔ اس لیے یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے آنحضرت اپنے بعد کسی کو نامزد نہ فرماتے؟ لہٰذا شیعہ یہ دعویٰ ہی نہیں کرتے۔ بلکہ عقیدۂ راسخ رکھتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے نہ اپنی وفات سے پہلے ہی حضرت علیؑ کو اللہ کی مرضی کے مطابق امامت کے لیے نص فرمایا تھا۔ اور اسی طرح تمام ائمہ اثناعشر منصوص باللہ ہیں۔ ان کا انتخاب عوام کے ذریعے عمل میں نہیں آیا۔ شیعہ اجماع قیاس وغیرہ کے قطعی قائل نہیں اسی لیے امامت منصوص باللہ کے نظریئے کی حمایت میں مولوی سید علی نقی نقوی کہتے ہیں:

"امام اور بالفاظ دیگر حافظ شریعت کا تقرر اگر باہمی پنچایت اور انتخاب خود

اختیاری و کثرتِ آراء کی بناء پر ہو تو اس حافظ و نگہبان کی ضرورت ہی باقی نہیں
رہتی۔ خود شریعت کے بارے میں اکثریت جس طریقہ پر جائے گی وہی حق
سمجھا جائے۔ اگر چہ وہ شریعت کی تبدیل و تحریف اور اس کی تراش خراش ہی
کیوں نہ ہو۔ اور اگر نظامِ شریعت پر عمل درآمد کے بارے میں اکثریت سے
غلطی کا احتمال ہے تو حافظِ شریعت کے انتخاب میں بھی اس غلطی کا امکان بہت
زیادہ ہے۔ ملکی و ملی عہدوں کے انتخابات اور ان کے نتائج ہمارے سامنے ہیں
۔ اور ہر شخص ان سے واقف ہے۔ بے جا رعایت، جانبداری، بے انصافی
تقاضائے مروّت اور آپس کے تعلقات، موجودہ منافع اور آئندہ کے توقعات'
جھوٹے مواعید کا فریب اور بے حقیقت طفل تسلیاں، ذاتی نفوذ و اقتدار اور
احکام کی بارگاہ میں بے حقیقت اثر و رسوخ، ظاہری تزک و احتشام اور طمع کار و
جاہت و اعزاز یہ چیزیں وہ ہیں جو اقلیت کو اکثریت میں تبدیل کر دینے کے
کامیاب ترین ذرائع ہیں۔ اور اکثریتوں کی تشکیل اکثر و بیشتر ان ہی بنیادوں
پر ہوتی ہے۔ پھر اگر امام بھی ایسا ہوا جو خود جائز الخطا ہے اور جس سے غلط کاری
اور تلبیس و تدلیس کا احتمال ہے تو حفظِ شریعت کے بجائے خود اسی کے ہاتھوں
شریعت اسلامیہ خطرے میں اور احکام مذہب معرض زوال میں ہونگے۔ اور جو
مقصد حافظِ شریعت کا تھا۔ وہ نیست و نابود ہوگا۔" (وجود حجت ص ۳۵-۳۴)

شیعوں کا اساسی عقیدہ خلافت و امامت کے بارے میں صاف طور پر حسب ذیل ہے:

(۱) امام جانشین رسولؐ ایسا ہی شخص ہو سکتا ہے جس سے رسولؐ کی وفات کے بعد حفاظت شریعت اور اصلاح خلائق کا مقصد پورے طور سے حاصل ہو سکے۔ اور خود اس کی غلط اندیشی، غلط بیانی یا غلط کاری سے فسادِ خلق کا اندیشہ نہ ہو۔ اور یہ اسی وقت ہوگا کہ جب وہ معصوم ہو۔

(۲) امام وہی ہوگا جو اپنے زمانے کے تمام مسلمانوں میں سب سے زیادہ متقی، باخدا اور سب سے زیادہ عالم علوم حقیقیہ ہو۔ خلاصہ یہ کہ علم و عمل میں افضل و اکمل ہو۔

(۳) ایک ایسی ہستی کی تشخیص جو معصوم ہونے کے ساتھ تمام افراد مسلمین سے افضل و اکمل

ہو۔ عام افرادِ انسانی کے دسترس سے باہر ہے۔ نیز عام افراد کا فیصلہ پورے طور پر رو رعایت اور جانبداری سے الگ بھی نہیں ہوا کرتا اور اس میں خود غرضی اور مطلب براری لحاظ کا موقع ہے۔ اس لیے امام یعنی جانشین رسول کا انتخاب براہ راست خدا سے متعلق ہونا چاہئے۔ اور امام وہی ہوگا جس کو خدا مقرر کرے۔

(۴) چونکہ خداوندی منشاء کے معلوم ہونے کا ذریعہ عام انسانوں کو سوائے سفیر الٰہی یعنی پیغمبر کے بیان کے اور کوئی نہیں ہے۔ اس لیے امام یعنی جانشین رسولؐ کی تعیین بھی یا اسی رسولؐ کے نص سے ہوگی۔ یا اس امام کے بیان سے جو رسولؐ کی جانب سے نامزد تھا۔ کیونکہ یہ نص بھی بواسطۂ رسولؐ خدا تک ہوتی ہے۔ (نگار جنوری ۳۸ء ص ۱۴۵)

شیعی عالم شیخ صدوق "اعتقادیہ" میں لکھتے ہیں:

"ہمارا اعتقاد انبیاء و مرسلین، ائمہ اور ملائکہ کے بارے میں یہ ہے کہ وہ ہر طرح
کی اخلاقی پستی سے معصوم اور پاک ہیں۔ اور یہ کہ وہ کوئی گناہ صغیرہ و کبیرہ نہیں
کرتے۔ اور کسی حکمِ خدا کی مخالفت ان سے نہیں ہوتی۔ اور جو ان کے فرائض
ہوتے ہیں انھیں بجالاتے ہیں۔ اور جو ان سے کسی حالت میں بھی عصمت کی
نفی کرے وہ ان کے مرتبہ سے حقیقتاً واقف نہیں ہے۔ اور ہمارا اعتقاد ان کے
بارے میں یہ ہے کہ وہ تمام کمالات سے متصف نہیں ہوتے۔"
(ایضاً ص ۱۳۹)

ایک اور شیعی عالم علامہ حلی "کشف الحق" میں تحریر فرماتے ہیں:

"فرقۂ امامیہ تمام و کمال اس بات کا قائل ہوا ہے کہ انبیاء صغائر و کبائر سب
گناہوں سے معصوم ہیں۔ اور معاصی سے بری ہیں۔ نبوت کے قبل بھی اور بعد
بھی عمداً اور سہواً۔ اور بری ہیں ہر پست اخلاقی نقص سے اور ان چیزوں سے جو
نفس کی اور حقارت کا پتہ دیتی ہیں۔" (ایضاً ص ۱۳۹)

اسی طرح علامہ مجلسی نے "سجا" میں لکھا ہے:

"سب سے بڑا مستند اس مسلک کا جو ہمارے فرقے کے علماء نے اختیار کیا

ہے۔ کہ انبیاء ائمہ ہر گناہ اور نقص سے بری ہوتے ہیں۔ قبل نبوّت بھی اور بعد نبوّت بھی۔" (ایضاً ص ۱۳۹)

عصمت ائمہ کے سلسلے میں ہشام بن حکم نے بہترین تقریر کی ہے۔ محمد بن عمیر کے استفسار پر کہ عصمت کی صحیح تعریف کیا ہے اور کیونکر اس کا علم ہوسکتا ہے۔ ہشام نے جواب دیا۔ "جتنے بھی گناہ ہیں ان کی چار ہی وجہیں ہوسکتی ہیں۔ پانچویں کوئی وجہ نہیں (۱) حرص (۲) حسد (۳) غضب اور (۴) ہوائے نفسانی۔ یہ تمام باتیں امام میں نہیں ہوتیں۔ امام کے لیے جائز نہیں کہ وہ دنیا کا حریص ہو۔ کیونکہ ساری دنیا تو اس کے زیر نگیں ہوتی ہیں۔ اور وہ تمام مسلمانوں کا خزینہ دار ہوتا ہے۔ لہٰذا کس چیز کی حرص کرے گا۔ امام کے لیے یہ بھی جائز نہیں کہ وہ حاسد ہو۔ اس لیے کہ انسان اپنے سے اونچے آدمی ہی سے حسد کرتا ہے۔ اور امام سے کوئی اور شخص اونچا نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ اپنے پست درجے کے انسان سے حسد کیونکر کرے گا۔ امام کے لیے یہ بھی جائز نہیں کہ دنیا کی کسی چیز کے لیے غضبناک ہو۔ اس کا سارا غیظ و غضب خدا کے لیے ہونا چاہیے۔ خداوند عالم نے فرض کیا ہے کہ وہ حدود قائم کرے۔ خدا کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی اسے پرواہ نہ ہو۔ تبھی وہ حدود خداوندی کا صحیح طور پر نفاذ کر سکے گا۔ امام کے لیے یہ بھی جائز نہیں کہ وہ خواہش نفسانی کی پیروی کرے۔ اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دے۔ اس لیے کہ خداوند عالم نے امام کو آخرت کا ویسا ہی فریضہ بنایا ہے جیسا ہمیں دنیا کا فریضہ کیا۔ اس کی آخرت پر اسی طرح نظر رہتی ہے جس طرح ہماری دنیا پر رہتی ہے۔ تم بتا سکتے ہو کہ کس نے بدصورت چہرے کے لیے خوبصورت چہرے کو چھوڑ دیا ہو۔" (بحارالانوار جلد ۷ صفحہ ۳۱۷) (اصلاح نومبر ۲۷ ص ۱۷۹۔۱۷۸)

غرضیکہ یہ تمام محاسن و اوصاف جس شخص میں پائی جائیں۔ وہی شیعی نقطۂ نظر سے امام کہلایا جا سکتا ہے۔ لہٰذا امام کی پہچان کے دو طریقے ہیں۔

(۱) نص یعنی نبی یا قبل کا امام تصریح کرے کہ میرے بعد میرا وصی اور جانشین فلاں شخص ہے۔

(۲) معجزہ۔ دونوں خصوصیات سوائے بارہ اماموں کے کسی میں نہیں پائی جاتیں۔ لہٰذا شیعہ اثنا عشری نص و معجزے کی رو سے بارہ اماموں کو اپنا خلیفہ مانتے ہیں۔ قرآن مجید کی بہت سی آیتیں اور بے شمار حدیثیں ایسی ہیں جن سے بارہ اماموں کی خلافت کا پایا جانا ثابت ہوتا

ہے۔ عقیدۂ ائمہ اثنا عشر کی تصدیق سُنّیوں کی معتبر، مستند کتابوں مثلاً امام مسلم، بخاری وغیرہ میں موجود ہیں۔ (دیکھیے صفحہ ۵۹۔۶۰ دیکھیے)

صحاح میں متعدد طریقوں سے حدیث اثنا عشر کو بیان کیا گیا ہے۔

جابر ابن سمرہ کہتے ہیں: میں ایک مرتبہ اپنے باپ کے ساتھ پیغمبر اکرم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آنحضرت نے فرمایا کہ "یہ نظام اس وقت تک ختم ہونے والا نہیں جب تک بارہ خلیفہ نہ گذر جائیں۔" اس کے بعد حضورؐ نے آہستہ سے کچھ فرمایا۔ جو میں سن نہیں سکا۔ اپنے باپ سے دریافت کیا تو اس کے آگے سرکار رسالتؐ نے کیا ارشاد فرمایا۔ جواب ملا "نبی کریم کا فرمان ہے کہ یہ سب قریش سے ہونگے"۔ (اصل واصول شیعہ ص ۵۷)

ابن عباس ناقل ہیں کہ ایک یہودی جس کا نام نعثل تھا جناب رسالتمآب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اس نے آپؐ سے قبول اسلام کے لیے بطور شرط چند سوالات پوچھے جن میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ "آپؐ کے بعد آپ کا وصی کون ہے؟ اس لیے کہ کوئی نبی ایسا نہیں گذرا جس کا کوئی وصی نہ ہوا ہو۔ ہمارے پیغمبر حضرت موسیٰ بن عمران نے اپنی حیات میں یوشع بن نون کو اپنا وصی مقرر کیا"۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ:

"ان وصّی و خلیفتی من بعدی علیؑ بن ابی طالب و بعده سبطاتی الحسن والحسین و تیلوه بستعتۃٌ من صلب الحسن ائمۃ ابرار۔"

(میرے بعد میرے وصی و خلیفہ علیؑ بن ابی طالب ہیں اور ان کی بعد میرے دونوں نواسے حسن و حسین ہیں اور حسین کے بعد نو امام اولاد حسین سے ہونگے۔)

پھر اس نے کہا ان کا نام مجھ سے بیان کیجیے۔ آپ نے فرمایا۔ "حسینؑ کے بعد ان کا فرزند علیؑ ہوگا۔ اور علیؑ کے بعد ان کا فرزند محمدؑ ہوگا۔ محمدؑ کے بعد ان کا فرزند جعفرؑ ہوگا۔ اور جعفرؑ کے بعد ان کا فرزند محمدؑ ہوگا۔ اور محمدؑ کے بعد ان کا فرزند علیؑ ہوگا۔ اور علیؑ کے بعد ان کا فرزند حسنؑ ہوگا۔ اور حسنؑ کے بعد ان کا فرزند قائم حجت مہدیؑ ہوگا۔" (تحفۃ العلوم ص ۱۵)

چنانچہ ایسی بہت سی حدیثوں کے مطابق شیعۂ امامیہ ائمہ اثنا عشر پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ اہلِ سنت اس شرط کو لازمی نہیں مانتے کہ تمام ائمہ اثنا عشر اولادِ علیؑ سے ہونگے۔ چنانچہ نجم الدین نسفی

نے عقائد میں لکھا ہے:

''امام قریش سے ہوگا اور کسی دوسرے قبیلے سے امام کا ہونا جائز نہیں ہے۔اور بنی ہاشم اور اولادِ علیؑ ابن ابی طالب سے مخصوص نہیں ہے''۔

(نگار جنوری ۳۸ء ص ۱۴۵)

سنیوں کا خیال ہے کہ اس طرح امامت موروثی ہو جاتی ہے۔ذاکر حسین اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے اپنے مضمون ''مسئلہ خلافت وامامت۔انسانیت اور اسلام کے نقطۂ نظر سے'' میں رقم طراز ہیں:

''یہ خیال دماغ سے نکل جانا چاہئے کہ یہ علیہ ان لوگوں کو (ائمہ اثنا عشر کو) اولادِ رسولؐ ہونے کی حیثیت سے ملا ہے۔یا رسولؐ یہ چاہتے تھے کہ میری نسل مسلمانوں کی گردنوں پر مسلط رہے۔کیونکہ اگر اولادِ رسولؐ ہونے کی حیثیت مدِنظر ہوتی تو خود علیؑ کو یہ شئے کیسے ملتی؟ اور اگر اولادِ علیؑ کا لحاظ کیا جائے تو علی مرتضیٰؑ کی اولاد دوسری بی بیوں سے بھی ہے۔یہ منصب وہاں کیوں نہ پہنچا۔اور اگر بنو فاطمہ کا لحاظ کیا جائے تو اولادِ امام حسنؑ اس سے کیوں محروم رہی؟ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس امر میں کسی نسلی امتیاز کا لحاظ نہیں کیا گیا۔''

(نگار جنوری ۳۸ء ص ۱۳)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ جس طرح نبوّت من جانب اللہ ہے۔اسی طرح امامت بھی الٰہیہ ہوئی۔خداوند عالم طے کر چکا تھا کہ رسولِ کریمؐ کے بعد خلافتِ الٰہیہ علیؑ ہی کے لیے اور علیؑ اس عقیدے میں سارے اسلامی فرقے شیعوں کے مخالف ہیں۔حتیٰ کہ زیدیہ بھی وہ عقیدہ نہیں رکھتے جو شیعۂ امامیہ کا عقیدہ ہے۔یعنی فرقۂ امامیہ کا اعتقاد ہے کہ ہر زمانہ میں امام کا وجود لازمی ہے جس کے ذریعے خداوند عالم اپنے مکلف بندوں پر حجت قائم کر سکے۔معتزلہ خوارج، زیدیہ، مرجیہ اور اہل سنت بھی اس کے خلاف ہیں۔لیکن شیعۂ امامیہ کا عقیدہ ہے کہ ان ائمہ میں سے بارھویں امام جو امام عصر ہیں۔زندہ ہیں۔اور بحکم خدا نظروں سے غائب ہیں جب حکم خدا ہوگا ظہور فرمائیں گے۔اور تمام عالم میں دینِ حق پھیلائیں گے۔ان کی غیبت میں ان کے نائب اعلم اور مجتہد دینی

معاملات میں شیعوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔موجودہ دور میں ہندوستان شیعہ ایران کے مشہور اعلم آقای خوئی کے بعد آقای سیستانی کے مقلد ہیں۔

ب : شیعیت اور مذہبِ اہلِ سنت کا فرق

(فروعِ دین کی روشنی میں)

شیعی نقطۂ نظر سے عملی طور پر مذہب کے فروع دس ہیں۔

(۱) نماز (۲) روزہ (۳) حج (۴) زکوٰۃ (۵) خمس (۶) جہاد (۷) امر بالمعروف (حسب مقدرت اچھی باتوں کا حکم کرنا) (۸) نہی عن المنکر (حتی الامکان بری باتوں سے روکنا) (۹) تولا (محمدؐ وآل محمدؐ اور ان کے دوستوں سے محبت کرنا) (۱۰) تبرا (محمدؐ آل محمدؐ کے دشمنوں سے برأت کرنا)۔

جہاں تک فروعی احکام کا تعلق ہے۔شیعہ نماز پنجگانہ کو فرض جانتے ہیں۔اور کعبہ ہی کو سجدہ کرنا لازمی سمجھتے ہیں۔قرآن عظیم کو بغیر کسی شک وشبہ کے اللہ کی کتاب تسلیم کرتے ہیں اور وہ قرآن جو حضرت عثمان کے دور میں جمع کیا گیا ہے۔اس کو صحیح اور بغیر کسی کمی بیشی کے تسلیم کرتے ہیں۔جہاں تک ترتیب کا تعلق ہے سنّی' شیعہ اہل علم متفقہ طور پر کہتے ہیں کہ ترتیب قرآن بہ اعتبار تنزیل نہ ہو سکی۔شیعہ ماہِ مبارک رمضان کے تیس روزوں کو واجب مانتے ہیں۔حج بیت اللہ بشرط استطاعت فرض جانتے ہیں۔زکوٰۃ کا ادا کرنا شیعوں کے پاس بھی اسی طرح واجب ہے جس طرح حضرات اہلِ سنت کے پاس، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو شیعہ بھی اسی طرح فروعات میں شمار کرتے ہیں۔جس طرح سنّی۔زکوٰۃ کے علاوہ شیعہ حقوق کے معاملے میں خمس کو بھی واجب جانتے ہیں۔شیعوں کا نظریہ ہے کہ خداوند عالم نے خمس کو آل محمدؐ کے لیے زکوٰۃ کے عوض قرار دیا ہے۔خمس جن چیزوں پر واجب ہوتا ہے۔ان میں وہ مالِ غنیمت ہے جو کفار سے جہاد میں حاصل ہو۔بشرطیکہ وہ جہاد امام زمانہ کی اجازت سے ہو۔معدنی اشیاء جیسے سونا' چاندی' وغیرہ کے مصارف وضع کرنے کے بعد ایک مخصوص مقدار پر' خزانہ جس کا مالک معلوم نہ ہو۔یا غوطہ زنی سے حاصل ہونے والی چیزیں مثلاً موتی' مرجان' وغیرہ پر، تجارت زراعت کے نفع پر سال بھر کے اخراجات

کے بعد جو رقم بچی ہو' وہ زمین جو کوئی کافر مسلمان سے خریدے یا وہ مال حلال جو حرام سے مخلوط ہو جائے۔ خمس کے چھ حصے کئے جاتے ہیں۔ تین حصے امام زمانہ کا حق ہیں۔ جو حضرت غیبت میں مجتہد عادل کو دینا چاہئے اور باقی حصہ یتیم و مسکین و مسافر کا حق ہے جو سادات شیعہ ہوں۔

اسی طرح شیعہ جہاد کو بھی فروع اسلام میں سے ایک فرع مانتے ہیں۔ لیکن جہاد کے لیے کچھ شرائط لازمی قرار دیتے ہیں۔ یعنی جہاد بحکم امام ہو۔ اور ہر مرد آزاد پر لازم ہے۔ جو بالغ ہو۔ اور عاقل ہو۔ بچہ، پاگل، عورت، غلام، اندھا، بوڑھا، مریض، فقیر، مفلس وغیرہ پر جہاد لازم نہیں۔

دو فرع جنہیں سنی نہیں مانتے۔ شیعہ مانتے ہیں۔ وہ ہیں ایک تولا اور دوسرا تبرا ایسی وہ فروع ہیں جن کی وجہ سے اکثر اوقات اختلافات شدید صورت حال اختیار کر لیتے ہیں۔ اور فسادات تک کی نوبت آ جاتی ہے۔ لیکن اس ضمن میں کچھ غلط فہمیاں بھی عام ہیں لہٰذا ان دونوں فروع کی تشریح لازمی ہو جاتی ہے۔

تولاّ:

تولا شیعوں کے ایمان کا جزو اعظم ہے۔ ولائے محمدؐ و آل محمدؐ شیعیت کی پہچان بھی ہے۔ ایمان بھی ہے۔ اور جان بھی کوئی شیعہ صفحۂ ہستی پر ایسا نہ ملے گا جو ولائے محمدؐ و آل محمدؐ سے گریز کرتا ہو۔ شیعوں کی یہی خصوصیت ہے۔ جس کی وجہ سے انھیں دیواروں میں زندہ چنوا دیا گیا۔ سر کاٹے گئے۔ گردنیں اڑائی گئیں۔ اور خون بہایا گیا۔ لیکن ولائے محمدؐ و آل محمدؐ میں پھر بھی کمی نہ آئی۔ حضور کے صحابۂ اکرام سے لے کر تابعین و تبع تابعین اور اس کے بعد ہر دور کے شیعہ ان صعوبتوں سے گزرتے رہے۔ خاص طور پر بنو امیہ کے عہد میں تو اِس وجہ سے شیعوں پر بے انتہا ظلم ہوئے۔ لیکن شیعہ اس شعر کی سرتاسر تشریح بنے رہے کہ۔

ستم ستم پہ، جفا پر جفا اٹھائیں گے
وفا شعار وفا سے نہ باز آئیں گے

تولاّ اور تبرا کے متعلق مولانا سید ابنِ حسن جارچوی فرماتے ہیں:

"یہ ایک دلچسپ بحث ہے۔ تولاّ اور تبرا مذہب امامیہ کا جزو ہے۔ مگر عام مسلمان اس سے

چڑتے ہیں۔ غور سے دیکھئے تو تولا اور تبرا دونوں فطری چیزیں ہیں۔ کائنات کی ہر چیز، کچھ چیزوں کی طرف رغبت رکھتی ہے۔ اور کچھ چیزوں سے نفرت کرتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے ذرّوں سے لے کر بڑے بڑے اجرامِ ساوی تک سب اسی قاعدے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ مذہب امامیہ ہم کو برائی سے نفرت اور بھلائی سے الفت کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اور جیسا کہ متنِ کتاب (فلسفۂ آلِ محمدؐ) میں بیان کیا گیا ہے۔

"کسی انسان سے محبت یا نفرت اس کے اعمال کی بناء پر ہو سکتی ہے"۔ بس تولاّ اور تبرا کا یہی مفہوم ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ انسان تقلید اور نقل کرنے والا حیوان ہے یہ اپنے ہم جنسوں کی مثال سے جلد متاثر ہو جاتا ہے۔ پھر جس سے اس کو محبت و الفت ہو۔ اس کے رنگ میں تو بہت جلد رنگ جاتا ہے۔ آلِ محمدؐ کی تعلیم ہے کہ بروں سے محبت نہ رکھو۔ ایسا نہ ہو کہ تم بھی بُرے ہو جاؤ۔ اچھوں سے محبت کرو تا کہ تمہارے اعمال بھی ان ہی کی طرح اچھے ہو جائیں سب و شتم اور گالیاں بکنا اس مذہب کا جزو نہیں ہے۔ یہ ایک غلط فہمی ہے۔ جو خدا جانے کس نے پھیلا دی ہے" (فلسفہ آلِ محمدؐ از مولانا ابن حسن جارجوری بار سوم مارچ ۴۰ء ص ۵۷ کا حاشیہ)

ایک اور جگہ تولا کی حمایت اور محبت اہلِ بیت رسولؐ کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"خدا کی قسم آلِ محمدؐ کی محبت میں دوزخ میں جلنا ہمارے لیے اس بہشت سے بہتر ہے جو آلِ محمدؐ کے قاتلوں کو ان کے مظالم کی پاداش میں ملے۔" (ایضاً ص ۶۰)

ولائے محمدؐ کا یہی جذبہ تو غالب جیسے بادہ خوار کے ہاں عقیدہ کی شدت بن کر یوں نمودار ہوتا ہے کہ وہ بادہ خواری کے سہارے دوزخ میں جل کر اپنی ہڈیوں سے ایندھن کا کام لینا چاہتے ہیں۔ تا کہ دوزخ کی دہکی ہوئی آگ میں اور اضافہ ہو۔ اور دشمنانِ علیؑ و اولادِ علیؑ جو دوزخ میں آئیں تو جل کر خاک ہو جائیں۔ اور غالب کی "شیعی روح" کو تسکین نصیب ہو۔

تبرّا:

عام طور پر تبرا کے متعلق یہ غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ اس کے معنی سب و شتم اور گالی گلوچ کے ہیں۔ جبکہ کسی بھی الٰہی اور پاکیزہ مذہب میں کسی بھی بنیاد پر مغلظات کو نہ فروعِ دین مانا جا سکتا

ہے۔نہ جز و دین۔اور مذہب شیعہ میں تو گالی بکنے کی سخت ترین ممانعت ہے۔

تبرا کے لغوی معنی ہیں برأت یا بیزاری کا اظہار کرنا۔چنانچہ شیعوں کا یہ دعویٰ ہے کہ لا الٰہ الا اللّٰہ خود تبرا ہے۔جب تک جھوٹے خداؤں سے برأت نہ ہو۔اللہ جل شانہ کا اثبات بے معنی ہو جاتا ہے۔لہٰذا کلمہ ان جھوٹے خداؤں پر تبرا ہے جو اللہ کے سوا خدائی کا دعویٰ کرتے رہے ہیں۔

شیعہ دلیلوں سے یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ تبرا خود قرآن میں موجود ہیں۔یعنی اللہ تعالیٰ، رسول مقبولؐ، حضرت ابراہیمؑ (جن کی ملّتِ حنیف میں اللہ نے تمام مسلمانوں کو قرار دیا تھا۔اور جن کی سنت کے اتباع کا تمام مسلمانوں کو قرآنِ پاک میں حکم دیا گیا ہے)۔

حضرت داؤدؑ اور حضرت عیسیٰؑ بھی نے اس پر عمل کیا ہے۔اور ان تمام ہستیوں کی پیروی شیعہ اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔

تبرا کے جواز میں شیعہ دلیل کے طور پر قرآنِ شریف کی بے شمار آیتیں پیش کرتے ہیں۔جن میں اللہ تعالیٰ نے خود بھی لعنت فرمائی ہے۔اپنے ملائکہ سے بھی لعنت بھجوائی ہے۔اور اپنے پیغمبروں اور تمام بندوں سے بھی لعنت کروائی ہے۔حضرت ابراہیم کا تبرا قرآن شریف میں کئی جگہ موجود ہے۔اس سلسلے میں قرآن شریف کی چند آیات مولانا اشرف علی تھانوی قادری چشتی حنفی کے ترجمے سے درج ذیل ہیں۔جن میں بیزاری اور تبرا کا اظہار کیا گیا ہے۔

(اصلاح جلد ۱۲۔۱۱، مناقب اہلِ بیت از کوثر ندوی ص ۳۸۱۔۳۷۸)

(۱) لَعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَا يُؤْمِنُوْنَ۔

(بلکہ ان کے کفر کے سبب ان پر خدا کی مار ہے سو بہت ہی تھوڑا سا ایمان رکھتے ہیں۔)

(صفحہ ۲۰ پارہ ۱ سورۂ بقرہ رکوع ۱۱ آیت ۸۸)

(۲) فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكَافِرِيْنَ۔

(سو خدا کی مار ایسے منکروں پر) صفحہ ۲۰ پارہ ۱ سورہ بقرہ رکوع ۱۱ آیت ۸۹

(۳) أُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ۙ

(ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت فرماتے ہیں۔اور لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں)

صفحہ ۳۷ سورۂ بقرہ آیت ۱۵۹ رکوع ۳

(۴) أُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ ۙ

(ایسے لوگوں پر لعنت اللہ کی۔اور فرشتوں کی اور آدمیوں کی بھی سب کی۔)

صفحہ ۳۷ پارہ ۲ سورہ بقرہ آیت ۱۶۱ رکوع ۳

إِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۙ

(بے شک جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو ایذا دیتے ہیں۔اللہ تو ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کرتا ہے۔اور ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب تیار رکھا ہے۔)

پارہ ۲۲ سورۂ احزاب آیت ۵۷ رکوع ۴

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل آیتیں بھی تبرا اور لعنت کی حمایت کرتی ہیں۔

(۱) پارہ ۱ سورۂ بقرہ رکوع ۱۱ اور رکوع ۱۹ آیات ۱۵۹ ، ۱۶۱، ۱۶۶، ۱۶۷

(۲) پارہ ۳ سورۂ آلِ عمران رکوع ۶ اور ۹ آیات ۶۱ اور ۱۸۷

(۳) پارہ ۵ سورۂ نساء، رکوع ۷، ۸، ۱۳، ۱۸، آیات ۴۶، ۴۷، ۵۲، ۹۳ اور ۱۱۸

(۴) پارہ ۶ سورۂ مائدہ رکوع ۳، ۹، ۱۱، آیات ۱۳، ۶۱، ۶۴ اور ۷۸

(۵) پارہ ۸ سورۂ اعراف رکوع ۴، ۵، آیات ۳۸، ۴۴

(۶) پارہ ۱۰ سورۂ توبہ رکوع ۱، ۹، آیات ۱، ۶۸

(۷) پارہ ۱۱ سورۂ توبہ رکوع ۱۴ آیات ۱۱۴

(۸) پارہ ۱۲ سورۂ ہود رکوع ۲، ۵، ۹، آیات ۱۸، ۶۰، ۹۹

(۹) پارہ ۱۳ سورۂ رعد رکوع ۳ آیات ۲۵

(۱۰) پارہ ۱۴ سورۂ حجر رکوع ۳ آیات ۳۴ اور ۳۵

(۱۱) پارہ ۱۸ سورۂ نور رکوع ۱، ۳، آیات ۷، ۲۳

(۱۲) پارہ ۲۰ سورۂ قصص رکوع ۴ آیات ۴۲

(۱۳) پارہ ۲۰ سورۂ عنکبوت رکوع ۳ آیات ۲۵

(۱۴) پارہ ۲۲ سورۂ احزاب ۔ رکوع ۷ آیات ۵۷

(۱۵) پارہ ۲۲ سورۂ احزاب رکوع ۸ آیات ۶۱

(۱۶) پارہ ۲۲ سورۂ احزاب رکوع ۸ آیات ۶۷، ۶۸

(۱۷) پارہ ۲۳ سورۂ ص رکوع ۵ آیات ۷۷، ۷۸

(۱۸) پارہ ۲۴ سورۂ مومن رکوع ۶ آیات ۵۲

(۱۹) پارہ ۲۶ سورۂ محمدؐ رکوع ۳ آیات ۲۳

(۲۰) پارہ ۲۶ سوررۂ فتح رکوع ۱ آیات ۶

(اصلاح ۱ ماہ محرم ۱۳۵۸ھ جلد ۳۴ ص ۲۰-۱۳)

یہ تو رہی قرآن میں تبرا کی بات شیعہ احادیث سے بھی تبرا کے جواز میں دلیل ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً۔ یہ حدیث جس میں رسولؐ کا تبرا دینا ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً۔ یہ حدیث جس میں حضرت عائشہ صدیقہ سے روایت ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا ہے۔

"چھ شخص ایسے ہیں جن پر میں بھی لعنت کرتا ہوں۔ اور خدا تعالیٰ بھی لعنت فرماتا ہے (اور تم جانتے ہو) کہ ہر نبی کی دعا مقبول ہوتی ہے (لہٰذا میری لعنت معمولی بات نہیں) (۱) کتاب اللہ میں اپنی طرف سے زیادتی کرنے والا۔ (۲) اللہ تعالیٰ کی تقدیر کا منکر۔ (۳) ظلم و تعدی کر کے بادشاہ بن بیٹھنے والا۔ جس کی حرکات ناشائستہ یہ ہوں کہ خدائے تعالیٰ کے نزدیک قابل عزت بندوں کو ذلیل کر ڈالے۔ اور جو قابلِ ذلت ہوں ان کو عزت دے۔ (۴) خدائے تعالیٰ کے حرم میں جو باتیں ناروا ہوں ان کو حلال کر دینے والا۔ (۵) میری اولاد کا احترام نہ کرنے والا۔ (۶) میرا طریقہ چھوڑ بیٹھنے والا"۔

(اخرجہ الترمذی۔ والحاکم۔ لمن علیؑ علیہ السلام)

(ترجمان السنہ جلد دوم صفحہ ۵۱۲ از مولانا بدر عالم)

شیعہ کہتے ہیں کہ تبرا کرنا اسلام میں نہ صرف قرآن و حدیث سے ثابت ہے بلکہ تاریخ بھی اس کی گواہ ہے۔ خود اہلِ سنت کے ایک بڑے خلیفہ نے خلفاء سے تبرا کرنے کا فرمان لکھ دیا تھا۔ یہ

فرمان خاندانِ بنی عباس کے خلیفہ معتضد باللہ کا ہے۔ جس کا ذکر تمام معتبر مورخین اہلِ سنت نے کیا ہے۔ مثلاً علامہ ابن الوری (تاریخ مطبوعہ مصر جلد ۱ صفحہ ۲۴۴) علامہ ابن اثیر (تاریخ کامل مطبوعہ مصر جلد ۷ صفحہ ۱۶۰) علامہ دیار بکری (تاریخ خمیس جلد ۲ صفحہ ۳۸۴) علامہ ابوالفدا (تاریخ جلد ۲ صفحہ ۵۷) علامہ سیوطی (تاریخ الخلفاء صفحہ ۲۵۴) (تاریخ طبری مطبوعہ مصر جلد ۱۱ صفحہ ۲۵۴) میں لکھا ہے یہ فرمان روز چہار شنبہ ۱۴ / جمادی الاول ۲۸۴ھ میں پڑھنے گئے۔ اس فرمان کا خلاصہ یہ ہے کہ بھائیو! تم لوگ اس اعتقاد سے بچو جس سے تم پر خدا کا غضب نازل ہوگا۔ اور وہ راہ اختیار کرو جس سے وہ تم سے راضی رہے گا۔ سیدھی راہ اور کھلے ہوئے راستوں پر چلو۔ اور ان اہلِ بیت رحمت کی پیروی کرتے رہو۔ جن کے ذریعہ سے خدا نے شروع میں بھی تمھاری ہدایت کی اور انھیں کی وجہ سے آخر میں بھی تم کو ظلم و جور سے بچائے گا۔ اور ان لوگوں پر لعنت کرو جن پر خدا نے بھی لعنت کی اور رسول خدا نے بھی اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جن کو جب تک تم نہ چھوڑو گے۔ خدا کی درگاہ میں تقریب نہیں ہو سکتا۔ (اصلاح ۴ ربیع الثانی ۱۳۵۸ھ جلد ۳۴ ص ۴-۳)

لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ تبرا معتضد باللہ کے زمانہ سے رائج ہوا۔ اور اگر تبرا تھا بھی تو بیزاری کے اظہار کی حیثیت سے۔ سب و شتم کے معنی میں ہرگز نہیں۔ سب و شتم بمعنی تبرا کی رسم کی سرِ محفل و سرِ منبر ادائیگی امیر معاویہ کے زمانہ سے شروع ہوئی۔

سُنّی عالم و ادیب محمد عسکری لکھتے ہیں:

"بنو امیہ کے زمانہ میں اہلِ بیتِ اطہار علیہم السلام کے خلاف اعلانیہ سب کچھ، آزادی کے ساتھ کہا جاتا تھا اس کے بعد بھی یہی سلسلہ جاری رہا۔ اور اس کا اثر اب تک اتنا باقی ہے کہ ان حضرات سے محبت جتنی ہونی چاہئے ہمارے قلوب میں نہیں ہے"۔ (فضائل اہل بیت ص ۹)

چنانچہ ابن اثیر تاریخ کامل صفحہ ۱۳۳ جلد ۳ میں رقم طراز ہے۔

"ان معویہ کان اذاقنت سب علیاوابن عباس والحسن ، والحسینؑ واشتر"

(معاویہ نماز کے قنوت میں لعنت کرتا تھا۔ حضرت علیؑ و ابن عباس اور امام حسن و حسین اور

مالک اشتر پر) (فلسفہ شہادت از ڈاکٹر موسیو ماربین (جرمنی) ترجمہ اخبار اثنا عشری مورخہ ۲ صفر ۱۳۲۸ھ ص ۱۸۔۱۷ حاشیہ)

عقد بدریہ میں ہے فلما مات لعنہ علی المنبر وکتب انی عمالہ ان یلعنو علی المنابر فعلوا۔ صفحہ ۶۹ نصائح۔

(یعنی سعد بن وقاص کے مرنے کے بعد معاویہ نے اپنے تمامی عمال کو لکھ بھیجا کہ تمامی منبروں پر حضرت علیؑ پر لعنت کی جائے جس کی سب نے تعمیل کی)

(فلسفہ شہادت از ڈاکٹر موسیو ماربین (جرمنی) ترجمہ اخبار اثنا عشری مورخہ ۲ صفر ۱۳۲۸ھ ص ۱۸۔۱۷ حاشیہ)

ابوالحسن مدائنی لکھتا ہے کہ "معاویہ نے بعد سنہ جماعت عام فرمان اس مضمون کا جاری کیا اپنے تمامی عمال کے نام کہ اس شخص کا خون حلال ہے جو کوئی روایت فضیلت ابوتراب میں یا ان کے خاندان کے بارے میں روایت کرے۔ جس سے ہر ہر مقام پر خطیبوں نے جناب امیرؑ پر لعنت کرنا شروع کیا اور تبرا کرنا"۔ (فلسفہ شہادت از ڈاکٹر موسیو ماربین (جرمنی) ترجمہ اخبار اثنا عشری مورخہ ۲ صفر ۱۳۲۸ھ ص ۱۸۔۱۷ حاشیہ)

غرضیکہ کئی سو سال تک یہ رسم جاری رہی۔ یہاں تک کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز تخت خلافت پر متمکن ہوئے۔ اور اس رسم قبیح کا خاتمہ کیا۔ چنانچہ مشہور مستشرق براؤن لکھتا ہے:

" It is a strange commentary an human nature that who was so highly esteemed by one community should be so blindly hated by another but from the time of the arbitration of the Khilafat with Muawiya the name of Ali was publicity cursed on the mosque of the empire untill the time of Umar II who ordered the practice stopped. "

(Browne : op.cit.I pg. 235 , Muir opcit : pg 304)

(بحوالہ جان ہولسٹر ص ۱۸۔(Shias of India)

شیعوں کے نزدیک تبرا دراصل ایسے ہی دشمنانِ اہلِ بیت سے بیزاری کا اظہار کرنا ہے۔ جو معاویہ اور اس جیسا ذہن رکھتے تھے۔ وہ ان صحابۂ رسول سے بھی بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ جنھیں علیؑ والادِ علیؑ کا دشمن سمجھتے ہیں چنانچہ شیعی عالم و محقق سید محمد باقر نقوی لکھتے ہیں:

"ہم اپنے دین میں شک وشبہ نہیں کرتے۔ نہ ارشادات الٰہی و فرمودات پیغمبر و اہلِ بیت پیغمبر کی مخالفت کر کے صحابۂ کرام کے مراتب و درجات کے فرق کو نظر انداز کرتے ہیں۔ جن صحابہ نے اچھے کام کیے دین کی نصرت میں آزمائشوں پر پورے اترے ان کی محبت ہمارے نزدیک دینی فریضہ ہے۔ ہم ہر لمحہ ان کے لیے خالص عقیدے سے امام زین العابدین کی دعا دہراتے رہتے ہیں۔ جو آپ کے صحیفۂ کاملہ میں موجود ہیں۔ جس میں آپ نے پیروانِ انبیاء کے لیے دعا فرمائی ہے۔ اللّٰھُمّہ وانباع الرسل مصدّ قیھمہ۔

یہی صحابۂ کرام اہلِ بیت کی نگاہوں میں قابل احترام تھے۔ اہل بیت جو حد بندی کر گئے ہیں اور اپنی تعلیمات سے جو حقائق واضح کر گئے ہیں ہم ان سے سرمو تجاوز نہیں کرتے۔ ہمارے دشمن جو ہمیں الزام لگاتے ہیں کہ شیعہ تمام صحابہ پر طعن کرتے ہیں۔ یا سب کو کافر قرار دیتے ہیں ان کا شکوہ خدا سے ہے۔ اور خدا ہی ہماری دادرسی کرے گا۔

اسی طرح ہمیں نفرت و بیزاری بھی ان افراد سے ہے جنھوں نے اہلِ بیت پر ظلم کیا۔ ان سے دشمنی برتی۔ ان سے برسرِ پیکار ہوئے۔ انھیں اذیت پہنچا کر رسول خدا کو دکھ پہنچایا۔ ان لوگوں سے ہم اپنی بے تعلقی ظاہر کرتے ہیں۔ اور چونکہ یہ لوگ ظالم تھے۔ اس لیے ان کی دشمنی، خوشنودی خدا ہی کا باعث ہوگی"۔ (اصلاح اپریل مئی ۶۸ء ص ۵۴)

مولانا ابن حسن جارچوی اس بات کو اور وضاحت سے سمجھاتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"ہماری نفرت شخصیتوں سے نہیں ہے۔ بلکہ ظلم و ستم سے ہے۔ کفر و نفاق سے ہے جاہ پرستی و عزت طلبی سے ہے۔ سرمایہ داری اور بے جا تفوق سے ہے۔ اور اس صفت سے ہے جو بنی نوع انسان کے لیے مضر سوسائٹی کے لیے خطرناک ہو۔".... یعنی ہمیں شخصیتوں سے نفرت ہے نہ محبت۔ ہم اعمال کی بناء پر نفرت اور محبت کرتے ہیں۔ اسلام جو تمام بنی نوع انسان کو سبق پڑھانے آیا تھا۔ جو بادشاہ اور فقیر، سرمایہ دار اور مزدور کے امتیازات کو دور کرنا چاہتا تھا۔ ہرگز اس تنگ نظری کا مرتکب نہیں ہوسکتا کہ ایک کافر کو اس کے اعمال پر سزا دے، اس

پر ابدی لعنت کا ووٹ پاس کردے۔ اس سے ترک موالات اور قطع تعلقات کرنے کا حکم دے۔ اور نام نہاد مسلمانوں کو باوجود ان کے سخت ترین مظالم کے لعنت کی پھٹکار سے محروم رکھے۔ اس لیے اگر ابوجہل اور ابولہب پر لعنت ہے۔ شیطان پر لعنت ہے۔ تو ان مسلمانوں پر بھی ہے جنھوں نے ابوجہل اور ابولہب کی سنت کا احیاء کیا۔ اور ..... لعنت نہ سب وشتم ہے نہ گالی۔ قرآن جیسی مہذب کتاب میں اس کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے۔ یہ تو Vote of Censure (قرار دادِ ملامت) کا عربی ترجمہ ہے۔ ہر مہذب قوم اپنے بدترین افراد پر ملامت کا ووٹ پاس کرتی ہے''۔ (فلسفہ آلِ محمد ص ۵۹۔۵۶)

مختصر یہ کہ تبرا کو مذہب کا جزو سمجھ کر اس پر عمل پیرا ہونا شیعوں کا وہ فعل ہے۔ جو اس نفسیاتی پس منظر کو ظاہر کرتا ہے۔ جو بعدِ وفاتِ رسولؐ سے آج تک موجود ہے۔ جس قوم نے اپنے ائمہ عظام پر برسوں تک سرِ منبر لعنت بھیجی ہوئی سنی ہو۔ اس کے صبر کی بھی انتہا ہوتی ہے۔ متعدد احادیث رسول سے ثابت ہے کہ علیؑ و اولادِ علیؑ کو ستانا ایسا ہی ہے جیسے رسول کو ایذا پہنچانا۔ اور خدا سورۂ احزاب (پ ۲۲ رکوع ۲۳) میں خود فرماتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِينًا ۝

(جو لوگ اللہ اور اس کو ایذا دیتے ہیں۔ یقین مانو کہ اللہ نے دنیا میں بھی ان پر لعنت کی ہے۔ اور آخرت میں بھی لعنت کرے گا۔ اور ان کے لیے بڑا ہی الم انگیز عذاب تیار کر رکھا ہے''۔)

شیعہ مذہب کے ان فروعی عقائد کے مطالعہ کے بعد یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ شیعہ اصول وفروع میں سُنّیوں سے کوئی خاص اختلاف نہیں رکھتے۔ لیکن بعد واقعۂ کربلا عزاداریٔ امام حسینؑ تولّا کی اساس پر شیعوں کے مذہب کا جزو بن گئی۔ اور مراسم کو شیعہ بطور عقیدہ اور مذہب کے انجام دیتے ہیں۔ اور اسی کا ایک پہلو تبرا یعنی دشمنانِ اہل بیت سے بیزاری کا اظہار ہے۔ جو عزاداری کے پہلو بہ پہلو عمل میں لایا جاتا ہے۔

ج : چند بحث طلب مسائل

جہاں تک سُنّیوں اور شیعوں کے اعتقادی اختلاف کا تعلق ہے بعض فقہی و شرعی مسائل ایسے ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً تقلید، جبر و اختیار، رویت الٰہی، رجعت، تقیہ، بداء، متعہ وغیرہ

تقلید :

شیعوں کے نزدیک تقلید کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص عالم باعمل اور متقی اور پرہیزگار جامع الشرائط۔ احکام خدا اور رسول سے واقف ہو۔ یعنی مجتہد کے حکم کی تعمیل عوام پر واجب ہے۔ جو شخص مجتہد نہ ہو اس کو واجب ہے کہ مجتہد زندہ عالم، متقی و پرہیزگار جو سب سے اوّل ہو اس کی تقلید کرے۔ اس کے بتائے ہوئے احکام پر عمل کرے۔ لیکن ہر عالم مجتہد نہیں ہوسکتا۔ مجتہد صرف وہی عالم ہوتا ہے جو قرآن اور احادیث کو سمجھ کر احکام خدا کا استخراج کرسکتا ہو۔ اور قرآن وحدیث کے اختلافات کو رفع کرسکتا ہو۔ اور ہر چیز کے حکم کو قرآن و احادیث سے نکال سکتا ہو۔ اور قوت قدسیہ رکھتا ہو۔ لیکن تقلید کے واسطے چند شرطیں ضروری ہیں۔ کہ جب تک وہ شرطیں نہ ہوں تب تک اس کی تقلید کرنا جائز نہیں ہے۔

اوّل یہ کہ مرد ہو، بالغ وعاقل ہو۔ شیعہ اثنا عشری اور حلال زادہ ہو۔ زندہ ہو۔ یعنی ابتداء تقلید میت درست نہیں ہے۔ عادل ہو اور اعلم ہو۔ یعنی احکام شرعیہ کے سمجھنے میں دوسرے مجتہدوں سے بالاتر ہو۔ اور اسے شرعی طور سے اس کے مجتہد اور عادل ہونے کا ثبوت ملے۔

اصولِ دین مثلاً توحید، عدل، نبوت، امامت وغیرہ میں تقلید کرنا واجب نہیں۔ کیونکہ اس میں اعتقاد اور یقین ضروری ہے۔ خود اپنی فہم ولیاقت سے اصولِ دین کو سمجھنا چاہئے۔ البتہ فروعِ دین مثلاً نماز روزے کے مسائل میں تقلید واجب ہے۔ فروع میں تقلیدی مسائل میں شیعہ امام جعفر صادقؑ اور ان کے بعد کے پانچ ائمہ کی تقلید اور پیروی کو واجب جانتے ہیں۔ اور فقہ جعفری پر عمل کرنے ہی میں اپنی نجات مانتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ حضرت علیؑ سے لے کر امام حسن عسکری تک اور اس کے بعد امام مہدی کی غیبت کبریٰ کے بعد سے آج تک جو فقہا کا سلسلہ چلا ہے وہ بالراست سرکار رسالتؐ پر منتہی ہوتا ہے۔ اور اس میں کوئی فصل یا انقطاع واقع نہیں۔

برخلاف اس کے حضرات اہلِ سُنّت چار بڑے فقہاء کی پیروی کرتے ہیں۔اور وہ ہیں۔

(۱) حضرت نعمان ابن ثابت المعروف بہ ابوحنیفہ (۲) امام شافعی (۳) امام احمد ابن حنبل
(۴) امام انس ابن مالک

غرضیکہ شیعہ حضرات میں اجتہاد کا یہ سلسلہ جاری ہے۔اور قیامت تک جاری رہے گا۔جب کہ سُنّی حضرات میں تقلید کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے۔اور وہ ائمہ اربعہ کے بعد کسی کو قابل تقلید نہیں سمجھتے۔

رویت الٰہی :

خدا کی صفات وذات کے معاملے میں سُنّی اور شیعہ تقریباً ہم خیال ہیں۔لیکن بعض ضمنی باتوں میں تھوڑا سا اختلاف پایا جاتا ہے۔انھیں میں سے ایک رویت الٰہی کا مسئلہ ہے۔

فرقۂ امامیہ اس بات کا معتقد ہے کہ خداوندِ عالم نہ دنیا میں دیکھا جاسکتا ہے نہ آخرت میں۔اس لیے کہ جو نہ جسم ہو نہ کسی جسم میں حلول کئے ہو۔نہ کسی جہت یا مکان یا جگہ میں واقع ہو۔نہ آمنے سامنے ہو۔اس کا دیکھا جانا ممکن نہیں۔لہٰذا شیعہ رویت الٰہی کے انکار کو عقلی دلیل سے یوں ثابت کرتے ہیں کہ رویت کے واسطے چند شرطیں ہیں۔اوّل یہ کہ جس شئے کو دیکھنا چاہتے ہیں وہ وجود رکھتی ہو۔دوسرے اس میں کوئی رنگ بھی پایا جائے۔تیسرے یہ کہ درمیان میں کوئی شئے حاجب اور مانع نہ ہو۔چوتھے وہ کسی جگہ پر قائم ہو۔پانچویں محسوسات سے ہو۔چھٹے نگاہ وہاں تک پہنچ سکتی ہو۔اور ساتویں اس میں اس قدر نورانیت نہ ہو۔جو آنکھوں کو خیرہ کرے۔آٹھویں بہت پست و بلند نہ ہو۔نویں زور و حرکت نہ ہو۔اور دسویں زیادہ دور نہ ہو۔کہ اس سے باتیں نہ ہوں گی۔دیکھنا ممکن نہ ہوگا۔

اس کے علاوہ فرقۂ امامیہ اس عقیدہ کی دلیل میں کلام مجید کی آیتیں اور احادیث رسول بھی پیش کرتا ہے۔مثلاً:

ارشادِ خداوندی ہے۔ لا تدرکه الابصار وهو یدرك الابصار۔
(اس کو نگاہیں نہیں دیکھ سکتیں۔وہ نگاہوں کو دیکھتا ہے۔)

اسی طرح حضرت موسیٰ سے خطاب کر کے خدا کا ارشاد ہے۔

لَن ترانی ولکن انظرالی الجبل فان استقرمکانه فسوف ترانی

(تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔البتہ تم اس پہاڑ کی طرف دیکھو اگر یہ اپنی جگہ قائم رہے تو ممکن ہے مجھے تم دیکھ لو۔) اور قرآن گواہ ہے کہ جب موسیٰ نے اس پہاڑ پر نظر ڈالی تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا۔اور جناب موسیٰ غش کھا کر گر پڑے۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔لن نومن لك حتی نرالله جهرة فاخذتهم الصاعقه مظلمهم (اور وہ وقت بھی یاد کرو جب اے بنی اسرائیل تم نے موسیٰ سے کہا تھا کہ اے موسیٰ ہم تم پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک خدا کو ظاہر بظاہر نہ دیکھ لیں۔اس پر تمہیں بجلی نے جلا ڈالا۔اور تم تکتے ہی رہ گئے۔ پارہ ۱ رکوع ۶۔

اس کے برخلاف حضرات اہل سُنّت خدا کے دیدار کے قائل ہیں۔اور وہ بھی اپنے عقیدے کی دلیل میں یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ کا خدا کے دیدار کی تمنا کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا کا دیدار ممکن ہے۔اگر دیدار ناممکن ہوتا تو موسیٰ کا یہ فعل لغو ہوتا۔اور انبیاء کرام سے لغو کا صادر ہونا ناممکن ہے۔

ایک اور آیت بھی اس خیال کی تائید میں سُنّیوں کی جانب سے پیش کی جاتی ہے۔وہ یہ کہ خدا وندِ عالم نے جنت والوں کی تعریف میں کہا۔

وُجُوهٌ یَومَئِذٍ نَاضِرَةٌ اِلٰی ربها نَاظِرَةٌ (شاداب چہرے اپنے پروردگار کی طرف دیکھ رہے ہوں گے) اِلٰی رَبِّها ناظرة کا مقصود یہ ہے کہ خدا ضرور دکھائی دے گا شیعہ کہتے ہیں کہ کسی چیز کی طرف نظر کرنے سے یہ ضروری نہیں کہ وہ چیز دکھائی بھی دے جائے۔

بہرحال اس مسئلہ میں صرف معتزلہ شیعوں کے ہم خیال وہم عقیدہ ہیں۔ورنہ محدثین، اشاعرہ اور حضرات اہلِ سنت سب اس بات کے معتقد ہیں کہ خدا کا دیدار دنیا میں ممکن ہے۔اور آخرت میں یقیناً ہوگا ہی۔ (اصلاح اکتوبر ۱۹۷۲ء رسالہ شیعہ امامیہ ص ۱۴۸-۱۴۶)

جبر و اختیار اور قضاوقدر :

شیعوں اور سنیوں کے درمیان ایک اور اختلافی مسئلہ۔مسئلہ جبر و اختیار ہے۔شیعوں کا

عقیدہ ان کے اصولِ دین کی ایک شاخ عدل سے متعلق ہے۔ چونکہ شیعہ خدائے تعالیٰ کو عادلِ مطلق مانتے ہیں۔ اوران کا خیال ہے کہ اس سے کوئی ایسا فعل سرزد نہیں ہوتا۔ جس سے کسی قسم کی ناانصافی اور جبرواکراہ ظاہر ہو۔ لہٰذا بندہ اپنے ذاتی افعال کے انتخاب میں خود ہی مختار ہوتا ہے۔ یعنی انسان جو کچھ کرتا ہے۔ خود اپنے اختیار وارادہ سے کرتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہر فعل کے پیچھے قضاوقدرِ الٰہی موجود رہتی ہے۔ لیکن یہ لازمی وحتمی نہیں۔ کیوں کہ شیعوں کے اعتقاد کے مطابق اگر ایسا ہوتا تو عذاب وثواب غلط تھا۔ جنت کا وعدہ، جہنم کی دھمکی بے کار تھی نہ نیکوکار بدکار کے مقابلہ میں مدح وستائش کا سزاوار ہوتا نہ بدکار۔ نیکوکار کے مقابلے میں مذمت کا حق دار۔

لہٰذا شیعہ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ بے شک خدا نے حکم دیا ہے۔ مگر عمل میں اختیار دیا ہے۔ اور روکا ہے۔ مگر تنبیہہ کے طور پر، جبر کے طور پر نہیں۔ اس کی نافرمانی اس لیے نہیں ہوتی کہ وہ بے بس ہو چکا ہے۔ اور نہ اس کی اطاعت اس لیے کی جاتی ہے کہ اس نے مجبور کر رکھا ہے۔ اس نے رسول بے کار نہیں بھیجے۔

قضاوقدر سے مراد خدا کا امر اور حکم ہے۔ لیکن خدا کے حکم دینے کا یہ مطلب نہیں کہ اس نے بندے کو مجبور کر دیا ہے۔ اور اس کا اختیار چھین لیا ہے۔ خداوند عالم امر فرماتا ہے۔ حکم دیتا ہے۔ لیکن بندے کی آزادی باقی رہتی ہے کہ خواہ خدا کا حکم بجالائے یا اس کے حکم کی نافرمانی کرے۔

(بحوالہ اصلاح اکتوبر ۱۹۷۲ء رسالہ شیعہ امامیہ)

جبرواختیار کا یہ مسئلہ اسلام کے مشکل مسائل میں شمار ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آیا انسان اپنے افعال میں مجبور ہے۔ یا خودمختار۔ حکمائے یونان کا نظریہ یہ تھا کہ انسان اپنے افعال میں مجبورِ محض ہے۔ اور وہ اس کے لیے عقلی دلائل پیش کرتے تھے۔ عیسائی علماء نے یہ خیال ظاہر کیا کہ انسان اپنے افعال میں آزاد ہے۔ یہ بحث آگے چل کر زور پکڑتی گئی۔ یہاں تک کہ دو گروپ بن گئے۔ ایک یہ کہتے تھے کہ انسان اپنے افعال میں مجبور ہے۔ اور دوسرا گروہ یہ کہتا تھا کہ وہ آزاد ہے۔ ظہورِ اسلام کے بعد اس مسئلے نے اور تقویت حاصل کی۔ اور یہ سوال پیدا ہوا کہ خدا کی طرف سے انسان پر کہاں تک جبر ہے؟ نیز یہ کہ انسان کہاں تک آزاد ہے۔ شبلی لکھتے ہیں :

''دوسرے اختلافات (جبروقدر) کا منشاء یہ تھا کہ انسان کے افعال کو اگر زیادہ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک چیز بھی ہمارے بس کی بات نہیں۔ یہاں تک کہ ہمارا ارادہ اور خواہش بھی اختیاری نہیں۔ لیکن یہ مشکل ہے کہ اگر ہم اپنے افعال میں مجبور ہیں تو ثواب وعذاب جو مذہب کی جان ہے۔ اس کی بنیاد اکھڑ جاتی ہے۔ قرآن مجید میں دونوں قسم کی آیتیں ہیں۔ بعض میں صاف تصریح ہے کہ انسان جو کچھ کرتا ہے خدا ہی کراتا ہے۔ قل کان من عنداللہ بعض کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے فعل کا آپ ذمہ دار ہے۔ مَا اَصَابَکَ مِن سیئۃ فمن نفسک ۔ اس بناء پر اسلام میں دورائیں قائم ہوگئیں۔'' (الکلام حصہ اوّل صفحہ ۲۱)

آغا سلطان مرزا دہلوی اپنی تالیف ''نورالمشرقین من حیات الصادقین''۔ حصہ اول ودوم میں صفحہ ۱۴ پر پوری آیت کی تصریح یوں کرتے ہیں۔

وَان تَصِبهَمُ حَسَنَة يَقُوُ لو هذ من عندالله وَان تصبهُمَ سيُته بقولو هذه مِن عندك مل كل من عندالله ط فمالِ هؤُ لآءِ لقوم لا يكادون يفقهون حديثاً وَماَاصَابك من حَسنَه فمن الله وما اصابكَ من سيّئة فمن نفسك

(۴ = ۷۸-۷۹)

(ان لوگوں کو اگر اچھائی پہنچتی تھی تو وہ کہتے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ اور اگر برائی پہنچتی تھی تو کہہ دیتے تھے کہ یہ رسول کی طرف سے (نحوست) ہے۔ خدا نے فرمایا کہ کہہ دے سب کچھ خدا کی طرف سے ہے۔ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات ہی نہیں سمجھتے حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ اگر اچھی بات ہو تو سمجھو کہ خدا کی طرف سے ہے۔ اور بری بات یعنی مصیبت یا تکلیف پہنچے تو تمھارے نفس کی طرف سے ہے۔ یعنی تمھارے افعال اور گناہوں کا نتیجہ ہے۔)

اس کے بعد لکھتے ہیں:

''مولوی شبلی جیسا مورخ بھی اس بات کے سمجھنے سے قاصر رہا کہ فعل ونتیجۂ فعل میں فرق ہے۔ فعل میرے اختیار میں ہے۔ اور نتیجۂ فعل میرے اختیار میں نہیں

ہے۔ آیاتِ متذکرۂ بالا میں بھی نتیجہ سے بحث ہے۔ فعل سے بحث نہیں۔
اچھائی یا برائی جو انسان کو پہنچتی ہے اس کی نسبت کہا گیا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ہے فعل کو نہیں کہا گیا ہے کہ تم سے جو فعل سرزد ہوا وہ خدا نے کرایا۔ خداوند تعالیٰ قادرِ مطلق ہے۔ اگر وہ چاہے تو ہم کتنا ہی عاقلانہ فعل کریں اس کا نتیجہ ہمارے لیے مفید نہ نکلے''۔ (دیباچہ نور المشرق حصہ اوّل ص ۱۵)

اس سے ظاہر ہے کہ انسان اپنی مرضی اور اپنے افعال میں اس طرح آزاد نہیں۔ جس طرح جانور یا دیوانے آزاد ہیں۔ اس کی اس آزادی کو محدود کرنے والے مندرجہ ذیل امور ہیں۔

(۱) قانون (۲) مذہب (۳) اخلاقیات (۴) رسومات (۵) ماحول۔

لیکن یہ چیزیں انسان کے فعل کی آزادی کو براہ راست سلب نہیں کرتیں۔ یہ نہیں کہ اس نے کسی فعل کا ارادہ کیا تو مجبوراً قانون ایک مہیب دیو کی شکل میں آ کر اس کا ہاتھ پکڑ لے گا۔ یا اس نے زنا کا ارادہ کیا تو مذہب و دوزخ کی آگ فوراً اسے جلانے نہیں چلی آئے گی ...... یہ سب چیزیں اس کی فعل کی آزادی کے ارادے کے ذریعہ سے سلب کرتی ہیں۔ پہلے وہ اس کے ارادے پر اثر ڈالیں گی۔ اور پھر اس کا ارادہ اس کو روکے یا نہ روکے۔ معلوم ہوا کہ ارادہ تو ہمیشہ آزاد ہے۔ اور آزاد رہے گا۔ وہ آزاد ہے کہ ان چیزوں سے اثر لے یا نہ لے.... نتیجہ نکلا کہ قانون، رسومات ماحول و مذہب اگرچہ نہایت طاقتور عوامل ہیں۔ لیکن بذات خود کچھ نہیں کر سکتے۔ صرف ارادے کے ذریعہ سے انسان کے فعل پر اثر ڈال سکتے ہیں۔ (ایضاً ص ۱۳ (دیباچہ نور المشرق)

لہٰذا شیعہ یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ انسان اپنے فعل میں آزاد ہے۔ سزا و جزا، ثواب و عذاب جو اسلام کا رکن محکم ہے۔ بغیر آزادیٔ عمل کے ناممکن ہے۔ اور خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ عمل نیک اور ایمان والوں کو جنت کا وعدہ دیا گیا ہے۔ اور بغیر عملِ نیک ناممکن ہے ثابت ہوا کہ انسان کے افعال پر خدا کی طرف سے کوئی جبر نہیں۔

بدا:

ایک اور مسئلہ جو تمام مورخین کے خیال کے مطابق شیعوں کا مخصوص مسئلہ ہے وہ ہے بداء۔

جس کو اہلِ سنت نے بڑا شرمناک عقیدہ بنا کر پیش کیا ہے۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز دہلوی تحفۂ اثنا عشریہ میں لکھتے ہیں:

''حاصل بداء کا وہ ہے کہ حق تعالیٰ ایک چیز کا ارادہ فرمائے مصلحت دوسری چیز میں ظاہر ہو کہ قبل اس کے ظاہر نہ تھی۔ پس ارادۂ اول کو منسخ اور دوسرے کا ارادہ کرے۔ اس بات سے لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ناعاقبت اندیش ہے اور انجام کاموں کو نہیں جانتا۔ تعالیٰ عن ذلك علواً كبيراً برتر ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب باتوں سے''۔

اس سے قبل کے شاہ صاحب کے اس بیان کی تردید یا تائید میں کچھ کہا جائے۔ یہ لازم ہو جاتا ہے کہ لفظ بداء کے معنی معلوم کیے جائیں۔ کہ آیا یہ لفظ کن کن معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

قرآن مجید اور حدیثوں میں ارشادِ الٰہی ہے۔

وَبدالهم من الله مالم يكونو يحسَبون۔

(ان کے لیے اللہ کی طرف سے وہ بات ظاہر ہوئی جس کا ان کو خیال بھی نہ تھا۔)

وَبدالهم سئيات ماكسبوا۔

(ان کو اپنے کرتوتوں کی خرابیاں معلوم ہوئیں۔)

ان دونوں آیتوں میں بداء کے معنی ظاہر اور واضح ہونے کے ہیں۔ اور کبھی کبھی اس لفظ سے ارادے میں تغیر و تبدل بھی سمجھا جاتا ہے۔ جو نتیجہ ہوتا ہے۔ علم میں تغیر کا۔ یعنی علم کے بدل جانے سے ارادے کا بدل جانا''۔ (رسالہ شیعہ امامیہ ص ۲۰۱)

اہلِ سنت مدعی ہیں کہ شیعہ انھیں معنوں میں بداء کے قائل اور اللہ کے لیے اس کو جائز سمجھتے ہیں۔ اور مختار ثقفی اسی بداء کے قائل تھے۔ اور انھوں نے ہی اس نظریہ کو عام کیا۔

تیسرے معنی بداء کے یہ ہیں کہ ایک چیز کو کسی دوسری چیز پر معلق رکھنا۔ لیکن بداء کے یہ معنی جیسے شاہ صاحب بیان کرتے ہیں۔ یعنی علم کے بدل جانے کی وجہ سے خدا کا ارادہ بدل جائے۔ شیعوں کے یہاں ہرگز ہرگز نہیں اور کوئی بھی شیعہ اس خیال کا قائل نہیں۔

البتہ بقیہ دونوں معنوں کے لحاظ سے بداء اللہ کے لیے جائز ہے۔ اور شیعہ اس کے قائل

ہیں۔ بداء کی تفسیر میں محمد بن مسلم کی روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ جس چیز کو چاہتا ہے۔ مقدم کرتا ہے۔ اور جس کو چاہتا ہے موخر کرتا ہے۔ لہٰذا شیعوں کے نزدیک بداء کا اقرار کرنا اس بات کا اقرار کرنا ہے کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ مردہ کرنے کے بعد زندہ بھی کرسکتا ہے۔ دولت مند بنانے کے بعد نادار بنا سکتا ہے۔ تندرست کرکے بیمار بنا سکتا ہے۔ علم ورزق میں اضافہ کرسکتا ہے۔ کیونکہ یہ سب باتیں قضائے الٰہی ہیں۔ وہ قادر مطلق ہے۔ اور وہ جانتا ہے کہ کس وقت، کس چیز کی ضرورت ہے۔ اور کس شخص کے لیے کب کون سا حکم مناسب ہے۔ لہٰذا اس وقت یا اس شخص کی مصلحت کے مطابق اپنے معین کردہ امور میں رد و بدل کردیتا ہے۔ جیسے حضرت موسیٰ کے لیے پہلے تیس راتوں کا وعدہ کیا۔ بعد کو اس کو بدل کر چالیس راتیں کردیں۔ یا پہلے مسلمانوں کے لیے قبلہ خود ہی بیت المقدس کو قرار دیا۔ بعد میں کعبہ کی تعمیر کا حکم دیا۔ پہلے اسمٰعیلؑ کی قربانی طلب کی بعد کو آپ ہی اس کو بدل کر ذبح عظیم پر چھوڑ دیا۔ وہ جس وقت کسی امر کے صادر کرنے کا ارادہ کرتا ہے انبیاء کے ذریعہ اس کو واقع کردیتا ہے۔ اور جب اس کے اٹھا لینے میں مصلحت دیکھتا ہے اس کو ہٹا دیتا ہے۔ جیسے ایک مذہب کو منسوخ کرکے دوسرا مذہب جاری کردینا ایک پیغمبر کے بعد دوسرے پیغمبر کا بھیجنا۔ کچھ زمانہ تک شراب کو حرام نہ کرنا۔ بعد کو حرام کردینا''۔

(رسالہ شیعہ امامیہ ۲۰۲)

ابوزہرہ کہتے ہیں کہ ''شیعہ بداء کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ اللہ ایک بات جانتا ہے۔ اس کو مقدر کرتا ہے۔ پھر اپنی جانی ہوئی بات کو منسوخ کردیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا علم وارادے بدلتے رہتے ہیں۔ ان میں تغیر ہوتا رہتا ہے۔'' (ابوزہرہ۔ الامام الصادق) بحوالہ شیعہ امامیہ صفحہ ۲۰۹)

شاہ عبدالعزیز کی طرح ابوزہرہ بھی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ شیعی ائمہ کرام وعلمائے دین کے ہاں بداء کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں۔ اس کا ثبوت شیعی علمائے کرام کی کتابیں ہیں۔

شیخ صدوق محمد ابن بابویہ قمی ''کتاب التوحید'' میں لکھتے ہیں:

لیس البداء کما نطینه جهال الناس بانه بداء ندامة تعالی الله عن ذلك علواکبیراً۔

(بداء اس طرح نہیں ہے جس طرح ناواقف حضرات خیال کرتے ہیں کہ وہ پشیمانی کا نتیجہ

ہو۔ خدا کی ذات اس سے بہت بلند و برتر ہے۔ (نگار جنوری ۳۸ء ص ۱۳۸)

ایک اور شیعی عالم شیخ الطائفہ محمد ابن الحسن الطوسی نے ''کتاب الغیبہ'' میں بداء کی روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''ان احادیث کے معنی وہی ہیں جو ہم نے بیان کئے ہیں کہ مصلحت کے بدلنے کے ساتھ احکام میں تبدیلی ہوتی ہے۔ نہ یہ کہ خدا کو جو بات معلوم نہ تھی۔ وہ معلوم ہوئی ہے۔ اس کے نہ ہم قائل ہیں اور نہ جائز سمجھتے ہیں۔ خدا کی ذات اس سے بہت بزرگ و برتر ہے''۔

ہندوستان میں مذہب شیعہ کے سب سے بڑے مجتہد مولانا السید دلدار علی طاب ثراہ غفران مآب تھے۔ انھوں نے اپنی مشہور کتاب ''عماد الاسلام'' میں اس کو نہایت وضاحت سے لکھا ہے:

''بداء الف ممدودہ کے ساتھ لغت میں اس کے معنی ہیں۔ ایک ایسی رائے کا ظاہر ہونا جو پہلے ظاہر نہ تھی۔ یہ معنی بداء کے صحاح جوہری میں مذکور ہیں۔ اور یہ وہ معنی ہیں کہ جن کے لحاظ سے بداء کی نسبت خداوند عالم کی طرف دشوار ہے۔ کیونکہ اس کا لازمہ ہے۔ یہ کہ خدا کا علم حادث ہوا۔ اور وہ اس سے پہلے ناواقف ہو۔ اسی بنا پر اکثر مخالفین نے اس فرقۂ امامیہ کے خلاف طعن و تشنیع سے کام لیا ہے۔ اسلیے کہ انھوں نے صرف اس لفظ کے ظاہری معنی کا لحاظ کیا۔ اور اصلی مقصود کی تحلیق نہیں کی۔ جواب ان کا یہ ہے کہ ان لوگوں کا اعتراض ہم پر یا تو لفظ بداء کے ظاہری معنی کے اعتبار سے ہے اور بظاہر حقیقت یہی ہے۔ یا اس اعتبار سے ہے کہ شرع میں لفظ بداء کا چاہے وہ کسی دوسرے معنی سے ہو۔ خدا کے علم یا اس کے فعل کے بارے میں اطلاق نہیں ہوا ہے۔ اور یا اس لحاظ سے ہے کہ اس لفظ کے مجازی معنی بھی خدا کے حق میں درست نہیں ہیں۔ اگر پہلی صورت کے لحاظ سے اعتراض ہے تو بالکل غلط ہے۔ کیونکہ کوئی شخص علمائے امامیہ میں سے اس کا قائل نہیں ہے۔ اور آئمہ معصومین علیہم السلام کے احادیث اور متقدمین علمائے شیعہ کے اقوال کے خلاف ظاہر کررہے ہیں۔''

(نگار جنوری ۱۹۳۸ء ص ۱۳۸)

شیعی فرقے کے معتبر احادیث بھی بداء کے نظریے کو اس طرح واضح کرتے ہیں۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

''جو شخص گمان کرے کہ خدا کی رائے میں تبدیلی رہتی ہے۔ اس طرح کہ اسے کسی شئی کا علم حاصل ہو جاتا ہے۔ جو پہلے حاصل نہ تھا۔ اس سے میں برأت کرتا ہوں''۔ (نگار جنوری ۱۹۳۸ء ص ۱۳۸)

دوسری حدیث میں آپ ہی کا ارشاد ہے:

''جس امر کا خدا ارادہ کرتا ہے۔ وہ اس کے علم میں ہوتا ہے۔ اس کام کے کرنے سے پہلے اور کوئی تغیر وہ کائنات میں نہیں کرتا۔ مگر یہ کہ وہ اس کے علم میں پہلے سے ہوتا ہے۔ بے شک خدا کو بداء جہالت کی وجہ سے نہیں حاصل ہوتا''۔ (نگار جنوری ۱۹۳۸ء ص ۱۳۸)

تیسری حدیث ہے:

''خدا کے مقرر کردہ نظام میں کسی شئی کی نسبت تغیر نہیں ہوتا۔ مگر وہ اس کے علم میں ہوتا ہے۔ اس تغیر کرنے سے پہلے''۔ (نگار جنوری ۱۹۳۸ء ص ۱۳۸)

چوتھی حدیث امام رضاؑ کی ہے:

''جو شخص اس بات کا قائل ہو کہ خدا کو کسی شئی کا علم نہیں ہوتا۔ جب تک کہ وہ شئی موجود نہ ہو جائے۔ وہ کافر ہے''۔ (نگار جنوری ۱۹۳۸ء ص ۱۳۸)

رجعت:

رجعت بھی ایک ایسا نظریہ ہے جس میں شیعہ اور سنی اختلاف رکھتے ہیں۔ رجعت سے مراد واپسی یا لوٹ آنے کو ہیں۔ بعض علمائے اہلِ سنت اس سلسلے میں عجیب رائے رکھتے ہیں۔

فجر الاسلام کا مصنف احمد امین لکھتا ہے:

''شیعوں کو ابتداء روئے زمین پر کوئی ظاہری مملکت قائم کر لینے میں کامیابی نہ

ہو سکی۔ ان کو تکلیفیں دی گئیں۔ اور پراگندہ و منتشر کر دیا گیا۔ تو انھوں نے (ہمارے خیال کے مطابق) امام منتظر اور مہدی وغیرہ کے پُر امید عقائد ایجاد کر لیے۔ تاکہ عوام کی ڈھارس بندھی رہے''۔

(فجر الاسلام ص ۲۷۹)

شیعہ امامیہ کا مصنف لکھتا ہے:

''حقیقت تو یہ ہے کہ رجعت کا قول شیعوں کے معتقدات میں سے نہیں، نہ ان کی ضروریات مذہب سے ہے۔ اور اس سلسلہ میں شیعوں کے یہاں جو حدیثیں ملتی ہیں ان کی تاویل کرنا لازمی ہے۔ یعنی ان حدیثوں کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت حجت کے ظہور فرمانے پر ائمہ کا اقتدار پلٹ آئے گا''۔

(شیعہ امامیہ ص ۲۱۱)

البتہ مولوی سید مظہر حسن سہارنپوری رجعت کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

''مراد اس سے یہ ہے کہ بہت سے کفار اشراء و مومن و دیندار کہ پہلے مر چکے ہوں گے۔ بحکم خدائے جبار اس وقت زندہ کئے جاویں گے تاکہ کفار اپنے اعمال بد کی دنیا میں بھی سزا پاویں۔ اور مومن مذہب حق کا تسلط اور سامان شادمانی دیکھ کر خوش ہوں''۔

اس ضمن میں وہ قرآن شریف کی دو آیتیں بھی پیش کرتے ہیں۔

(۱) یَوْمَ نحشر من کلّ امّۃٍ فوجاً ممّن یکذّب بآیاتنا۔

(وہ روز جبکہ ہم محشور کریں گے ہم ہر ایک امت سے ایک گروہ کو ان لوگوں سے جو ہماری نشانیوں کو جھٹلاتے ہیں۔)

(۲) وَحَشَرْ ناھم فلم نغادر منھم احداً۔

(محشور کریں گے ہم ان کو اور کسی کو بھی بغیر حشر کئے نہ چھوڑیں گے)

لہٰذا مولوی موصوف اعتقاد رجعت کو ضروریات مذہب شیعہ میں سے سمجھتے ہیں۔

(الایمان ملقب بہ مظہر ضمیریہ ص ۲۲۰)

مولوی فرمان علی نے اپنے مشہور عکسی قرآن مجید کے ترجمہ اور تفسیر میں مندرجہ ذیل دو آیتوں کے ذریعہ رجعت کی حمایت میں دلیلیں پیش کی ہیں۔

(۱) پارہ ۲ سورہ بقرہ آیت ۱۴۹ صفحہ ۳۵

اَیْنَ مَاتَکُوج نُوْ ایَاْتِ بِکُمُ اللّٰہُ جمیعاً ہ

(تم جہاں کہیں ہو گے خدا تم سب کو اپنی طرف لے آوے گا۔)

مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ اس سے اشارہ ہے رجعت اور ظہور امامِ عصر مہدی آخرالزمان کی طرف۔

(۲) پارہ ۲۴ سورہ مومن آیت ۱۱ صفحہ ۷۴۷

اِنَّ الّذِیْنَ کَفَرُوَ ایُنَادَوْنَ لَمَقْتُ اللہِ اَکْبَرُ مِنْ مَّقْتِکُمْ اَنْفُسَکُمْ اِذْتُدْ عَوْنَ اِلَی الْاِیْمَانِ فَتَکْفُرُوْنَ ہ قَالُوْ ارَبَّنَا اَمَتَّنَا اثْنَتَیْنِ وَاَحْیَیْتَنَا اثْنَتَیْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوبِنَا فَھَلْ اِلیٰ خُرُوْ جٍ مِّنْ سَبِیْلٍ ہ

(ہاں) جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان سے پکار کر کہہ دیا جائے گا کہ جتنا تم (آج) اپنی جان سے بیزار ہو۔ اس سے بڑھ کر خدا تم سے بیزار تھا۔ جب تم ایمان کی طرف بلائے گئے تو کفر کرتے تھے۔ وہ لوگ کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! تم ہم کو دوبارہ مار چکا اور دوبارہ زندہ کر چکا۔ تو اب ہم اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہیں۔ تو کیا (یہاں سے) نکلنے کی بھی کوئی سبیل ہے؟)

حاشیہ میں مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ اس کی تفسیر میں مفسرین میں اختلاف ہے۔ کہ کفارہ کا قیامت میں دوبارہ زندہ کرنے اور دوبارہ مارنے کی شکایت سے کیا مراد ہے۔ بعض پہلی موت نطفہ کی حالت اور دوسری موت مرنے کو خیال کرتے ہیں۔ پہلی زندگی پیدا ہونے اور دوسری زندگی قیامت کی زندگی کو سمجھتے ہیں۔ بعض پہلی موت دنیا کی اور دوسری قیامت کے قبل کی۔ اور پہلی زندگی دنیا کی اور دوسری قبر میں سوال و جواب کی مراد لیتے ہیں۔ لیکن مولوی فرمان علی فرماتے ہیں:

"پہلی موت سے رجعت کے بعد کی اور پہلی مرتبہ زندہ کرنے سے رجعت کا زندہ کرنا۔ اور دوسری دفعہ زندہ کرنے سے قیامت میں زندہ کرنا"۔ مراد ہے۔

بہر حال مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ رجعت اگر شیعوں کے ہاں موجود ہے بھی تو خاص طور پر امامِ آخر مہدی علیہ السلام کے غیبت سے ظہور فرمانے اور دنیا میں اسلامی اقتدار کے دوبارہ پلٹ آنے اور کفاروں کے کیفر کردار تک پہنچنے کا نام ہے۔

تقیہ :

تقیہ وہ خاص عمل ہے جو شیعوں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ تقیہ کی مختلف تشریحات کی گئی ہیں۔ عمر ابوالنصر نے اپنی تصنیف "کربلا سے پہلے" میں صفحہ ۵۳ کے حاشیے میں تقیہ کی وضاحت یوں کی ہے۔

"تقیہ کا مطلب چوری چھپے اپنا کام چلانا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی جان و مال یا عزت بچانے کی خاطر ایسے عقیدے کا اظہار کرلے جسے دل سے وہ صحیح نہ سمجھتا ہو۔ یا وہ کسی مذہب کا پیرو ہو۔ لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے وہ اپنا مذہب وعقیدہ ظاہر نہ کر سکے۔ اور اس کی بجائے کوئی دوسرا عقیدہ ظاہر کرے اسے تقیہ کہتے ہیں۔

اسی طرح فجر الاسلام کے صفحہ ۲۷۰ کے حاشیے پر تحریر ہے۔

"تقیہ سے مراد ظاہری مدارات ہے۔ مثلاً کوئی شخص اپنی جان، آبرو اور مال کی حفاظت کے لیے بظاہر ایسا عقیدہ رکھتا یا ایسا عمل کرتا ہے۔ جسے وہ صحیح نہیں سمجھتا چنانچہ جو شخص کسی دین اور مذہب کا متبع ہو۔ لیکن وہ اسے ظاہر نہ کر سکے تو تقیہ کے طور پر اس کے خلاف ظاہر کر سکتا ہے۔ کفار اور ظالم لوگوں کے ساتھ مدارات اور تبسم کے ساتھ پیش آنے کو یہ لوگ تقیہ شمار کرتے ہیں۔ شیعہ، خوارج اور اہلِ سنت کا اس بارے میں اختلاف ہے۔ اکثر شیعہ اپنے شیعہ ہونے کو چھپاتے تھے۔ اور خفیہ طور پر کام کرتے تھے لیکن اکثر خوارج کا یہ قول تھا کہ تقیہ جائز نہیں ہے..... اہلِ سنت نے درمیانی راہ اختیار کی۔ وہ کہتے ہیں جسے اپنے عقیدے کی وجہ سے اپنی جان و مال کا خوف ہو تو اس شہر سے ہجرت کر لینی

چاہئے۔ لیکن ہجرت نہ کرسکتا ہوتو بقدرِ ضرورت تقیہ کرسکتا ہے"۔
مجمع بحارالانوار جلد اوّل صفحہ ۱۴۳ پر تقیہ کے معنی میں لکھا ہے۔

التقیه والتقاة بمعنی بریدانهمه ینقون بعضهم بعضاویظهرون الصلح وَبلاتفاق وَباطنهم بخلاف دالك

(تقیہ اور تقاۃ کے معنی یہ ہیں کہ وہ لوگ ڈرتے ہیں۔ اور بچتے ہیں۔ ایک دوسرے سے اور ظاہر کرتے ہیں صلح واتفاق کو اور ان کا باطن اس کے برخلاف ہوتا ہے) (شعلہ نور ص ۲۱۲)

شاہ صاحب تحفہ باب المکابد کید ۳ میں حضرت ابراہیم خلیل کے تین جھوٹ کی بابت لکھتے ہیں کہ جہاں خوفِ جان و مال و آبرو ہو۔ صریح جھوٹ بھی جائز ہے، صفحہ ۱۹۱) (شعلہ نور ۲۱۲)

عمدۃ القاری شرح بخاری المعروف بہ عینی جلد ہفتم میں ہے۔

وَاتفق الفقهاء علیٰ ان الکزب جائز بل واجب فی بعض المقامات
(صفحہ ۳۵۳)

(اتفاق فقہا ہے کہ جھوٹ بولنا جائز ہے۔ بلکہ واجب ہے۔ بعض مقامات پر)

حسن بصری کا قول ہے کہ التقیه الیٰ یوم القیامة۔ یعنی حکم تقیہ تا روز قیامت ہے۔

صحیح بخاری مطبوعہ بمبئی ۱۲۸۸ھ کے حاشیے پر ہے۔

"حکم تقیہ ثابت ہے۔ قیامت تک اور آنحضرت کے عہد برکت عہد سے خاص نہ تھا"۔ (صفحہ ۱۰۸)

پارہ ۱۹ سورۂ شعراء میں آیۂ وفعلت فعلتک التی فعلت کی تفسیر میں یہ عبارت درج ہے۔

فانه عالیه الصلوٰة والسلام یعا یشهم بالتقیه (بیضاوی جلد دوم ۸۴)

(حضرت موسیٰ زمانۂ قیام میں فرعون کے پاس تقیہ سے رہتے تھے۔

اسی طرح اصحاب حضرت عیسیٰ کا تقیہ سورۂ یٰسین ۲۲ میں مذکور ہے۔

آیت- وَاضرِب لَهُمْ مَثَلاً کی تفسیر بیضاوی وحسینی وغیرہ میں ملاحظہ ہو کہ پہلے دو صحابی حضرت عیسیٰ جب محبوس ہو گئے اور تیسرے حضرت شمعون جب بھیجے گئے تو انھوں نے اپنا دین چھپا کر یہ ظاہر کیا کہ میرا دین بادشاہ کا ہے۔ اور کنیسہ میں جا کر بظاہر عبادت

بتاں و بباطن اطاعتِ خداوندِ رحمن کرتے تھے۔ اور وہ دونوں رسول بھی وہیں حبس تھے۔ پھر بادشاہ کے سامنے ان دونوں سے مناظرے کے وقت فرمایا۔ اگر تمہارا خدا مردا جلادے تو میں بھی تمہارے دین میں آجاؤں۔ انھوں نے دعا کی وہ زندہ ہوگیا۔ اس تقیہ کی ترکیب سے اہلِ قریہ کو مسلمان اور دونوں رسول کو قید سے چھڑایا۔

خود حضور اکرم چالیس برس تک غار حرا میں چھپ کر عبادت کرتے رہے۔ اور اپنے دین کا اظہار نہ کیا۔ بعدِ وفات رسول اہلِ بیت و محبانِ اہلِ بیت پر بنوامیہ کے مظالم بے انتہا بڑھ گئے۔ لہٰذا اکثر شیعوں نے تقیہ اختیار کیا۔

عمر ابوالنصر رقم طراز ہے۔

"چونکہ اکثر شیعہ تقیہ اختیار کرنے کے عادی تھے۔ اس لیے بنوامیہ کی نظروں میں وہ خوارج سے زیادہ خطرناک تھے۔ انھوں نے شیعہ اکابر کی نگرانی کرنے اور ان کے خفیہ ارادوں کا پتہ چلانے کے لیے اپنے جاسوس مقرر کر رکھے تھے۔ عوام میں سے جس شخص کے متعلق یہ معلوم ہوتا کہ وہ شیعہ خیالات رکھتا ہے۔ اسے قید کرلیا جاتا اور اس کا مال و اسباب چھین لیا جاتا۔ عبیداللہ قاتلِ حسینؑ کے زمانہ میں تو یہ سختی اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ ذرا ذرا سے شک پر اہلِ بیت اور ان کے حامیوں کو گرفتار کرلیا جاتا اور انھیں سخت اذیتیں پہنچائی جاتیں۔ حتیٰ کہ ہاتھ اور پیر کاٹنے سے بھی دریغ نہ کیا جاتا"۔

(بحوالہ اصلاح ۱۱ ص ۲۲)

قرآن مجید کھلے طور پر تقیہ کا حکم دے رہا ہے۔

لَایَتَخِذُ المومنون الکافرِینَ اَولِیَاء من دون المومنین وَمَنْ یَفعل ذٰلك فلیس من اللّٰهِ فی شیٔ الان تتقوا منهم تقیه۔

(مومنوں کو چاہئے کہ کفار سے دوستی نہ کریں۔ مگر یہ کہ تم ان سے تقیہ کرو)

(سورۂ آلِ عمران آیت ۲۸)

علامہ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں:

التقیه جائزة الی یوحد القبامة (تقیہ کرنا قیامت تک جائز رکھا گیا ہے۔)
(صفحہ ۱۲ جلد۲)

صحیح بخاری پارہ ۲۸ کتاب التفسیر صفحہ ۴۵۰ میں ہے۔
وَقَالَ الان تتقوا منهم تقاة وَهِی تقیة (خدا نے فرمایا ہے کہ دشمنوں سے بچنے کے لیے تقیہ کرو۔)
صفحہ ۴۵۰ میں ہے التقیہ الی یوم القیامۃ (تقیہ کرنا قیامت تک جائز اور اسلامی حکم ہے۔)
(تفسیر حاشیہ ص ۱۲۹ عکسی قران مجید از مولوی فرمان علی)

کنز العمال میں ہے۔ لادین لمن لاتقیه له (جو شخص تقیہ نہ کرے اس کا کوئی دین ومذہب ہی نہیں ہے۔ (مطبوعہ حیدرآباد جلدا صفحہ ۱۰۸)

علامہ ابن اثیر جزری لکھتے ہیں۔

ثمدان الله تعالی امرالنبی بعد بعصه بثلاث ان یصدع بمایو مرو کان قبل ذلك فی السنین الثلاث متث ابدعوته لا بظهرها الالمن به فکان اصحابه اذاارادو الصلاة ذهبوا الی اشعاب باستخفوا۔

(پھر خدا نے حضرت رسول کو آپ کی بعثت کے تین سال کے بعد حکم دیا کہ جس مذہب کا انھیں حکم دیا جاتا ہے اس کو ظاہر کریں۔ اور اس کے قبل تین سال تک اپنی دعوت پوشیدہ طور پر کرتے رہتے تھے۔ اور اس کو ظاہر نہیں کرتے تھے۔ مگر اسی شخص پر جس پر آپ کو خاص اعتماد ہوتا تھا۔ اور آپ کے صحابہ جب نماز پڑھنا چاہتے تو پہاڑوں کے دروں میں چلے جاتے۔ اور ہیں پوشیدہ ہو کر اس عبادت کو انجام دیا کرتے تھے"۔
(تاریخ کامل مطبوعہ مصر جلد۲ صفحہ ۲۱)

غرضیکہ شیعوں کے تقیہ کی وجہ بھی محض یہی تھی کہ ہر زمانہ میں ان پر حاکمان وقت نے بے انتہا ظلم وستم ڈھائے۔ اور شیعیت کی بقا کا واحد راستہ یہی تھا کہ شیعہ تقیہ اختیار کر لیتے۔

۷۔ متعه :

شیعی نقطۂ نظر سے نکاح کی دو قسمیں ہیں۔ ایک دائم، دوسری منقطع، یعنی متعہ۔ جو شیعوں

کے ہاں نہ صرف جائز بلکہ کار ثواب ہے۔ ان کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ متعہ حکم خدا اور رسول ہے۔ قرآن مجید پارہ ۵ رکوع اوّل میں ہے۔

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِیْضَةً ط وَلَا
(جن عورتوں سے تم متعہ کرو۔ انھیں جو مہر معین کیا ہے دے دو۔ اور)
جُنَاحَ عَلَیْكُمْ فِیْمَاتَرَاضَیْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِیْضَةِ ط
(مہر کے مقرر ہونے کے بعد اگر آپس میں (کم و بیش پر) راضی ہو جاؤ تو اس میں تم پر کچھ گناہ نہیں ہے) سورۂ نساء آیت ۲۴

شیعوں کا دعویٰ ہے کہ یہ آیت تصریحاً متعہ کے حلال اور جائز ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ اسی وجہ سے اور مصاحف میں علاوہ مصحفِ عثمانی کے اس آیت میں الی اَجَلٍ مُسَمًّی (ایک معین مدت تک) بھی تھا۔ چنانچہ جب ابن عباس کے سامنے یہ آیت پڑھی گئی تو انھوں نے اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی کے ساتھ پڑھا۔ اور جب بی نضرہ وغیرہ نے کہا کہ ہم یوں نہیں پڑھتے تو ابن عباس نے کہا کہ واللہ خدا نے اس آیت کو یوں ہی نازل کیا ہے۔

خود اہلِ سنت کی سب سے معتبر تفسیر (سدی) میں ہے۔

کانت المتعه فی اولا الاسلام وَکانو یقروں هذه الایته فما استمتعتم به مِنْ هن الی اجل مفسمی الآیته

(ابتدائے اسلام (عہد حضرتِ رسولؐ خدا) میں متعہ رائج تھا۔ اور لوگ اس آیت کو اس طرح پڑھتے تھے۔ فما استمتعتم به مِنهَنّ اِلی اجل مسمی ۔یعنی جس مدت کے لیے تم لوگ عورت سے متعہ کرو۔ عن مجاهد فما استمتعتم به منهن قال. یعنی نکاح المتعه یعنی آیته فما استمتعتم کا مطلب عورتوں سے متعہ کا نکاح کرنا ہے۔

سدی سے اس آیت کی تفسیر یوں بیان ہوتی ہے کہ ایک مرد کسی عورت سے ایک مدت کے لیے متعہ کرے۔ جب وہ مدت پوری ہو جائے تو وہ عورت آزاد ہے"۔
(بحوالہ اصلاح ۱۱ جلد ۳۲ ص ۳۳)

حضرت جابر صحابی سے مروی ہے کہ "ہم لوگ جناب رسالتمآبؐ کے عہد میں اور خلافت

ابوبکرؓ کے زمانے میں اورابتدائے خلافتِ عمر میں برابر متعہ کرتے تھے''۔

(تاریخ الخلفاء صفحہ ۱۲۶)(بحوالہ اصلاح ۱۱ جلد ۲۳ص ۳۳)

علامہ سیوطی حضرت عمرؓ کے اولیات میں لکھتے ہیں۔

''حضرت عمرؓ وہ ہیں جنھوں نے پہلی دفعہ متعہ کو حرام کیا''۔(تاریخ الخلفاء صفحہ ۹۳)

مولوی فرمان علی بھی اپنی تفسیر میں حضرت جابر بن عبداللہ سے منقول اس روایت کو تحریر کرتے ہیں کہ ہم لوگ رسالت مآبؐ کے پورے زمانہ میں اور حضرت ابوبکر کی پوری خلافت میں اور حضرت عمر کے نصف زمانۂ خلافت تک برابر متعہ کرتے تھے۔مگر حضرت عمر نے اپنے خلافت کے نصف زمانہ کے بعد متعہ کی ممانعت کا حکم جاری کیا۔اور وہ بھی ان الفاظ سے۔

متعتان کانتا علیٰ عهد رسول اللّٰه وَانا اتهی عنهما واعاقب علیهما۔

(دو متعہ رسالت مآبؐ کے زمانہ میں حلال تھے۔متعہ الحج اور متعۃ النساء۔اور میں ان دونوں کو حرام کرتا ہوں۔اور ان کے کرانے والوں کو سزا دوں گا''۔)

مولوی فرمان علی تفسیر درِ منثور جلد ۲ صفحہ ۱۴۰ تفسیر کبیر جلد ۳ صفحہ ۲۰ مطبوعہ مصر تفسیر کشاف جلد ۱ صفحہ ۳۶۰ معالم التنزیل، مستدرک، تاریخ طبری صحیح مسلم، جمیع بین الصحیحین، عینی شرح صحیح بخاری وغیرہ کے حوالوں کے بعد لکھتے ہیں۔

''ان کے علاوہ یہ تینوں روایتیں اہلِ سنت کی اور بہت سی کتابوں میں مذکور ہیں۔اس کے علاوہ اس آیت کی ناسخ کوئی دوسری آیت قرآن بھر میں نہیں ہے۔اور نہ رسول اللہؐ نے حلال کرنے کے بعد اس کو حرام کیا۔اسی وجہ سے حضرت عمرؓ نے یہ فرمان جاری کیا کہ''میں حرام کرتا ہوں'' ورنہ اگر آیت یا حدیث ہوتی تو ان کا بیان کردینا کافی ہوتا۔''میں حرام کرتا ہوں'' کہنے کی ضرورت نہ ہوتی۔پھر جب نہ کوئی آیت اس کی ناسخ ہے۔اور نہ رسول اللہؐ نے منع کیا ہے۔تو حضرت عمر کو اس کے حرام کردینے کا کوئی حق نہ تھا۔اور نہ ان کے حرام کرادینے سے حرام ہوسکتا ہے۔خود رسول اللہ کو تو احکام خدا میں تغیر وتبدل کا حق تھا ہی نہیں۔دوسرے کو کیونکر ہوسکتا ہے؟''

(تفسیر حاشیہ ص ۱۴۰ عکسی قرآن مجید از مولوی فرمان علی)

لہٰذا متعہ کے جواز میں شیعوں کی یہی دلیل ہے کہ جب یہ خدا اور رسول کا حکم تھا۔اور جس کو خدا اور رسولؐ نے حلال کیا تھا تو اسے حرام قرار دینے کا حق دنیا میں کسی کو نہیں ہوسکتا۔پس متعہ کار ثواب ہوا۔نہ کہ گناہ۔جیسا کہ اہلِ سنت خیال کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں متعہ کی کچھ شرائط بھی ہیں۔مثلاً:مدت ومہر کا معین کرنا اور عورت کا مسلمان ہونا لازم ہے۔کافرہ اور دشمنِ اہل بیت سے متعہ جائز نہیں ہے۔اور چونکہ یہود ونصاریٰ کی عورتیں اپنی شریعت پر باقی نہیں رہیں۔لہٰذا ان سے بھی متعہ صحیح نہ ہوگا۔اور فاحشہ عورتوں سے متعہ کرنے میں کراہت شدیدہ ہے۔بلکہ باکرہ سے بھی بے اجازت پدر متعہ کرنا مکروہ ہے۔اور کسی کی کنیز سے اس کے آقا کی اجازت کے بغیر درست نہیں۔

یہ تمام شرائط اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ متعہ کے ذریعے سماج میں گناہوں اور عیاشیوں کا انسداد کیا جاسکتا ہے۔اور زنا کے جرائم جو ہر معاشرے میں اتنی تیزی سے بڑھتے نظر آتے ہیں۔کم کئے جاسکتے ہیں۔متعہ کے ختم ہوجانے سے زانیوں کو آسانیاں فراہم ہوجاتی ہیں۔اسی لیے ایک موقعہ پر حضرت علیؑ نے فرمایا تھا کہ''اگر حضرت عمرؓ لوگوں کو متعہ کرنے سے منع نہ کرتے تو قیامت تک سوائے شقی وبدبخت کے کوئی دوسرا زنا نہ کرتا''۔

المیہ یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کے مثبت پہلوؤں کو بھول کر بعض مسلمان احکام شرعیہ پر غلط انداز میں عمل کرتے ہیں۔جن کی وجہ سے اسلام بدنام ہوتا ہے۔مثلاً بیک وقت چار عورتوں کو نکاح میں رکھنے کے کیا شرائط ہیں۔عام مسلمان اس پر غور نہیں کرتے۔البتہ اس حکم سے غلط اور ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔لاتقربوصلوٰۃ کے آگے خدا کیا فرماتا ہے۔اس کی طرف توجہ نہیں دیتے۔اسی طرح متعہ کب اور کس طرح جائز ہے اور اس کے کیا فائدے ہیں اس پر کوئی غور نہیں کرتا۔البتہ بعض دنیا پرست لوگوں نے اس کا غلط فائدہ اٹھانا چاہا۔جس کی بدولت متعہ کو مطعون زیادہ کیا گیا۔اور اس کی افادیت ونوعیت کو سمجھنے کی بہت کم کوشش کی گئی۔لیکن اس طرح بعض شرعی امور میں مسلمانوں کی''غلط فہمی وغلط عملی'' سے اسلام کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا۔اسی طرح متعہ سے غلط فائدہ اٹھانے والوں کی وجہ سے متعہ کے حکم اور عقائد شیعہ کا مذاق اڑانا بے وقوفی، کم عقلی اور کج بحثی

کی دلیل ہے۔

۸۔ شیعیت اور تصوف :

تصوف وہ فلسفہ ہے جس کے متعلق شیعیت کے ضمن میں کافی بحث ومباحثہ رہا ہے۔ اکثریت ان لوگوں کی ہے۔ جن کا یہ خیال ہے کہ شیعہ تصوف کے قائل نہیں جبکہ جتنے صوفیائے کرام گذرے ہیں۔ وہ سب اپنا سلسلہ کسی نہ کسی حیثیت سے حضرت علیؑ سے وابستہ بتاتے ہیں اور ساری دنیا جانتی ہے کہ حضرت علیؑ شیعوں کے امام اوّل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر شیعوں کی تصوف سے بیزاری چہ معنی دارد؟

اس سے قبل کہ اس سلسلے میں کوئی حتمی فیصلہ کیا جائے۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تصوف کی وجہ تسمیہ اور اس کی حقیقت وماہیئت کو سمجھا جائے۔ حالانکہ یہ مسئلہ خود واضح نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کے بارے میں مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔ بعض افراد تصوف کے لیے کسی مذہب کی قید کو ضروری نہیں سمجھتے۔ بعض عیسائی رہبانیت کو اس کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے جو ہندو ویدانت اور اپ نی شد کو تصوف کا ماخذ خیال کرتا ہے۔ ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ تصوف یونان کے نوافلاطونی فلسفے سے ماخوذ ہے۔ جو نوشیروانِ عادل کے زمانہ میں اسکندریہ سے یونانی فلاسفہ کے ذریعے ایران پہنچا۔ اور بعد میں یہی عقائد "حکمت اشراق" کے نام سے موسوم ہوئے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ تصوف دراصل اسلامی عقائد کے خلاف آریائی اور سامی ذہنیت کا باغیانہ ردِ عمل ہے۔ اور ایک نقطۂ نظر یہ بھی ہے کہ تصوف کا آغاز اسلامی بنیاد پر ہوا۔ چنانچہ پرواز اصلاحی فرماتے ہیں:

"تصوف اسلام میں نہ تو کوئی علاحدہ تحریک ہے اور نہ اس کے مقابل میں کوئی جداگانہ مسلک۔ بلکہ تعلیم وتربیت کا خاص طریقہ ہے۔ جو ظاہر سے گزر کر تزکیۂ باطن وتصفیۂ قلب کو اپنا مطمح نظر قرار دیتا ہے۔ اس کا بڑا مقصد یہی ہے کہ لوگ دنیا کی محبت چھوڑ کر خدا سے لو لگائیں۔ خرافات اور لغویتوں سے دین کو پاک کر کے کتاب وسنت پر عمل پیرا ہوں"۔ (ماہنامہ نشاۃ الثانیہ ستمبر ۱۹۸۱ء شمارہ اوّل ص ۳۱ اسلامی تصوف کے خدوخال از: جناب پرواز اصلاحی)

اس نظریئے کی حمایت کرتے ہوئے پروفیسر صفدر علی بیگ اپنے مضمون "صوفیہ کی تعلیم۔ امیر خسرو کا نظریۂ حیات" میں تحریر فرماتے ہیں۔

"اسلام کی اشاعت کے کچھ ہی عرصہ بعد مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا جو قرآنِ کریم کے علم وتعلیمات اور احادیث کی تحقیق اور خدائے تعالیٰ کی عبادت وریاضت اور دنیا سے دوری اختیار کر کے درویشانہ زندگی گزارتا تھا۔ اس گروہ کے لوگ "صوف" یعنی اون کا لباس پہنتے اور اسی مناسبت سے صوفیاء کہلاتے تھے۔ صوفیاء اپنے نفسوں اور دلوں کی صفائی کرتے اور صبر وقناعت، فقر ومسکینی، سنجیدگی اور خاموشی اختیار کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد صوفیانہ طرزِ زندگی، اخلاق اور تعلیمات کا علمی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جانے لگا۔ اور ایک باقاعدہ علم یا فلسفہ پیدا ہوا۔ جو تصوف کہلانے لگا۔ رفتہ رفتہ تصوف فلسفہ کا لازمی جز بن گیا۔ تصوف کی بنیادیں قرآنِ حکیم، احادیث نبوی اور سنتِ رسول پر قائم ہیں"۔ (خسرو شناسی ص ۱۰۹)

یہ صوفیاء استناد کے طور پر جن آیات واحادیث کو پیش کرتے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (۲) هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ (۳) نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (۴) اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۵) فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ

انوار علی خاں سوز اسلامی تصوف کو Mysticism یعنی سرّیت سے ممیّز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"Mysticism کا صحیح ترجمہ اردو میں سرّیت یا باطنیت ہوگا۔ کیونکہ Mystic کی تلاش ظاہر کے بجائے باطن میں کرتا ہے۔ اور اس کا طریق تلاش عقلیت کے بجائے رمزیت پر مبنی ہوتا ہے۔ حواس خمسہ جو خارج کائنات میں تلاشِ حقیقت کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔ باطنی سفر میں زبردست سنگِ راہ ثابت ہوتے ہیں۔ Mystic یا سرّی حقیقت کی تلاش آنکھیں کھول کر

نہیں۔ بلکہ آنکھیں بند کرکے کرتا ہے ......مگر مسلمان صوفیہ میں سب اس نقطۂ نظر کے حامل نہیں تھے۔ صوفیہ کے دوسرے گروہ کے نزدیک تصوف سرّیت یا Mysticism کا ہم معنی نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس کیفیت کا دوسرا نام ہے۔ جسے حدیث میں احسان کے نقطہ سے تعبیر کیا گیا ہے...اس گروہ کے نزدیک صوفی کی معراج یہ نہیں ہے کہ اپنے اندرون میں حقیقتِ امری (Ultimate reality) کا مشاہدہ کریں۔ بلکہ اس کا کمال اس میں ہے کہ اس میں محمدؐ رسول اللہؐ اور ان کے اصحاب جیسا ذوقِ عبادت اور تقویٰ پیدا ہو جائے.... پہلے گروہ کے سرخیل محی الدین العربی اور منصور ابن حلاج وغیرہ رہے ہیں....ان میں سے ایک مجدّد ثانی ہیں۔ دوسرے فرید الدین شکر گنج۔ گروہ ثانی کے سرگروہ اور مرشدِ اوّل حضرت علیؑ سمجھے جاتے ہیں"۔

(اسلام اور عصر جدید۔ اپریل ۷۷ء ص ۴۷۔۷۲۔)

ایک فرید الدین شکر گنج ہی پر کیا منحصر ہے۔ صوفیائے کرام کے اکثر سلسلوں، شجروں اور خانوادوں کا آغاز حضرت علیؑ سے ہوتا ہے۔ اکابر تصوف اعتراف کرتے ہیں کہ ان کے اولین مشائخ نے حضرت علیؑ کے واسطے سے نبوت محمدیہ کے روحانی فیوض حاصل کئے۔ حضرت علیؑ ذات شریعت وطریقت اور حقیقت ومعرفت کی جامع وآئینہ دار تھی۔ یہاں تک کہ شیخ بہاؤ الدین محمود ناگوری چشتی "سر العافین" کے اشرفی الذکر المومنین حضرت علیؑ کرم اللہ وجہ" میں لکھتے ہیں کہ حضورؐ نے اصحاب کے روبرو حضرت علیؑ کو خرقہ مرحمت فرمایا۔ اور ارشاد فرمایا۔

"اے علیؑ! درویشی تیرا ہی کام ہے۔ خرقہ وہ شخص پہنتا ہے جو کسی کا بھید کسی پر ظاہر نہ کرے اور فقر اختیار کرلے"۔

(امام صوفیہ حضرت علی مرتضٰی ص ۲۳۷ ماہنامہ فیض الاسلام علی مرتضٰی نمبر ۶۷)

چنانچہ جان ہولسٹر بھی اس کا اعتراف کرتے ہوئے صوفیائے کرام کے بارے میں لکھتا ہے۔

" Most of them recognize Ali Ibne Abi Talib as the medium through whcih this esoteric teaching is received "
(Shia's of India pg :27)

(ان میں سے اکثر (صوفیاء) علیؑ ابنِ ابی طالب کو اس واسطے کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں۔ جن سے یہ روحانی تعلیمات ان کو حاصل ہوئیں۔)

ان صوفیائے کرام میں جن لوگوں کی مثال ہولسٹر دیتا ہے۔ ان کے نام یہ ہیں: خواجہ اجمیری معین الدین چشتی" جن کا سلسلہ نویں پشت میں جا کر حضرت علیؑ سے ملتا ہے۔ بایزید بسطامی جنھوں نے کشف والہام روحانی طور پر امام جعفر صادقؑ سے حاصل کیا اور حبیب عجمی سے فیض پایا۔ جبکہ یہ دونوں حضرات اس کی پیدائش سے قبل وفات پا چکے تھے۔ عبد القادر جیلانی" جو حسنی الحسینی کہلاتے ہیں۔ کیونکہ ان کا سلسلۂ نسب مادر کی جانب سے امام حسنؑ اور پدر کی جانب سے امام حسینؑ سے ملتا ہے۔

غرضیکہ صاف ظاہر ہے کہ صوفیائے کرام اور اسلامی تصوف کا منبع وماخذ حضرت علیؑ ہی کی ذاتِ اقدس تھی اور یہ وہی حضرت علیؑ ہیں جو شیعیت کا بھی منبع ومخرج ہیں۔ لہٰذا شیعیت اور تصوف کا تعلق لازمی ہے۔

ویسے بھی مختلف صوفیائے کرام نے تصوف کے جو معنی بتائے ہیں۔ ان کی روشنی میں حضرت علیؑ کی ذات اقدس ہی صوفی کہلانے کی مستحق قرار پاتی ہے۔ مثلاً حضرت معروف کرخی فرماتے ہیں:

خذ بالحقائق والیاس ممّا ایدی الخلائق۔

(تصوف حقائق کا حصول اور خلائق کے مال ومتاع سے یاس ہے۔)

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی کا قول ہے:

التصوف هو ان یمیتك الحق عنك وَیحییك به

(تصوف یہ کہ حق تجھے تیرے وجود سے فنا کرکے اپنے ذریعہ سے بقا عطا فرمائے۔)

حضرت ابو الحسن نوری کہتے ہیں:

التصوف ترك كل حظ للنفس (نفسانی لذتوں کا ترک کر دینا تصوف ہے)

حضرت ابوعمرو المی اب کشاس ہیں:

التصوف رويته اللؤن بعين التقص يل محض العرف عن اللؤن -

(تصوف نام ہے دنیا کی طرف نقص کی نگاہ سے دیکھنے، بلکہ سرے سے نہ دیکھنے کا۔)

اور حضرت ابوعلیؑ قزوینی کا بیان ہے:

التصوف هوالا خلاق الرمنيته ۔(تصوف اخلاق پسندیدہ کا نام ہے)

(شاعر جلد ۷ ۸ ۱۹۷ء دیوانِ درد اور خواجہ میر درد از ڈاکٹر فضل امام ص ۳۹)

مشہور صوفیائے کرام کے نقطۂ نظر سے تصوف کی ان توضیحات کی روشنی میں اگر شیعوں کے تمام ائمہ کرام کے اخلاق حسنہ اور ان کے اقوال و اعمال کا جائزہ لیا جائے۔ تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شیعوں کا ہر امام اپنی جگہ پر صوفی صافی ہے۔ بلکہ صوفیوں کا باعمل رہنما۔

ان توضیحات سے آگے بڑھ کر احادیث پر نظر ڈالی جائے تو صحیح بخاری میں رسولِ مقبولؐ سے روایات ہے کہ اللہ تعالٰی فرماتا ہے کہ'' جو بندہ اپنی طاعتوں سے میری قربت کو تلاش کرتا رہتا ہے تو میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ یہاں تک کہ میں اس کا کان بن جاتا ہوں۔ جس سے وہ سنتا ہے۔ اور اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ میں ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔ اور پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے''۔ (نشاۃ الثانیہ ستمبر ۸۰ ص ۳۵)

صحیح بخاری کی اس حدیث کے بعد یہ کہنے کی گنجائش باقی ہی نہیں رہتی کہ حضرت علیؑ سے بڑھ کر کوئی صوفی دنیا میں نہیں گذرا۔ اب اگر دنیا انھیں عین اللہ، روح اللہ، ید اللہ، وجہ اللہ، لسان اللہ وغیرہ کے ناموں سے پکارتی ہے تو کسی نافہم کو اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ قرآن و حدیث خود اس بات کی تصدیق کر رہے ہیں۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ جب شیعوں کے امام اوّل حضرت علیؑ سے لے کر تا امامِ آخر سب ہی تصوف کے لامحدود سمندر سے کم نہیں تو پھر شیعوں میں تصوف سے بیزاری کا عام رجحان کیوں پایا جاتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ جن کے امام، جن کے رہبر حضرت علیؑ ہوں۔ اور انھیں سے فیض پانے والے شیعہ تصوف کے منکر ہو جائیں؟

دراصل بات یہ ہے کہ جو تصوف اس وقت دنیا کے سامنے اسلامی تصوف کے نام سے پیش

کیا جاتا ہے۔ وہ علوی تصوف ہرگز نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس کا اسلامی اعتقادات سے گہرا تعلق ہے۔ ورنہ تصوف کے حقائق کو علیؑ اور اولادِ علیؑ سے زیادہ کوئی اور کیا سمجھ سکتا تھا۔ شیعوں کے تمام ائمہ کرام معرفت و عشق الٰہی کی ان منزلوں پر تھے۔ جنھیں اس زمانہ کے دنیا پرست مسلمان سمجھ بھی نہ سکتے تھے۔ حرص و ہوا ان کی آنکھوں پر غفلت کے پردے ڈالے رہے۔ البتہ وہ اصحاب علیؑ جو ائمہ اہل بیت سے مستفیض ہوتے رہے۔ باطنی تصوف کو پاتے گئے۔ چنانچہ حضرت علیؑ کے اصحاب کریم میثم تمار ابوالدردا، طرماح، محمد بن ابی بکر وغیرہ نے آپ سے فیض پایا حضرت جابر بن عبداللہ صحابی رسول جو نہایت پیرانہ سالی کی حالت میں امام زین العابدین کو سمجھانے آئے تھے۔ اور یہاں آکر ان کی ملاقات امام جعفر صادقؑ کے نو سالہ فرزند محمد باقر سے ہوئی۔ اور دوران گفتگو حقائق سے روشناس ہوئے جو تصوف کی روح سمجھے جاتے ہیں۔ یہی حال طرماح کا ہوا۔ ظہیر ابن قین بھی انھیں اسرارِ الٰہی کی معرفت پانے کے بعد زوجہ کو چھوڑ کر امام حسینؑ کے ساتھ راہ حق میں شہید ہونے کے لیے چل پڑے تھے۔

یہ مسلکِ معرفتِ الٰہی علیؑ مرتضٰی اور اہلِ بیت اطہار سے دوسرے بزرگانِ دین و اصحاب کرام تک پہنچتا رہا۔ اور تصوف پھولتا پھلتا رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ:

''عہد بنی امیہ میں خلافتِ راشدہ کے بعد جو سیاسی نظام قائم ہوا وہ منہاج سنّت پر نہ تھا۔ خلا[illegible]ی جگہ ملوکیت نے لے لی تھی۔ اس بناء پر بہت سے بزرگوں نے حکومتِ وقت سے قطع [illegible]ن کر لیا تھا۔ جلیل القدر صحابی۔ ائمہ اہلِ بیت اطہار، علماء اور دوسرے دین دار لوگوں نے گوشہ گری اختیار کر لی اور زہد و ریاضت، ترک دنیا، تزکیۂ نفس و ارتبت الٰہی کو اپنا شعار بنا لیا۔ یہی زہاد صوفیائے مابعد کے پیش رو تھے''۔ (نگار ۶۰ء از: ذکاء صدیقی)

حضرت علیؑ اور دیگر ائمہ اہلِ بیت کا دیا ہوا یہ تصوف شاید اپنی حقیقی شکل و صورت میں ہم تک پہنچتا۔

''اگر امیر معاویہ ان عرفانی بزرگوں کو (جنھوں نے مدتوں امیر المومنین علیؑ سے قولاً اور عملاً اس کی تعلیم پائی تھی۔) مار نہ ڈالتے۔ تاہم واقعہ شہادتِ حضرت امیر سے لے کر بنی امیہ پھر بنی عباس کی سلطنت میں صدیوں تک منسوبان حضرت علیؑ و اہلِ بیت اطہار کو اپنے آپ کو چھپانا پڑا اور جو حضرات اس جوش کو روک نہ سکے۔ ان کو سخت صعوبتیں اٹھانی پڑیں''۔ اور صعوبتیں اٹھانے

والے یہ لوگ زیادہ تر شیعی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی لیے شاد عظیم آبادی تصوف اور شیعیت کے تعلق سے فرماتے ہیں۔

''عوام میں مشہور ہو گیا ہے کہ مذہب شیعہ میں تصوف حرام ہے۔ اگر عام طریقے سے لوگوں کے دلوں میں یہ بات جمی ہوئی ہے تو محض غلط اور سراسر بہتان ہے۔ یاد رہے کہ مذہب حق محض جوارح سے متعلق نہیں ہو سکتا۔ جب تک باطنیت و روحانیت کا زیادہ حصہ اس میں شریک نہ ہو۔ وہ مذہب حق ہو نہیں سکتا.... آج جو ہم کو (شیعوں کو) فخر ہے کہ ہمارے سرداران دین نہ ملکی سردار تھے۔ نہ دنیا طلبی کے طامع۔ ان کو بجز روحانیت و باطنیت و خدا پرستی کے کسی اور چیز سے اگر سروکار ہوا تو صرف اس قدر کہ جس کی شریعت نے اجازت دی ہے انسان کے جانچنے کی یہی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو افعال دوسرے اقوال۔ یہ دونوں پوری وضاحت کے ساتھ ہمارے پیشِ نظر ہیں۔ سخت سے سخت مصیبتیں اٹھائیں۔ برابر امتحان ہوا کیے۔ قید میں مدتوں ڈالے گئے۔ زہر دے کر ہلاک کیے گئے۔ تاریک و تنگ کوٹھری کے اندر برسوں گرمی میں گھٹا دیے گئے۔ کھانا پانی تک بند کر دیا گیا۔ ننگے اونٹ پر بٹھا بٹھا کر دھوپ اور ریگستان اور نشیب و فراز میں منزلوں دوڑایا گیا۔ سر، پیٹھ، پاؤں میں چھل چھل کر زخم پڑ گئے۔ سخت سے سخت جاڑوں میں اوڑھنے بچھانے تک کو کوئی چیز میسّر نہ آئی۔ جنازوں تک پر بیداد ہوئی۔ اور جو جو مصائب عام انسانی خیال میں آ سکتے ہیں۔ ان کا خاتمہ میدان کربلا و کوفہ و دمشق میں ہو گیا۔ ان تمام جانکاہ تکالیف و صدمات میں سب نے ایک قدم جادۂ تسلیم و رضا کے باہر نہ رکھا.... رہے حقانی، عرفانی و اخلاقی اقوال اس کی بھی کچھ کمی نہیں ہے .... الغرض انھیں بارہ ذرّیات رسول کو فنا فی اللہ کا سچا درجہ حاصل تھا اور اس کی بدولت اسلام روحانی مذہب کہا جا سکتا ہے جو یہ فرماتے ہیں کہ شیعہ مذہب کو تصوف سے دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے۔ وہ پہلے ملا محمد باقر مجلسی علیہ الرحمۃ کا وہ رسالہ پڑھیں۔ جو تصوف کی تائید میں انھوں نے لکھا ہے۔ یا غلام حسین خان طباطبائی کا دیباچہ شرح مثنوی روم دیکھیں۔ یا ہمارے سید بزرگ شہید ثالث نے مُلّا طاہر دکنی کی تصانیف کے ضمن میں جو مجالس مومنین میں درج کیا ہے۔ وہ پڑھیں۔ ہاں جو افراط و تفریط اور غیر متعلق باتیں دنیاداروں نے زبردستی تصوف میں شامل کی ہیں وہ اسلام کا تصوف نہیں ہے''۔ (فکر بلیغ ص ۱۳۹ از: عظیم آبادی)

یہ حقیقت بھی ہے کہ آج جو فلسفہ تصوف ہمارے سامنے ہے۔ وہ خالصاً اسلامی تصوف قطعی نہیں ہے۔ اور نہ یہ وہ تصوف ہے۔ جو حضرت علیؑ نے دیا تھا۔ بلکہ اس میں ویدانت، سرّیت اور شامی فلسفہ تصوف کا امتزاج ہے۔ ڈاکٹر فضل امام اس ضمن میں رقم طراز ہیں۔

''اسلام کی حکیمانہ زندگی کی روشنی میں ایمان والوں کو اللہ اور رسولؐ اور صاحبان امر کی اطاعت کا حکم ہے.... عبادات و ریاضات کا اسلامی طریقہ بھی تصوف کی مختلف اصطلاحات اور طریقۂ کار سے موافقت نہیں رکھتا ہے.... اسلام کے طریقۂ عبادت میں نہ الا اللہ کی ضربیں لگانے کا نام عبادت ہے اور نہ تو تن پر بھبھوت ملنے کو ریاضت کہتے ہیں۔ گھر بار کو چھوڑ کر جنگلوں اور گپھاؤں میں زندگی گذارنا بھی اسلامی طرز عبادت ہرگز نہیں۔ اسلام میں دنیا کو آخرت کی کھیتی قرار دیا گیا ہے۔ اور تقویٰ و پرہیزگاری کو انسانی کردار کی رفعت..... تصوف میں بزم حال و قال بھی ہے۔ اور رسم خانقاہی میں بزم اسماع کی طرفہ کیفیت بھی۔ خرقہ پوشی اور علائق دنیا سے کنارہ کشی بھی۔ لیکن اسلامی اصولِ حیات و ضابطے میں رہبانیت روا نہیں''۔

(شاعر۔ شمارہ ۷ ۱۹۷۸ء دیوانِ درد اور خواجہ میر درد از: ڈاکٹر فضل امام ص ۴۰)

اس کی وجہ محض یہی ہے کہ جب عہد بنو امیہ اور عہد بنو عباس میں ان بزرگانِ دین پر ظلم و ستم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ تو وہ ادھر اُدھر منتشر ہونا شروع ہوئے۔ جن میں سے کچھ ہندوستان چلے آئے۔ اور ہر چند کہ یہاں اس ظلم و ستم کا امکان کم تھا۔ پھر بھی تقیہ اختیار کیے رہے۔ اور حضرت علیؑ اور اہلِ بیت اطہار کی محبت دولا ان کا شغلِ اولین رہا۔ کچھ لوگ ایران پہنچے۔ اپنے مرکز سے سے دور ہو جانے کی وجہ سے افعال، اقوال میں تبدیلی لازمی تھی۔ لہٰذا یہاں کے پرانے مذہب نے مل کر اس تصوف کی جس کے بانی حضرت علیؑ تھے۔ شکل ہی بدل دی ہے۔

مجوسیت اور عیسائیت نے اسے رہبانیت کے ایک نئے راستے پر ڈال دیا۔ جو اسلام سے قطعی الگ تھا۔ یہ لوگ صوف بھی پہننے لگے۔ اور اسی لیے اس فرقہ کا نام صوفی پڑ گیا۔ ورنہ عرب جیسے گرم ملک میں اس لباس کا استعمال کوئی معنی نہیں رکھتا۔ غرضیکہ عرب سے نکل کر ایران و ہندوستان کی

سرزمین پر پہنچ کر حضرت علیؑ کا پیش کردہ اسلامی تصوف پارہ پارہ ہوگیا۔اور بقول شاد عظیم آبادی۔

''بعض نادانوں نے اپنے جوش و افراط کو دخل دے کر توحید کے معنی کو اتنا کھینچا کہ ''انی انا اللہ'' بے تکلف کہنے لگے۔بعض ادب ناشناس یہاں تک بڑھے کہ ایک کتا مسجد کے چراغ کا تیل پی گیا۔تو آپ فرماتے ہیں کہ اپنے گھر کا آپ تیل پی گئے۔نعوذ باللہ ظاہر ہے کہ یہ سب ہندو مذہب کے ویدانت یا راہبانہ خیالوں کی آمیزش کا نتیجہ ہے۔ورنہ اس تصوف سے اس کا دور کا بھی لگاؤ نہیں جس کے بانی حضرت علیؑ ہیں۔ (فکر بلیغ از شاد عظیم آبادی ص ۱۲۹)

اس افراط و تفریط کا نتیجہ یہ نکلا کہ بگلا بھگت دنیادار صوفیوں کا روپ دھارن کر کے دادِ عیش دینے لگے۔خانقاہیں عیاشیوں کا اڈہ بن گئیں۔پیری مریدی کے بہانے امرد پرستی اور لذت کوشی کو خوب تقویت حاصل ہوئی۔قوالی کے ذریعہ غناء کی روایت شروع ہوئی۔جبکہ اسلام نے گانا بجانا حرام قرار دیا ہے۔شرابِ معرفت کے نام پر بادہ نوشی کثرت سے ہونے لگی۔بے خودی کے بہانے حشیش، چرس اور افیون وغیرہ نشے دار چیزوں کا استعمال عام ہوگیا۔اور بہت سے سبز پوش، گدڑی نشین بھولے بھالے معصوم عوام کو بے وقوف بنا کر روپیہ بٹورنے لگے۔ان کے چکر میں عوام تو عوام خواص اور امراء یہاں تک کہ بادشاہ و وزراء تک پھنس گئے۔شاید ایسے ہی تصوف سے بیزار ہو کر نیاز فتح پوری نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا تھا۔

''جس طرح مذہب کو مولویوں نے خراب کیا ہے اسی طرح تصوف کو صوفیوں نے۔نہ ان کی کتابیں اس قابل ہیں کہ انھیں پڑھ کر مذہب کی حقیقت سمجھی جائے اور نہ ان کے ملفوظات اس لائق کہ ان سے تصوف کا صحیح مفہوم اخذ کیا جائے۔ان دونوں کو غرقِ آب کیجئے۔اور خود اپنے اندر ڈوب جایئے''۔

(نگار مئی ۱۹۲۸ء مکتوبات ص ۵۹)

تصوف کے اس استحصالی دور میں بھی اکثر شیعہ بزرگانِ دین معرفت کی منزلوں پر پہنچ کر گوشہ نشینی کی زندگی گذارتے رہے۔اور جہاں تک ہوسکا۔تعلیمات علیؑ کو لوگوں تک پہنچاتے رہے۔جن میں میر باقر داماد، شیخ بہائی، مُلّا محسن صاحب اسرار مکتونہ، مُلّا ماجد بحرینی، قطب الدین صاحب محاکمات، مُلّا صدرا، مُلّا محمد حسین شیرازی، میر خضدر رکی مجتہد، علامہ مجلسی، علامہ حلّی، مُلّا

ہادی سبزداری۔مُلّا طاہر، قاضی نور اللہ شوستری، وغیرہ کا نام قابلِ ذکر ہیں۔

آج شیعوں کی تصوف بیزاری کا سبب محض یہی ہے کہ جو تصوف حضرت علیؑ کا دیا ہوا تھا۔خانقاہوں میں اب وہ تصوف عنقا ہے۔ورنہ شیعی علماء آج بھی علوی و اسلامی تصوف کے صرف قائل ہیں بلکہ اس پر عمل پیرا بھی ہیں۔اور خامشی کے ساتھ اسلامی تعلیمات کی تبلیغ و اشاعت میں مصروف۔آقائی خوئی اس کی زندہ مثال ہیں۔

بہر حال ہندوستان میں جو تصوف آیا وہ ایران اور خاص طور پر خراسان سے پہنچا۔لہٰذا فارسی شعراء کے ہاں تصوف کا جو تصور ملتا ہے اردو شاعری میں بھی تقریباً وہی تصوف نظر آتا ہے اور یہ تصوف زیادہ تر غیرہ شیعہ شاعروں کے کلام میں ہے۔شیعہ شعراء کے کلام میں تصوف کی جو ہلکی ہلکی جھلکیاں موجود ہیں وہ علوی تصوف کی عکاسی کرتی ہیں چنانچہ یہاں اتنا بتا دینا مقصود ہے کہ اگر اردو کے شیعہ شاعروں کے کلام میں تصوف کا رنگ نظر آتا ہے تو نہ اس پر تعجب کرنا چاہئے اور نہ ان کی شیعیت پر شک۔میر انیسؔ اگر یہ کہیں کہ

جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

یا میر حسن اگر تصوف کے موضوع پر مثنویاں لکھتے ہیں یا غالب اپنی غزلوں میں تصوف کی باتیں کرتے ہیں تو اس سے ان حضرات کی شیعیت میں تشکیک کو جگہ دینا کم علمی کی دلیل ہوگی۔غیر علوی یا غیر اسلامی تصوف تو خود اردو فارسی میں بھی مرغوب نہیں ہے اور ایسے ریاکار، دنیا طلب اور ہوس پرست خانقاہ والوں کی ہمارے شعراء نے خوب دھجیاں اڑائی ہیں اور آج بھی ان کا مذاق اڑانے سے باز نہیں آتے۔

باب سوم

شیعوں کے مخصوص مراسم وتقاریب

چونکہ شیعیانِ علی نے شروع ہی سے باقاعدہ ایک قوم کی شکل میں ابھرنا شروع کر دیا تھا اور ظالم حکمرانوں کی مدافعت کی خاطر اجتماعی طور پر زندگی گذارنے کے عادی ہو چکے تھے۔ لہٰذا دنیا میں شیعوں کا ایک مخصوص سماج بنتا گیا۔ جس میں ان کے اپنے مخصوص آداب و لحاظ، تہذیب و تمدن، اصول و روایات اور رسم و رواج پرورش پاتے رہے۔ وہ گھٹے ہوئے مذہبی جذبات جنہیں کھل کر اپنے اظہار کا موقع نہ ملتا تھا ان کے گھروں میں رسومات کی شکل میں راہ پانے لگے۔ لہٰذا اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان رسومات کے انعقاد میں بہت حد تک ان کے مذہبی عقائد کو دخل تھا۔

ان رسومات کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ رسومات جو خوشی کے موقع پر ادا کی جاتی ہیں۔ دوسری وہ رسومات ہیں جو غم یا خاص طور پر غم حسینؑ کے سلسلے میں منائی جاتی ہیں۔ شیعوں کے ہاں ان کا ذاتی غم یا خوشی اتنی اہمیت نہیں رکھتا جتنا غم حسینؑ رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خوشی کا موقع ہو یا غم کا امام حسینؑ کو یاد کرنا وہ اپنا اولین فرض سمجھتے ہیں۔ خوشی کا موقع ہوگا تو ایسی مجالس منعقد کی جاتی ہیں جو جشنِ میلاد و مقاصدہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور غم کے موقع پر مجالس عزا کا رواج ہے۔ سب سے پہلے ہم ان تہنیتی مراسم کا ذکر کریں گے جو عیدوں کی

شکل میں ہر شیعہ کے گھر منائے جاتے ہیں۔ عیدین (عید الفطر اور عید الاضحیٰ) کے علاوہ شیعوں کی کئی اور اعیاد بھی ہیں مثلاً عید نوروز، عید غدیر، عید مباہلہ، عید شعبان، عید میلادِ علیؑ اور عید ثانی زہراؑ۔ لہٰذا ان سب کا فرداً فرداً ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

الف : تہنیتی مراسم و تقاریب

۱ ۔ عید نوروز

دنیا کی تمام قومیں اپنے سال کے پہلے دن کو خاص اہمیت دیتی ہیں اور اس دن کو روزِ عید سمجھ کر جشن مناتی ہیں۔ قدیم اقوام عالم کے نزدیک تو اس دن کی بہت اہمیت ہوتی تھی اور وہ موسمی تبدیلیوں کے علاوہ قومی و مذہبی روایات کے اعتبار سے بھی اس دن کو متبرک مانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی اکثر قدیم اقوام اس روز جشن مناتی تھیں۔ چنانچہ اہل بابل جو اعتدال ربیعی کے زمانہ سے اپنے سال کی ابتدا کرتے تھے۔ وہ اس زمانہ میں اپنے معبود شمس (جس کو وہ مردوخ کہتے تھے) کی پرستش کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس زمانہ میں یہ نورانی دیوتا ظلمت پر غالب آتا ہے اور اسی وجہ سے دن بڑھنے لگتا ہے۔ یہ لوگ سال کے پہلے دن خوشی کا اظہار کرتے تھے اور اپنے سورج دیوتا کے سامنے قربانی کرتے تھے۔ اسی طرح اہل مصر بھی اس دن اپنے معبود شمسی (''ایزیس'') کی پرستش کرتے تھے ان کا خیال تھا کہ اسی نے دریائے نیل جیسا مفید دریا انہیں بخشا ہے یہ رسمیں قبطیوں میں بہت زمانے تک رہیں۔

علامہ الشیخ تقی الدین مقریزی بذیل تذکرہ نوروز قبطی لکھتے ہیں۔

''سریانی زبان میں نوروز کے معنی عید کے ہیں (یہ لفظ اصل میں فارسی ہے۔ سریانی نہیں ہے۔ نیروز یا نوروز دونوں کہا جاتا ہے نئے دن کے معنوں میں ہے۔) حضرت ابن عباس سے دریافت کیا گیا کہ نوروز کو عید کا دن کیوں قرار دیا گیا؟ تو کہا کہ ''یہ آنے والے سال کا پہلا دن ہوتا ہے اور گذرے

ہوئے سال کا آخری دن اس لیے اس دن یہ لوگ اپنے بادشاہوں کو نذریں
دیتے ہیں۔اس کے بعد عجمیوں نے اس کو اپنا شعار بنالیا''
(سید سبط الحسن فاضل ہنسوی ماہ نامہ۔اصلاح ۱۹۴۱ء صفحہ ۵۸)

اسلامی دور میں بھی اہل مصر نوروز کے دن انتہائی خوشی مناتے تھے تین دن تک مسلسل جشن نوروز منعقد ہوتا تھا۔ایران میں بھی نوروز کا جشن بہت اہتمام سے منایا جاتا تھا۔وہ اپنے سال کا پہلا مہینہ حمل کو قرار دیتے ہیں اور جس روز آفتاب عالمتاب دورہ اثنا عشر کو تمام کر کے برج حمل میں داخل ہوتا ہے۔یہی دن ان کے نزدیک عید نوروز کا ہوتا ہے یہ زمانہ موسم کے اعتدال اور آغاز بہار کا ہوتا ہے۔دن اور رات برابر ہوتے ہیں۔حمل کی پہلی تاریخ ہمیشہ ۲۱ مارچ کو ہوتی ہے۔پارسیوں کا یہ خیال ہے کہ خداوند عالم نے افلاک، شمس و قمر و دیگر سیاروں کو نوروز ہی کے دن سے گردش دی ہے۔(علامہ قزوینی۔عجائب المخلوقات)

ایران میں سب سے پہلے جشن نوروز کی ابتدا جمشید نے کی۔جمشید چھ روز تک برابر جشن نوروز مناتا تھا جس روز آفتاب اوّل نقطۂ برج حمل میں داخل ہوتا تھا (یعنی ماہ فروری کی پہلی کو) یہ ایک عام دربار کرتا تھا۔اس کا نام اس نے نوروز عامہ رکھا تھا۔اس روز سے لے کر چھ روز تک برابر وہ لوگوں کی حاجتوں کو پورا کرتا تھا۔مجرموں اور قیدیوں کی خطاؤں کو معاف کرتا تھا اور ان کو قید سے آزاد کرتا تھا۔چھٹے دن پھر وہ دربار کرتا تھا اور جشن مناتا تھا۔یہ دن نوروز خاصہ کا ہوتا تھا۔جس کو وہ ''خرداد'' کہتے تھے۔اس روز جمشید تخت پر بیٹھتا تھا اور مخصوص لوگ دربار میں طلب کئے جاتے تھے اور ان سے یہ کہتا تھا کہ '' آج کا دن وہ ہے کہ تم کو خداوند عالم نے پیدا کیا ہے۔اس لیے تمہیں چاہیئے کہ غسل کرو اور لباس پاکیزہ پہنو۔اور اپنے خالق کے شکریے میں عبادت میں مشغول رہو۔جمشید کے بعد بھی یہ جشن ایران میں منایا جاتا رہا۔مشہور مورخ البیرونی نے نوروز کی وجہ تسمیہ اور اس کی ابتدا کے متعلق لکھا ہے

''ایک مرتبہ حضرت سلیمانؑ کی انگشتری غائب ہوگئی تو اس کی وجہ سے آپ کی حکومت و سلطنت بھی جاتی رہی۔لیکن جب چالیس دن کے بعد انگوٹھی مل گئی تو پھر سلطنت شاہی واپس آ گئی اور ہر شے مطیع و منقاد ہوگئی۔اس وقت ایرانیوں نے اپنی زبان میں یہ کہا کہ ''نوروز آمد'' اس وجہ

سے اس کا نام ہی نوروز پڑ گیا۔۔۔۔۔'' ایرانی اس دن کو نہایت مبارک و مسعود سمجھتے تھے۔ان کا یہ عقیدہ تھا کہ خداوند عالم نے اس یوم سعید کا نام اپنے نام پر ''ہرمز'' رکھا ہے اور اسی دن اس نے حضرت آدم کو پیدا کیا اور اہل زمین پر نیکیاں تقسیم فرمائی ہیں۔اس دن یہ لوگ نیک شگون لیتے تھے۔علاوہ پانی چھڑکنے کی رسم کے اس دن شکر کا کھانا بھی بہت ضروری سمجھتے تھے اور مٹھائی ہی کی وجہ سے حلوا اور مختلف قسم کی شیرینی ایک دوسرے کے پاس بطور ہدیہ کے بھیجا کرتے تھے۔'' عربی ترجمہ (الاثارا الباقية عن القرس اللبيروني صفحہ ۲۱۵)

البیرونی نے مزید لکھا ہے

'' نوروز کے دن یہ بھی ایک رسم ہے کہ لوگ ہدیۃً ایک دوسرے کے پاس شکر بھیجتے ہیں۔اس کا خاص سبب یہ ہے کہ جیسا کہ بغداد کے موبد آذرباد نے بیان کیا ہے کہ سرزمین ایران میں گنا نوروز کے دن دریافت کیا گیا اس سے پہلے یہ لوگ اس سے ناواقف تھے'' (اقوام عالم میں نوروز کی اہمیت ازمولانا سید سبط الحسن فاضل ہنسوی اصلاح ۱۹۴۱ء صفحہ ۵۹۔۵۸)

روم میں جولیس سیزر نے جب اپنی ملکی تقویم (کلینڈر) کو تبدیل کیا تو اس نے ماہ'' کانون الآخر'' کو اپنا پہلا مہینہ قرار دیا اور اپنے بڑے دیوتا جینوس (Janus) کی نسبت سے اس کا نام بدل کر "Jannier" رکھا جو اب جنوری ہوگیا۔اسی نے پہلی جنوری کو عید نوروز قرار دیا۔ جب تمام یورپ میں عیسائیت کا غلبہ ہوگیا تو نوروز کے سلسلے کی تمام رسمیں جو جاری تھیں۔وہ مٹ گئیں اور ان کی جگہ پر عیسائی مذہب کی نئی رسمیں جاری ہوگئیں۔مثلاً میلاد مسیح کے آٹھ دن۔روم کی طرح شام میں بھی یکم جنوری کو عید قلنداس (Calandas) منائی جاتی تھی۔چین میں بھی ابتدائے سال کی خوشیاں بہت اعلیٰ پیمانہ پر منائی جاتی تھیں۔وہاں یہ دستور تھا کہ مغفور چین کی سواری نہایت شان و شوکت کے ساتھ نکلتی تھی اور عام شہر کا گشت کر کے مندر میں جاتی تھی۔پھر مذہبی رسوم اور قربانی کے فرائض ادا کیے جاتے تھے۔اس کے بعد تحائف تقسیم کیے جاتے تھے روشنی کی جاتی تھی۔ آتش بازی چھوٹتی تھی۔خود ہمارے ہندوستان میں شروع سال کا جشن منایا جاتا ہے۔

(اقوام عالم میں نوروز کی اہمیت ازمولانا سید سبط الحسن فاضل ہنسوی
اصلاح ۱۹۴۱ء صفحہ ۵۹۔۵۸)

قبل اسلام عرب میں بھی قمری مہینے کے اوّل ماہ یعنی محرم کو نہایت بزرگ و محترم سمجھتے
لیکن واقعہ کربلا نے ثابت کر دیا کہ ماہِ محرم فرح و مسرت کا زمانہ نہیں بلکہ غم والم کا مہینہ ہے۔ مصر
کے خلفائے فاطمین عاشورہ محرم کو غم مناتے تھے لیکن جب خلفائے فاطمین کا زوال ہوا تو سلاطین
بنی ایوب نے ضد میں عاشورہ محرم کو خوشی کا دن قرار دیا۔ لیکن اس کے باوجود بھی آج تک عام طور پر
تمام مسلمان محرم میں خوشی نہیں کرتے۔

شیعوں کے نزدیک نوروز کے دن کی کچھ اور ہی اہمیت ہے جو ان سب سے الگ
ہے۔ "نوروز" یادگار ہے اس اہم واقعہ کی جس میں قرآن مجید کی آخری آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ
دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَام
کا اعلان ہوا۔ یعنی دنیا کے ذریعہ اس دن شریعت اسلام کی تکمیل ہوئی اور تمام نعمت کا اعلان ہوا
تھا۔ چنانچہ مقبول احمد نوگانوی لکھتے ہیں۔

"قمری حساب سے ۱۸ر ذی الحجہ ۱۰ھ تھا کہ رسالت مآب نے مقام غدیر خم میں
امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالبؑ کی ولایت کا اعلان فرمایا۔ اس دن مرضیِ دینِ الٰہی قرار پایا۔ یہ وہ
مبارک دن تھا جس کی عظمت کا احساس اسلام والوں کے علاوہ غیروں کو بھی تھا۔ چنانچہ تفسیر دُرِ
منثور حافظ جلال الدین سیوطی میں ہے کہ حضرت عمر کے سامنے اس آیت کا تذکرہ ہوا۔ ایک شخص
نے اہل کتاب (یہود) میں سے کہا کہ اگر ہم کو معلوم ہوتا کہ یہ آیت کس دن نازل ہوئی ہے تو ہم
اس کو عید قرار دیتے۔ حضرت عمر نے کہا کہ شکر ہے خدا کا اس نے اس دن کو ہمارے لیے عید قرار
دیا۔ واقعہ کی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے قمری و شمسی دونوں کو معتبر قرار دیا گیا ہے۔ قمری حساب
سے ۱۸ر ذی الحجہ قرار پائی۔ جس کا نام عید غدیر ہوا۔ شمسی حساب سے چونکہ اس تاریخ میں جب یہ
واقعہ رونما ہوا آفتاب نقطۂ اعتدال پر پہنچا تھا۔ جو برج حمل میں اس کے داخلے کے مترادف
ہے۔ اس لیے سال کی تاریخوں میں یہی دن کہ جب آفتاب برج حمل میں داخل ہوا اور اعتدال کا
وقت آئے عید قرار پایا جس کا نام "نوروز" ہے۔ اور پھر اتفاق سے امیر المومنین کی خلافت ظاہری
بھی اسی دن تھی جس کے معنی یہ ہیں کہ آفتاب خلافت اپنے نقطہ اعتدال پر آیا تھا جس کے اندر
افراط و تفریط کا شائبہ لَا شَرْقِیَّةٍ وَلَا غَرْبِیَّةٍ بلکہ جو اللہ وسط صحیح مصداق ہے اس لیے بھی رمز

کے طور پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس دن کو قرار دیا گیا ہے۔"

(احباب جنتری ۱۹۷۸ء صفحہ ۲۳ عید نوروز از مقبول احمد نوگانوی)

شیعوں کے نزدیک اس عید کی بڑی فضیلتیں ہیں۔ چنانچہ امام جعفر صادقؑ نے
فرمایا۔ "نوروز کا دن وہ دن ہے جس دن خداوند کریم عالم نے اپنے بندوں سے عہد و پیمان لیا
تھا۔ یعنی اس دن روز الست واقع ہوا تھا۔ جبکہ خدا نے عالم ارواح میں اپنے بندوں سے مخاطب
ہو کر ارشاد فرمایا تھا۔ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوا بَلٰی۔ یہ پہلا دن ہے جس دن آفتاب چمکا اور
ہوائیں چلیں۔ اور اسی دن سب سے پہلے روئے زمین پر پھول کھلے۔ کلیاں شگفتہ ہوئیں۔ اور
اسی دن کوہ جودی پر حضرت نوحؑ کی کشتی رکی۔ اسی دن کئی ہزار بندگان خدا جو طاعون کے خوف
سے اپنے شہر چھوڑ کر بھاگ نکلے تھے اور عرصہ ہوا کہ مر چکے تھے ان کی صرف بوسیدہ ہڈیاں باقی
تھیں۔ ایک پیغمبر (حضرت حزقیل) کی دعا سے پھر زندہ ہوئے۔ (اس واقعہ کی جانب قرآن
مجید نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔ الحد شابی الدین خرجو امین دیار همد و
هم الوف حذر الموت فقال لهم موتو ا شم احیاهمد) اسی دن پہلے پہل حضرت
جبرئیل امین وحی لے کر سرور کائناتؐ پر نازل ہوئے (یعنی روز بعثت جو ۲۷ر رجب کو ہے وہ
شمسی حساب سے نوروز کے دن پڑا تھا) اور اسی دن حضرت ابراہیمؑ نے بت شکنی فرمائی۔ اسی طرح
حضرت رسول خداؐ اور حضرت علیؑ نے اسی دن خانۂ کعبہ کو بتوں سے پاک فرمایا۔ یعنی بت
شکنی جس دن واقع ہوئی وہ نوروز کا دن تھا اور یہی دن نوروز کا تھا (شمسی حساب سے) جس دن
رسول خداؐ نے حضرت علیؑ کو اپنا خلیفہ و مولائے کائنات قرار دیا۔ اور اسی نوروز کے دن رسالت
مآبؐ نے حضرت علیؑ کو وادیِ جن میں اپنا نائب بنا کر بھیجا تا کہ آپ گروہ جن سے بیعت
لیں۔ اور اسی دن جنگ نہروان واقع ہوئی۔ اور امیر المومنین مظفر و منصور ہوئے۔ اور اسی دن
حضرت قائم آل محمدؐ ظہور فرمائیں گے اور اسی دن ائمہ علیہم السلام رجعت فرمائیں گے۔ اور
اسی دن دجّال پر حضرت حجتؑ مظفر و منصور ہوں گے۔ اور وہ بدبخت قتل ہو گا۔ یہی وہ دن ہے جس دن
حضرت صاحب العصرؑ کے ظہور کا انتظار غلامان اہل بیت کو کرنا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ ایک ہی
سعادت سے وہ دن متبرک اور عید کا ہو جاتا ہے جس یوم العید میں اس قدر برکات کا ظہور ہو وہ

کیونکر نہ خیر الاعیاد سمجھا جائے۔"

(احباب جنتری صفحہ ۴)

مزید فرماتے ہیں۔

"کوئی نوروز کا دن ایسا نہیں ہوتا کہ ہم اہل بیت زمانہ سرور کے منتظر نہ ہوں کیونکہ یہ روز ہمارا اور ہمارے شیعوں کا ہے۔ عجمیوں نے اس کی حفاظت و حرمت کی اور تم عربوں نے اس کو ضائع کر دیا۔"

یہی وجہ ہے کہ شیعہ اس روز عید مناتے ہیں۔ غسل کرنا' پاکیزہ لباس پہننا' خوشبو لگانا' اعمال خیر کرنا مثلاً روزہ رکھنا' ماثورہ نماز اور دعاؤں کا پڑھنا وغیرہ کو ضروری سمجھتے ہیں۔

۲۔ عید غدیر

شیعہ ہر سال ۱۸ ذی الحجہ کو عید غدیر کو مناتے ہیں یہ عید ان کے لیے حضرت علیؑ کی خلافت و جانشینی کے کھلے اعلان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اس کے پیچھے حجۃ الوداع کا وہ واقعہ پوشیدہ ہے، جس میں رسول اکرمؐ نے آخری خطبہ دیا اور مسلمانوں کے جم غفیر کو بعد از حج آخری مرتبہ خطاب فرمایا۔

فرقۂ امامیہ کا ایمان ہے کہ خداوند عالم نے پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیا تھا کہ امت اسلامیہ کے سامنے علیؑ ابن ابی طالب کی خلافت و جانشینی کا اعلان فرما دیں۔ خدا کے حکم کے مطابق آنحضرتؐ نے حجۃ الوداع کی ادائیگی کے بعد مدینہ منورہ واپس جاتے ہوئے غدیر خم کے مقام پر تمام اصحاب و انصار کو ٹھہرنے کا حکم دیا۔ اور ایک طویل خطبہ کے بعد امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالب کی خلافت و جانشینی کا اعلان فرمایا۔ یہ عظیم الشان واقعہ "واقعہ غدیر خم" کے نام سے مورخین و علمائے اسلام کے مابین مسلم ہے یہی وجہ ہے کہ اعلان خلافت کے وقت سے عہد حاضر تک جلیل القدر علمائے اہل تسنن و تشیع نے تواتر کے ساتھ اس مہتم بالشان واقعہ کو نقل فرمایا ہے۔

(موعظہ غدیر تالیف صدر المفسرین علامہ ماتری ترجمہ سید غلام پنجتن صفحہ ۷ پیش لفظ از حجۃ الاسلام آفاقی رجبی)

حالانکہ بعد میں شیعہ اور ان کے مخالفین میں یہی واقعہ سب سے زیادہ متنازعہ فیہ بنا رہا۔ اور اس حدیث میں بکثرت ترمیم و تنسیخ و تبدیلی کا شکار ہونا پڑا۔ بہرحال پھر بھی "علمائے امامیہ اثنا عشرہ" اس واقعہ کے ثبوت میں ناقابل انکار و تردید دلائل و شواہد کا انبار پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ شہید ثالث ماضی نور اللہ شوستری نے اپنی معرکۃ الآرا اور مشہور زمانہ کتاب "احقاق الحق" کی دوسری جلد میں صفحہ ۴۱۵ سے صفحہ ۴۶۵ تک اہل سنت کے طریقوں سے ڈیڑھ سو صحابیان سرکار دو عالمؐ کی زبانی واقعۂ غدیر کو نقل کیا اور کتاب مذکورہ کی چھٹی جلد میں تین سو چھ (۳۰۶) ایسے علمائے اہل سنت کے اسماء درج کئے ہیں جنہوں نے اپنی کتابوں میں روایت غدیر کو تحریر فرمایا ہے۔ علامہ امینیؒ نے بھی اپنی تصنیف "الغدیر" میں تین سو چونسٹھ ایسے علمائے سنت کے اسماء درج کئے ہیں جنہوں نے واقعہ غدیر کو اپنی تصنیفات میں بیان کیا ہے۔ (موعظۂ غدیر۔ پیش لفظ محمد اسماعیل رجبی صفحہ ۱۵)

غدیر خم کے واقعہ پر وسیع النظر اور حق شناس مصنف "مناقب اہل بیت" مشہور سنی عالم مولانا عزیز الحق کوثر ندوی صفحہ ۱۶۵ پر تحریر فرماتے ہیں۔

"حجۃ الوداع ۱۳ ذی الحجہ کو حضور انورؐ نے مع شرکائے حج خانہ کعبہ کا رخصتی طواف کیا۔ جس کو طواف الوداع کہتے ہیں۔ اس کے بعد مہاجرین و انصار کے ساتھ مدینہ منورہ روانہ ہوئے راہ میں ایک مقام خم آیا۔ یہاں ایک تالاب ہے عربی میں تالاب کو غدیر کہتے ہیں۔ اس لیے اس مقام کو غدیر خم بھی کہتے ہیں۔ یہاں آپ نے تمام ہمراہی صحابہ کو جمع فرما کر ایک خطبہ دیا۔ جس میں یہ کلمات ہیں۔

"لوگو! میں ایک بشر ہوں۔ جلد ہی میرے پاس میرے رب کا فرشتہ (رحلت کا پیام لے کر) آئے گا۔ اور میں اسے قبول کروں گا۔ میں تمہارے درمیان دو بڑی وزنی چیزیں چھوڑتا ہوں۔ ان میں ایک کتاب الٰہی ہے جس میں نور اور ہدایت ہے دوسری چیز میرے اہل بیت ہیں۔ میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تمہیں خدا کو یاد دلاتا ہوں میں اپنے اہل بیت کے بارے میں.... میں اپنے اہل بیت کے بارے میں........."

(مولانا کوثر ندوی حاشیہ میں علامہ طیبی کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں کہ اس
جملہ کا مفہوم ہے۔ میں تمہیں متنبہ کرتا ہوں کہ میرے اہل بیت کے بارے میں
اللہ سے ڈرو)

اس کے بعد ندوی صاحب مسند احمد، سنن نسائی، سنن ترمذی، مستدرک، حاکم اور معجم کبیر
طبرانی کا ذکر کرتے ہوئے آگے ان الفاظ کی موجودگی کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ حضور نے فرمایا
کہ "جس کا میں مولا ہوں، علی بھی اس کے مولا ہیں۔ الٰہی جو علی سے محبت رکھے۔ اس سے تو بھی
محبت رکھ اور جو علی سے عداوت رکھے اس سے تو بھی عداوت رکھ۔"

خود امام ابو حامد محمد غزالی سر العارفین مطبوعہ بمبئی مقالہ رابعہ صفحہ ۹ کی آٹھویں سطر میں
رقمطراز ہیں کہ

"پیغمبر اسلام ﷺ نے غدیر خم کے روز فرمایا ہے"۔ "جس کا میں مولا علی بھی اس کا
مولیٰ ہے۔" اس وقت حضرت عمر خطاب نے کہا کہ "مبارک ہو" مبارک ہو۔ تمہیں اے علی! کہ تم
میرے مولیٰ اور تمام مومنین و مومنات کے مولیٰ ہو گئے۔"

(بحوالہ موعظۂ غدیر صفحہ ۵۶-۵۵)

اس کے بعد غزالی کہتے ہیں کہ "حضرت عمر کا علی کو اس طرح مبارک باد دینا رضا اور
تسلیم کی دلیل ہے اور علی کی ولایت اور خلافت پر اور اطاعت و انقیاد میں اپنی گردن کو پیش
کر دینا ہے۔

شیخ عبد الحق محدث دہلوی لمعات شرح مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے اس
میں کسی طرح کا شبہ نہیں ہے" (بحوالہ موعظۂ غدیر صفحہ ۸۲)

شیعہ فرقہ جو امامت اور خلافت کو بھی نبوت اور رسالت کی طرح منصوص من اللہ جانتا
ہے اور خدا ہی کے مقرر کئے ہوئے نبی اور امام کو پیغمبر اور برحق خلیفہ مانتا ہے اس حدیث پر پورا پورا
یقین رکھتا ہے اور اس امر کی دلیل میں اس کا یہ دعویٰ ہے کہ اسلام میں خلافت و نیابت رسول کے
لیے اگر نص کی ضرورت نہیں تھی تو پھر رسول اسلام نے ایسے اہتمام سے کیوں علی کی ولایت عہد کو
بطور نص کے اعلان کیا جس طرح خلفاء ثلاثہ کے لیے کوئی نص خلافت میں وارد نہیں ہوئی تھی۔ علی

کے واسطے بھی خلیفتی، وصیتی، منجز وعدی قاضی دینی یامن کنت مولاہ
فھذا علی المولاہ وغیرہ کے الفاظ سے وہ نص نہ کرتے۔

بہر حال اسی وجہ سے عید غدیر شیعوں کے نزدیک بہت ہی خوشی کا دن ہوتا
ہے۔ اس روز عام طور پر خوشی منائی جاتی ہے نئے کپڑے پہنے جاتے ہیں گھر میں بیٹھے اور عمدہ
پکوان پکائے جاتے ہیں جس پر حضرت علیؑ کی نذر دی جاتی ہے عام طور پر جشن منایا جاتا ہے
اور محافل مقاصدہ منعقد ہوتی ہیں ان میں حضرت علیؑ کی شان میں اور ان کی خلافت کے حقی
ہونے کے سلسلے میں مقصد کے لیے پڑھے جاتے ہیں۔ یہ محفلیں اکثر ساری ساری رات چلتی
ہیں۔ اس کے علاوہ اس عید میں نماز اور اعمال بے شمار ہیں۔

یہ عید شیعوں کے نزدیک تمام عیدوں سے بزرگ ہے۔ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ یہ وہ
روز ہے جس میں خدا نے حضرت ابراہیمؑ کو آگ سے نجات دی۔ اور انہوں نے شکر الٰہی میں
روزہ رکھا۔ اس روز خدا نے دین کو اس اس طرح کامل فرمایا کہ حضرت رسول خدا ﷺ نے
حضرت امیر المومنین کو منصب خلافت پر معین فرمایا اور ان کی فضیلت و جانشینی کو لوگوں پر ظاہر
فرمایا۔ اور اس دن روزہ رکھا۔ اس روز دین کامل ہوا۔ اس روز محبان آل رسول ﷺ اور
شیعوں کے اعمال قبول کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ جو شخص اس روز عبادت
خدا کرے اور اپنے عیال اور برادران ایمان کو اچھا کھانا کھلائے خدا اس کو جہنم سے آزاد کرتا
ہے خدا شیعوں کو ان کے اعمال کا اجر عطا کرتا ہے۔ لہٰذا شیعہ اس روز نمازیں پڑھتے
ہیں۔ اعمال کرتے ہیں اور روزہ رکھتے ہیں۔

شیعوں کا عقیدہ ہے کہ اس روز خدا ان کے غم زائل فرماتا ہے یہ دعاؤں کی مقبولیت،
بزرگی، اور نئے کپڑے پہننے اور گناہ بخشے جانے کا دن ہے اس لیے اس روز محمد ﷺ اور آل
محمد ﷺ پر کثرت سے درود بھیجنا چاہئے۔ یہ قبولیت اعمال، طلب زیادتی، ثواب، آرام،
تجارت، مومنین کے آپس میں دوستی کرنے، رحمت خدا سے ملحق ہونے، گناہان صغیرہ و کبیرہ کو
ترک کرنے، عبادت کرنے اور روزہ داروں کو افطار کرانے کا دن ہے۔"

(اصلاح جنوری ۶۰ء صفحہ ۳۲)

۳ ۔ عید مباھلہ

عید مباہلہ ماہ ذی الحجہ کے آخری ہفتے میں منائی جاتی ہے اس کے تعین میں خود شیعہ علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ (ایضاً صفحہ۴۳) لیکن مشہور اور معتبر چوبیسویں ذی الحجہ ہے اور بعض نے اکیسویں اور پچیسویں یا ستائیسویں بھی بتائی ہے بہرحال یہ عید اجتماعی طور پر چوبیسویں ذی الحجہ ہی کو منائی جاتی ہے۔

روزِ مباہلہ کی فضیلت و سعادت کا سبب شیعوں کے نزدیک یہ ہے کہ اس روز جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نجران کے نصاریٰ کو مباہلہ کی دعوت دی تھی۔ واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ نجران مکہ معظمہ سے یمن کی طرف سات منزل پر ایک وسیع ضلع ہے۔ جہاں عیسائی عرب آباد تھے۔ ملک عرب میں عیسائیوں کا سب سے بڑا مرکز یہی تھا۔ یہاں ایک عظیم الشان گرجا تھا۔ جس کو وہ کعبہ کہتے تھے۔ اور حرم کعبہ کا جواب سمجھتے تھے اس میں بڑے بڑے مذہبی پیشوا رہتے تھے۔ جن کا لقب سید اور عاقب تھا۔ ۹ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو دعوت اسلام کی خاطر ایک خط لکھا۔ تو اس کے محافظ آئمہ مذہب اور معززین کا ایک وفد جو ساٹھ آدمیوں پر مشتمل تھا۔ مدینہ منورہ آیا۔ ان میں لارڈ بشپ ابو حارثہ بھی تھا۔ ان لوگوں نے آنحضرت سے مختلف مذہبی باتیں پوچھیں۔ آپ نے وحیٔ الٰہی سے جواب دیا۔ اس سلسلہ میں سورۂ آل عمران کی ابتدائی اسّی آیتیں اتریں۔ وفد کا مرکزی مسئلہ یہ تھا کہ عیسیٰ خدا تھے۔ آپ نے جواب میں آیات قرآنی پڑھیں۔ جن میں دلائل ناطقہ کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ مسیح اللہ کے بندے ہیں۔ خدا نہیں۔ بغیر باپ کے پیدا ہونا اس بات کا ثبوت نہیں کہ وہ خدا ہیں آخر آدم کا بھی تو کوئی باپ نہیں۔ مسیح کا پیدا ہونا تو خود ایک ثبوت ہے کہ وہ مخلوق ہیں خدا نہیں۔ لیکن عیسائیوں کا یہ وفد دلائل ناطقہ سننے کے باوجود اپنی بات پر اڑا رہا۔ اور ہٹ دھرمی سے باز نہ آیا۔ اس پر آیت مباہلہ نازل ہوئی۔ جو سورۂ آل عمران رکوع ۶ آیت ۶۱ میں موجود ہے۔

فَمَنْ حاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآئَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوا نَدْعُ اَبْنَآئَنَا وَاَبْنَآئَكُمْ وَنِسَآئَنَا وَنِسَائَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَةَ اللهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ ○

(جو شخص حضرت عیسیٰ کے بارے میں اے رسول! تمہاری طرف علم آنے اور اس پر استدلال کے بعد بھی اس کو قبول نہ کرے اور کٹ حجتی کرے تو اس سے کہہ دو کہ آؤ تم اپنے بیٹوں کو، ہم اپنے بیٹوں کو، تم اپنی عورتوں کو ہم اپنی عورتوں کو تم اپنے نفسوں کو ہم اپنے نفسوں کو بلائیں۔ پھر الحاح وزاری کے ساتھ فریقین میں سے جو لوگ جھوٹے ہوں ان پر لعنت اور رحمتِ خدا سے دوری کے لیے بددعا کریں۔

پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت علیؑ، حضرت فاطمہؑ اور امام حسینؑ کو گھر سے لے کر تشریف لائے۔ اور دوش مبارک پر عبا ڈالی اور حضرت امیر المومنین و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ کو عبا کو نیچے داخل کیا اور کہا۔ ''خداوندا! ہر پیغمبر کے کچھ اہل بیت تھے۔ جو تمام دنیا سے زیادہ ان سے خصوصیت رکھتے تھے اور میرے اہل بیت یہ ہیں لہذا ان سے شک اور گناہ کو دور رکھ۔ اور ان کو ایسا پاک رکھ جو پاک رکھنے کا حق ہے'' اس وقت جبرئیل نازل ہوئے۔ اور آیۂ تطہیر اہل بیت کی شان میں لائے پھر آپ نے اہل بیت سے فرمایا کہ ''جب میں مباہلہ کی دعا مانگوں تو تم لوگ آمین کہنا۔''

چونکہ نصاریٰ آنحضرت کی حقانیت کو سمجھ چکے تھے۔ اور مقام مباہلہ میں ان بزرگواروں کے ساتھ آنحضرت کے کھڑے ہونے سے نزول عذاب کے آثار زمین و آسمان سے ظاہر ہونے لگے تھے۔ لہٰذا ان کے سب سے بڑے عالم نے کہا کہ ''خدا کی قسم میں چند ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں کہ اگر وہ دعا کر دیں تو پہاڑ اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں۔ لہذا مباہلہ نہ کرو ورنہ غارت ہو جاؤ گے۔

پس عیسائی مباہلہ سے ہٹ گئے۔ اور صلح کر کے ہر سال جزیہ دینا منظور کیا۔ چنانچہ حضور نے ان کے لیے بددعا نہیں کی۔

تاریخ عالم کے اس عظیم واقعہ کی یاد منانے کا شرف صرف شیعوں کو حاصل ہے اس واقعہ سے کئی حقیقتیں دنیا والوں پر ظاہر ہو گئیں۔ اوّل یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقانیت کیونکہ اگر آپ کو اپنی صداقت پر اعتماد نہ ہوتا تو اپنے کو اور اپنے عزیز ترین اہل بیت کو مباہلہ کے موقع پر باہر نہ لاتے۔ اور اگر اس جماعت پر آنحضرت کی سچائی ظاہر نہ ہو گئی ہوتی تو وہ مباہلہ کرتے۔ اور جزیہ کی توہین گوارا نہ کرتے۔ دوم یہ کہ پنجتن پاک سارے مخلوقات سے بزرگ و برتر تھے۔ کیونکہ

رسول ﷺ نے ان کو اپنی دعاؤں میں شریک کیا۔ سوم یہ کہ یہ حضرات آنحضرت ﷺ کو کائنات میں سب سے زیادہ عزیز تھے کہ اپنی حقانیت کے اظہار کے موقعہ پر لے آئے۔ کیونکہ آدمی اکثر اپنے آپ کو خطرات میں ڈال دیتا ہے۔ لیکن اپنے اعزہ اور عیال کو معرض خطر میں لانا گوارا نہیں کرتا۔ چہارم یہ کہ آنحضرت ﷺ نے خود امام حسنؑ اور امام حسینؑ کو اپنا فرزند بتایا ہے اور ان کا مرتبہ خدا اور رسول کے نزدیک اس کم سنی میں بھی تمام صحابہ سے بلند تھا۔ پنجم یہ کہ حضرت فاطمہؑ تمام عورتوں سے بہتر تھیں اور رسول ﷺ کے ساتھ ان کی ازواج اور دوسری قرابت دار عورتوں سے زیادہ خصوصیت اور قربت رکھتی تھیں۔ اور خدا کے نزدیک ان کی منزلت سب سے زیادہ تھی۔ ششم یہ کہ بالاتفاق فریقین حضرت امیر المومنینؑ مباہلہ میں شامل تھے اور ابناء و نساء میں داخل نہیں تھے۔ لہٰذا مطلب یہ ہے کہ حضرت کو جناب رسالت مآب ﷺ سے کمالات و صفات میں اتنی خصوصیات حاصل تھیں کہ نفس اور جان کی جگہ تھے۔ (اصلاح جنوری' فروری ۶۰ء صفحہ ۱۴۵) ہفتم یہ کہ یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ اہل بیت سے مراد صرف حضرت علیؑ حضرت فاطمہؑ اور حسنینؑ ہیں۔ وہ لوگ جو ازواج رسول کو اس میں شامل کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ وہ بڑی فاش غلطی کرتے ہیں۔ مولانا کوثر ندوی اس کی وضاحت فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''خاص الخاص اہل بیت وہی ہیں جن میں یہ دو امتیازی جوہر ہوں (۱) اپنی پیدائش کے دن ہی سے اہل بیت ہوں (۲) ان سے بیت نبوی یعنی نسل رسول کا سلسلہ قائم ہو۔ ایسے اہل بیت صرف فاطمہؑ حسنینؑ کریمین اور حضرت علیؑ ہیں کہ یہ مقدس حضرات پیدائش کے دن ہی سے اہل بیت نبوی ہیں۔ اور حضور کی نسل مطہرہ کا سلسلہ انہیں سے جاری ہے۔ ایسے خصوصی اور امتیازی اوصاف والے اہل بیت ازواج نبوی ہیں اور نہ دیگر اولاد عبد المطلب جو حضرت علیؑ حضرت فاطمہؑ اور حسنین کریمین کے علاوہ ہیں کہ ازواجِ نبوی اپنی پیدائش کے دن سے اہل بیت نہیں یہ تو نکاح کے بعد اہل نبوی میں داخل ہوئیں۔ اور آل عبا (یعنی حضرت علیؑ' حضرت فاطمہؑ اور حسنینؑ) کے علاوہ کوئی بھی اولاد عبد المطلب ایسی نہیں جس سے نسل رسولؐ جاری ہوئی ہے۔ اس تشریح سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ خاص الخاص اہل بیت جن میں اہل بیت کی دو خاص الخاص صفتیں پائی جاتی ہیں۔ صرف حضرت علیؑ، حضرت فاطمہؑ اور حسنینؑ ہیں۔ اسی لیے جب اہل بیت کا

لفظ آتا ہے تو یہی چار حضرات مراد ہوتے ہیں۔

(مناقب اہل بیت۔ از مولانا کوثر ندوی صفحہ ۶۷ (حاشیہ)

شیعہ چونکہ اہل بیت کرام ہی کے پیرو ہیں۔ لہٰذا واقعہ مباہلہ کے ظہور پر ان کا عید منانا اپنی جگہ بڑا درست ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور واقعہ بھی اسی روز پیش آیا۔ اور وہ یہ کہ کسی روز امیر المومنین نے حالت رکوع میں اپنی انگوٹھی سائل کو عطا کی۔ اور یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی۔

اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَهُمْ رَاکِعُوْن۔ (یعنی تمہارے امور میں اولیٰ بالتصرف اور صاحب اختیار صرف اللہ اور اس کا رسول اور حضرات ہیں جو ایمان لائے ہیں۔ نماز کو قائم کرتے ہیں اور رکوع میں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں)

شیعہ اس روز خاص طور پر غسل کرتے ہیں۔ اور نماز پڑھتے ہیں۔ اور روزہ رکھنا مستحب جانتے ہیں۔ اور حضرت علیؑ کی پیروی میں فقیروں کو اور محتاجوں پر حسب حیثیت تصدق کرتے ہیں۔ اچھے کپڑے پہن کر انہیں خوشبو سے معطر کرتے ہیں۔ امام باڑوں میں جاتے ہیں۔ یا کسی تنہائی کی جگہ یا بلند پہاڑ یا کسی صحرا میں جاتے ہیں۔

۴۔ عید میلاد علیؑ

تیرہ رجب حضرت علیؑ کی ولادت کی تاریخ ہے ولادت حضرت علیؑ پر عید منانے کا خاص سبب شیعوں کے نزدیک یہ ہے کہ آپ کی ولادت مکہ معظمہ میں خاص کعبہ کے اندر ہوئی۔ اور آپ سے پہلے اور آپ کے بعد کوئی بچہ خانۂ کعبہ میں آپ کے سوا پیدا نہیں ہوا۔ اللہ کی طرف سے یہی آپ کی بزرگی اور عظمت کا اظہار ہے۔ مشہور شیعہ عالم شیخ مفیدؒ بغدادی کے علاوہ بہت سے سنّی علماء مثلاً ابوالحسن علی بن حسین، بن علی مسعودی نے بھی اپنی مشہور کتاب ''مروج الذہب'' میں اس کا اقرار کیا ہے۔ اس کے علاوہ شیخ مفید کے ہم عصر محدث اہل سنت ابو عبد اللہ الحاکم محمد بن عبد اللہ بن محمد الضبی نیشاپوری' جنہیں فنِ حدیث کا امام مانا گیا ہے۔ اپنی مشہور کتاب ''مستدرک'' میں

صراحتہً اس واقعہ کے بتواتر ثابت ہونے کا اظہار کرتے ہیں۔ ہندوستان کے محدث شاہ ولی اللہ دہلوی نے ان ہی الفاظ میں ''ازالۃ الخفاء'' کو دہرایا ہے۔ (بحوالہ امیر المومنین کی ولادت ازمولانا سید علی نقی۔ کاروان حیات مولا علیؑ نمبر ۲۵ ردسمبر ۱۹۷۷ء صفحہ ۵۰)

اس واقعہ پر پنڈت وشوناتھ پرشاد ماتھر نے بڑے خوبصورت انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں۔

''اس حقیقت سے بھی دنیا انکار نہیں کرسکتی کہ عبادت گاہیں پرستش پوجا یا عبادت کے لیے ہوتی ہیں۔ صرف کعبہ پر منحصر نہیں۔ آج تک کسی مسجد کسی گردوارے یا کسی گرجا گھر میں کسی بچہ کی ولادت آپ نے نہیں سنی ہوگی اس لیے علیؑ کی ولادت کا کعبہ میں ہونا صرف تاریخ اسلام کی انوکھی بات نہیں ہے۔ بلکہ دنیا میں ازل سے اب تک علیؑ کے ماسوا اور کوئی بچہ کسی عبادت گاہ میں پیدا نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ جن کو عیسائی حضرات خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔ ان کے نقطۂ نظر سے حضرت عیسیٰ کو خدا کے گھر میں پیدا ہونے کا سب سے حق حاصل ہوسکتا ہے۔ اس لیے کہ وہ عیسائیوں کے نقطۂ نظر سے جب خدا کے بیٹے تھے تو ان کو اگر بیت المقدس میں نہ سہی تو کسی بڑے گرجا گھر میں تو یقیناً پیدا ہی ہونا چاہئے تھا۔ مگر انجیل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی والدہ حضرت مریم جب وضع حمل کے عالم میں بیت المقدس کے دروازے پر پہنچیں تو قرآن مجید کے بقول خدا کی یہ آواز آئی کہ ''اے مریم! یہ عبادت کا گھر ہے زچہ خانہ نہیں ہے...... حضرت علیؑ کی یہ فضیلت کہ ان کی ولادت کعبہ میں ہوئی اور انہوں نے کعبہ کو بتوں سے پاک کرکے خدا کا گھر بنا کر چھوڑا ضرور امتیازی حیثیت رکھتی ہے''۔ (سرفراز رجب نمبر ۱۳۸۳ھ صفحہ ۳۰-۳۱ کعبہ اور مولود کعبہ از وشوناتھ پرشاد ماتھر لکھنوی)

شیعہ شعراء نے اپنی تخلیقات کے ذریعے اردو ادب کو اس اہم واقعہ سے مالا مال کردیا ہے۔

اس عظیم واقعہ کی خوشی میں شیعیان علیؑ عید میلاد علیؑ مناتے ہیں اور خوشیوں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ہر طرف چراغاں کرتے ہیں نئے کپڑے پہنتے ہیں۔ حضرت علیؑ کی نذر دلاتے ہیں۔ اور محفل مقاصدہ منعقد کرتے ہیں جس میں سلام اور قصیدے حضرت علیؑ کی شان میں پڑھے جاتے ہیں۔ رات میں نمازیں بھی پڑھی جاتی ہیں اور اعمال بھی کئے جاتے ہیں۔

۵۔ عید شعبان

عید شعبان ماہ شعبان کی چودہ تاریخ یعنی پندرھویں شب کو منائی جاتی ہے۔ یعنی ٹھیک شب برأت کو۔ شیعوں کے نزدیک اس عید کی دہری اہمیت ہے۔ ایک تو شب برأت کی وجہ سے دوسرے اس رات شیعوں کے بارھویں امام، امام مہدیؑ کی آخر الزماں کی ولادت باسعادت ہوئی۔ سنیوں کے عقیدے کے مطابق امام مہدیؑ قیامت سے کچھ قبل پیدا ہونگے۔ لیکن شیعوں کا عقیدہ یہ ہے کہ آپ پیدا ہوچکے ہیں اور بارہ سال کی عمر میں غیبت اختیار کرلی اور اب قیامت سے پہلے آپ کی ولادت نہیں بلکہ ظہور ہوگا۔ تاریخ ولادت ۱۵رشعبان خیال کی جاتی ہے اور اسی خوشی میں عید شعبان منائی جاتی ہے۔

امام آخر کی ولادت حضرت موسیٰ کی طرح پوشیدہ ہوئی۔ جناب امام علی نقیؑ کی بہن جناب حکیمہ خاتون بیان فرماتی ہیں کہ جب بعد میرے بھائی کے میرا بھتیجہ (جناب امام حسن عسکری) امام علیؑ ہوا تو میں اسی طرح ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتی تھی جس طرح اپنے بھائی کی خدمت میں جاتی تھی۔ شعبان کی پندرھویں کو جناب امام حسن عسکری نے مجھ سے فرمایا کہ ''اے پھوپھی! آج قائم آل محمدﷺ کی ولادت ہوگی۔ میں نے پوچھا کس بی بی سے۔ فرمایا نرجس خاتونؑ سے۔ میں نے عرض کیا میں اس بی بی سے مطلقاً آثار حمل نہیں پاتی حضرت نے فرمایا کہ خلاق عالم نے حضرت موسیٰ کی طرح اس مولود مسعود کے حمل کو بھی لوگوں سے پوشیدہ رکھا ہے جب صبح صادق قریب ہوئی تو نرجس خاتونؑ نے کہا کہ مجھ میں آثار ولادت نمایاں ہوئے ہیں۔ پس یکا یک ہمارے مابین ایک پردہ حائل ہوگیا۔ اور وہ مولود مسعود پیدا ہوا۔

(ماہنامہ ابرہان ستمبر ۱۹۱۲ء (ازمولوی سید محمد سبطین سرسوی))

اسی طرح سمندر پر ان کے تسلط کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ جب جناب امام حسن عسکری شہید ہوئے تو خلیفہ معتمد عباسی نے سب سے پہلے یہ حکم دیا کہ ان کے گھر جا کر تلاش کریں۔ کہ ان کا کوئی فرزند یا حمل تو نہیں ہے حضرت کی ولادت سے لوگوں کو پوشیدہ رکھا گیا تھا۔ کیونکہ خلفائے بنی عباس اور دیگر مسلمان خوب جانتے تھے کہ بارھویں امام کی نسبت رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ آں جناب کے ہاتھ سے دشمنان آلِ رسول ﷺ کو خداوند عالم ذلیل و خوار کرے گا۔ اس لیے جناب امام حسن عسکری کے فرزند سے ان کو نہایت تشویش تھی۔ جب لوگ حضرت کے گھر میں داخل ہوئے تو عورتوں نے حضرت کو چھپا لیا اور ایک کنیز باتمیز نے یہ ظاہر کیا کہ ہاں مجھے حمل ہے۔ بس اس کنیز کو معتمد کے گھر لے گئے۔ معتمد نے دائیوں کو بلوایا۔ پس بعد تحقیق کے معلوم ہوا کہ حمل نہیں ہے۔ اتنے میں معتمد کو بصرے کا واقعہ درپیش آیا پس اس کی مصروفیت کی وجہ سے زیادہ تحقیقات ملتوی رہی۔ بعد معتمد کے جب معتضد کا زمانہ ہوا تو اس نے رشیق کے ہمراہ دو شخصوں کو سامرہ بھیجا کہ امام حسن عسکری کے مکان میں جا کر دیکھو اور جو شخص ہو اس کا سر میرے پاس لے آؤ۔ رشیق بیان کرتا ہے کہ جب ہم سامرہ میں پہنچے اور مکان کے اندر داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک تالاب ہے جس پر ایک جوانِ رعنا مصلے بچھائے ہوئے نماز پڑھ رہا ہے۔ احمد بن عبداللہ نے اس جوان تک جانے کا قصد کیا۔ اور پانی میں قدم رکھا۔ پانی میں داخل ہوتے ہی غوطہ کھانے لگا۔ اس کو دیکھ کر میں نے ہاتھ بڑھا کر کھینچ لیا۔ باہر آتے ہی بے ہوش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب اسے افاقہ ہوا تو دوسرے شخص نے اس جوان حسین کا قصد کیا۔ اس پر بھی یہی ماجرا گزرا۔ یہ معجزہ دیکھ کر میں نے بہت کچھ معذرت اور توبہ کی۔ مگر جناب صاحب الامرؑ نے کچھ توجہ نہیں فرمائی۔

پس ہم نہایت خائف اور ہراساں لوٹے۔ اور رات کے وقت معتضد کے پاس پہنچے۔ اور سارا ماجرا بیان کیا۔ تو معتضد نے پوچھا کہ تم نے یہ کیفیت کسی اور شخص سے تو نہیں بیان کی؟ ہم نے کہا نہیں۔ پس سخت قسم کھا کر کہنے لگا کہ اگر میں نے سنا کہ تم نے کسی سے اس کا ذکر کیا تو تم سب کی گردن مار دونگا۔ پس جب تک معتضد زندہ رہا ہم کسی سے یہ واقعہ بیان نہ کر سکے۔

(البرہان ستمبر ۱۹۱۲ء صفحہ ۲۶ تا ۲۴)

اس غیبت صغریٰ میں آپ اپنے سفیروں کے ذریعہ سے لوگوں کو ہدایت فرماتے تھے۔ جن میں سے عثمان بن سعید' ابوجعفر' محمد بن عثمان' ابوالقاسم حسین بن روح اور شیخ جلیل علی بن محمد سمری مشہور ہیں۔

بعد میں شیعوں کے عقیدے کے مطابق امام مہدیؑ نے غیبت کبریٰ اختیار کر لی۔ یعنی آج تک غیبت میں ہیں۔ اور قیامت سے پہلے ظہور فرمائیں گے۔ آپ کے ساتھ حضرت عیسیٰ بھی دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے۔ آپ ایک بار پھر ساری دنیا میں اسلامی عقائد کو عام فرمائیں گے۔

شیعہ شعبان کی پندرھویں شب کو شب برات کے ساتھ ساتھ میلاد امام آخر کی خوشی بھی مناتے ہیں۔ اور ساری رات نماز اور عبادت میں گذار دیتے ہیں۔ آدھی رات کے قریب امام مہدی کی نذر دی جاتی ہے۔ کونڈے بھرے جاتے ہیں اور عریضہ دریا برد کیا جاتا ہے کیونکہ شیعوں کے عقیدے اور مذکورہ بالا روایت سے ظاہر ہے کہ امام آخر کا تسلط سمندر پر ہے۔ لہٰذا شیعہ اپنی منتیں یا مرادیں مانگنے کی خاطر کسی پاک صاف کاغذ پر زعفران سے اپنا مدعائے دلی تحریر کرتے ہیں۔ اور اس عریضہ کو دعاؤں کے بعد قبلہ رو کر سمندر میں ڈال دیتے ہیں۔ اس رات ولادت امام کی خوشی میں چراغاں بھی کیا جاتا ہے اور پٹاخے بھی داغے جاتے ہیں۔ شب برات نے اس رات کی اہمیت کو اور بڑھا دیا ہے۔

٦۔ عیدِ ثانیٔ زہراؑ

عید ثانیٔ زہراؑ کی تاریخ بڑے دردناک پہلوؤں کی طرف اشارہ کناں ہے۔ کربلا کا وہ واقعہ خون آشام جب امام مظلوم معہ اپنے بہتر ساتھیوں کے شہید ہو گئے۔ اور اسلام کو بقائے دوام عطا کر گئے تو اشقیاء نے آپ کی شہادت کے بعد ظلم کی انتہا کر دی۔ خیمے لوٹے گئے۔ ناموس اہل بیت کو کوفہ و شام کے بازاروں میں ننگے سر پھرایا گیا۔ امام حسینؑ کا سر مبارک نیزے پر بلند کیا گیا۔ جناب امام زین العابدین کے گلے میں طوق ڈالا گیا۔ اور ہر ممکن و ناممکن طریقے سے اہل بیت رسول ﷺ کی تذلیل کی گئی۔ یہاں تک کہ اسیرانِ حرم یزید کی قید میں ایک عرصہ تک

رہے جب رہا ہو کر مدینہ پہنچے تو اس لٹے ہوئے قافلے والوں کی طرح جن کے چہروں سے شادابی رخصت ہو چکی تھی۔ خوشی کی ایک ہلکی سی رمق باقی تھی۔ اور ہونٹوں پر ہنسی کا دور تک نام ونشان نہ تھا۔ ایک مدت تک ثانی زہراؑ جناب زینبؑ جو شروع سے آخر تک اپنے بھائی کے مشن میں ان کی سچی ہم درد غم گسار اور معاون ومددگار رہیں۔ تمام واقعاتِ خوں چکاں کو یاد کر کے گریہ وزاری کرتی رہیں۔ اور دن رات مجلس عزا برپا کرنے کے علاوہ کوئی مشغلہ نہ تھا۔ یہاں تک کہ مدینہ بیت الحزن بن گیا لیکن

جو چپ رہے گی زبان خنجر
لہو پکارے گا آستیں کا

کے مصداق حضرت امام حسینؑ کے بے گناہ لہو کا داغ یزید کے دامن پر دھلنے کی بجائے روز بروز گہرا ہوتا گیا۔ اور تاریخ میں ایک وقت وہ بھی آیا جب محبّ اہل بیتؑ جاں نثار حسینؑ اور عاشق حق وحقانیت مختار ثقفیؒ کے ہاتھوں میں عنانِ حکومت آئی اور اس مرد شریف نے قاتلانِ حسینؑ وانصارانِ حسینؑ کو ان کے کیفر کردار تک پہنچا دیا۔ مولانا سید نجم الحسن جناب مختار کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ

"حضرت مختار ابن عبیدہ ثقفی نے اپنی زندگی میں جو ایمان افروز کارنامے انجام دیئے ہیں وہ تاریخی اہمیت کے لحاظ سے اپنی مثال نہیں رکھتے.........

دنیا میں ان کے سوا ایسی کوئی ہستی نہیں جس نے شریکۃ الحسینؑ حضرت زینب وامّ کلثومؑ کے دلوں سے رنج وغم کے ان نہ ہٹنے والے بادلوں کو کچھ نہ کچھ چھانٹ دیا۔ جو واقعہ کربلا کو بچشم خود دیکھنے اور قیدِ شام کی مصیبتوں کے جھیلنے اور بے پردگی کی تکلیف برداشت کرنے سے چھا گئے تھے۔ یہی وہ ہستی تھی جس نے سرِ ابنِ زیاد وابن سعد وغیرہ ہی بھیج کر حضرت امام زین العابدینؑ کی پیشانی مبارک سجدہ شکر میں جھکا دی اور ان کا دل اس طرح ٹھنڈا کیا کہ انہوں نے فرطِ مسرّت سے ان مخدرات عصمت وطہارت کو جو محرم ۶۱ھ سے ربیع الاول ۶۷ھ تک غم کے لباس میں تھیں سر میں تیل ڈالنے، آنکھوں میں سرمہ لگانے اور مناسب کپڑے بدلنے کا حکم دے کر ۹ ربیع الاوّل کو یومِ عید قرار دے دیا۔"

(سرفراز محرم نمبر ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۹۰ھ صفحہ ۵ مختار آل محمد سید نجم الحسن کراروی)

۹ ربیع الاوّل کا دن ہی وہ روز سعید ہے جب واقعہ کربلا کے بعد سے پہلی مرتبہ افسردہ و مصیبت زدہ بنت زہراؑ کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آئی اور چہرے پر بشاشت کی لہر دکھائی دی آپ نے شہادت حسینؑ کے بعد سے پہلی مرتبہ اس روز سیاہ پوشی ختم کر کے کپڑے بدلے۔ اور خوشی کا اظہار فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ حضرات اس روز عید مناتے ہیں اور قاتلانِ حسینؑ کے قلع قمع ہونے کا جشن مناتے ہیں اس عید کو عید ثانی زہرا کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس موقعہ پر بے انتہا خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ محرم سے ربیع الاوّل تک سیہ پوشی اختیار کرنے کے بعد شیعہ نئے اور شوخ رنگوں والے کپڑے پہنتے ہیں۔

خوشبوجات کا استعمال ہوتا ہے۔ بعض جگہوں پر رنگ کھیلا جاتا ہے۔ عورتیں زیور پہنتی ہیں عمدہ اور میٹھے پکوان پکائے جاتے ہیں۔ سیر وتفریح کی جاتی ہے جشن منایا جاتا ہے اور دشمنانِ اہل بیت پر تبرا بھیجا جاتا ہے۔

اردو شاعری میں اس موقع پر ایک مخصوص صنف ہرثیہ کو پنپنے کا موقع ملا۔ جو مرثیہ کے متوازی پرورش پاتی رہی۔

ب۔ تعزیتی مراسم (عزاداری)

۱۔ عزاداری کا تاریخی پس منظر:

تاریخ گواہ ہے کہ تعزیت کی رسم ہر قوم اور ہر ملت میں قدیم ایام سے چلی آرہی ہے۔ مہذب اقوام اور غیر متمدن اور وحشی قوموں سے لے کر جانور اور چرند پرند تک اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ مثلاً کوے اور بندر اپنے قوم کے کسی فرد کے مرنے پر خاص مظاہرہ کرتے ہیں کسی ایک مکوڑے کو مار دیجئے تو اس کے ہم قوم سینکڑوں کی تعداد میں جمع ہو کر اس کی لاش گھسیٹتے ہوئے جلوس کی شکل میں چلیں گے۔ اس سے ظاہر ہے کہ تعزیت ایک نفسیاتی عمل ہے۔ جس پر کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔

تعزیت کے اس افادی اور اہم پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا سید احمد فرماتے ہیں

''تعزیت میت کے پرستاروں' عزیزوں کے غم میں شرکت اور ان کی تسلی کا باعث ہے تعزیت میت کی خوبیوں کو سراہ کر اس کی قدر افزائی کرنا ہے تعزیت میں میت کے اچھے صفات کو یاد دلا کر دوسروں کو اچھائی کی تعلیم اور خود کو اچھائیوں سے منصف کرنے کی کوشش ہے تعزیت میں مرنے والے کے تاریخی حالات کا تذکرہ اور تاریخی دلچسپیوں کا فراہم کرنا ہے۔ تعزیت میں مرنے والے کا قوم سے تعارف کرانا ہے یہی وجہ ہے کہ حکماء وفلاسفہ تک نے تعزیت کر کے دوسروں کو تعلیم دی۔ اپنی نکتہ رسی اور تحقیق کا ثبوت دیا۔ تعزیت سے مرنے والے کی تاریخ قائم کی۔'' (سرفراز محرم تمبر ۱۳۵۵ھ صفحہ ۸)

اس ضمن میں مولانا عبدالحلیم شرر کا مضمون ''سکندر کی موت'' کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ۔ جب تاریخ عالم کا یہ فاتح اعظم دنیا سے رخصت ہو تو اس کے وزیر خاص فیلیمین فیلسوف نے اس کی نعش کو سونے کے تابوت کے اندر رکھ کر تمام حکماء وفلاسفر اور امراء و وزراء کو جمع کر کے مختصر جملوں میں تعزیت کی رسم کی ابتدا کی ۔ جب مادی دنیا کے فاتح اعظم کی تعریف وتعزیت اتنے طریقوں سے کی جاسکتی ہے تو کوئی تعجب نہیں۔ گر روحانی دنیا کے شہید اعظم امام حسینؑ کی شہادت پر تعزیتی مراسم کا سلسلہ آج تک جاری وساری ہے۔ ویسے بھی نفسیاتی نقطہ نظر سے رونا' فاقہ کرنا اور تکلیف میں رہنا بہترین عبادت ہے اس سے انسان کی روحانیت کو جلا ملتی ہے۔ خود قرآن مجید نے رونے کی تعلیم دی ہے۔ حدیث وقرآن سے معیت قرآن واہل بیت ثابت ہے۔ اگر مسلمانوں کا سال گریہ وبکائے حسینؑ کے ساتھ شروع ہوتا ہے تو کیا امر تعجب ہے کہ خود قرآن کی ابتدا بھی الف لام میم یعنی سورت ام آل محمد ﷺ سے ہوتی ہے۔

رونا آنکھ سے آنسو نکلنے کا دوسرا نام ہے۔ اور آنسو دو طریقوں سے نکلتے ہیں ایک اس وقت جبکہ کسی روحانی اذیت سے انسان کا دل متاثر ہو۔ دوم کسی جسمانی تکلیف سے۔ انسانیت کا اعلیٰ معیار یہی ہے ہے کہ وہ کسی سانحہ غم سے بہ نسبت کسی واقعہ' مسرت کے زیادہ متاثر ہوتی ہے۔ کسی شخص کو خوش حال دیکھ کر ہمارے دل پر اس کا اتنا اثر نہیں ہوتا جتنا کسی فلاکت زدہ کی داستان غم

والم سن کر اور اس سے بھی سب سے بڑا غم کسی کی موت کا ہوتا ہے اور موت بھی ایسے شخص کی زیادہ متاثر کن ہوتی ہے جس کے مرنے سے عالم انسانی کا زبردست نقصان ہوا ہو۔ اور امام حسینؑ کی شہادت سے بڑھ کر دنیا میں کوئی سانحہ اتنا الم انگیز نہیں کہ جس پر تا قیامت ماتم کیا جائے۔ تب بھی یہ غم کم نہ ہوگا۔ اسی لیے امام حسینؑ کی شہادت عام مسلمانوں کے لیے ایک سانحہ عظیم سے کم اہمیت نہیں رکھتی اور اس موقع پر گریہ ایک فطری عمل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس پر اعتراض کرنا ایک ایک حماقت اور شاتت سے کم نہیں۔ جبکہ قرآن وحدیث کی متعدد مثالیں اس کی موافقت میں ملتی ہیں۔

فرعون اور اس کی قوم کے غرق ہونے پر قرآن مجید میں خدائے تعالیٰ فرماتا ہے

فَمَـا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ وَمَا كَانُوا مُنْظَرِيْنَ ۝ (ان پر زمین اور آسمان نے گریہ نہ کیا اور نہ ان کو مہلت دی گئی) سورۂ دخان رکوع ۔۱

اس سے صاف ظاہر ہے کہ زمین وآسمان بھی گریہ کرتے ہیں۔ لیکن فرعون اور اس کی قوم پر آسمان وزمین نے گریہ نہیں کیا۔ اگر آسمان وزمین روتے ہی نہیں تو معاذ اللہ یہ کلام ربانی مہمل ہو جائے گا۔ اور کوئی مسلمان اس کے لیے تیار نہ ہوگا۔ ایک اور موقع پر ارشاد ہوا ہے۔

اِنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى (اور تحقیق کہ وہ (خدا) انسان کو ہنساتا اور رُلاتا ہے۔ (سورہ نجم)

یعنی جب خدائے تعالیٰ ہم کو ہنساتا اور رلاتا ہے تو کیونکر ہوسکتا ہے کہ رونا حرام ہے۔

فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا (ہنسو تھوڑا اور رو بہت) اگر رونا حرام ہوتا تو خدا رونے اور بہت رونے کا حکم کیوں دیتا

اکثر انبیاء علیہم السلام نے بھی گریہ کیا ہے سب سے پہلے ابوالبشر حضرت آدمؑ اور اُم الناس حضرت حوا روئیں حضرت یعقوبؑ فراق یوسف میں اس قدر روئے کہ آنکھیں سفید ہوگئیں۔ اور حضرت یوسفؑ زنداں میں بارہ برس روئے۔ حضرت شعیب علیہ السلام اس قدر روئے کہ آنکھیں جاتی رہیں۔ حضرت نوح نے اس قدر نوحہ فرمایا کہ ان کا اسم مبارک نوحؑ ہوگیا۔ حضرت ابراہیم کے سامنے جب کوئی یا اللہ کہہ دیتا تو آپ اس قدر گریہ فرماتے کہ ریش مقدس اشکوں سے تر ہو جاتی خود سرکار دو عالم ﷺ نے اپنے چچا ابو طالب' حضرت حمزہ' چچی فاطمہ بنت اسد' ماں حضرت آمنہ' بی بی حضرت خدیجہ' فرزندان قاسم وابراہیم کی وفات پر گریہ فرمایا ہے (تذکرہ

خواص الامہ قلمی صفحہ ۳۱۶ مدارج جلد ۲ صفحہ ۶۰۸ بخاری جلد اوّل صفحہ ۴۷ مطبوعہ احمدی میرٹھ۔ کتاب جذب القلوب الی دیار المحبوب مخ مکیہ وغیرہ) اور وفات سرکار دو عالم ﷺ پر سطر ۶ مطبوعہ رنگین پریس دہلی۔ بخاری جلد اوّل صفحہ ۵۱۸۔ ۵۱۷ مطبوعہ احمد میرٹھ) حضرت ابوبکر مدت العمر رسول اللہ کو روتے رہے (تاریخ طبری) یہی حال دیگر صحابہ کرام کا تھا (بخاری جلد اوّل)

حضرت حمزہ کی شہادت پر رسول اکرم ﷺ کا گریہ تو بھلایا نہیں جاسکتا مولانا حافظ اخلاق حسین قاسمی لکھتے ہیں۔

”جنگ ختم ہوگئی۔ حضور اکرم ﷺ نے شہداء کی تجہیز و تکفین شروع کی۔ غیروں کی بے کسی پر آنسو بہانے والا بھتیجہ جب اپنے پیارے چچا کی لاش پر آیا جس کی ذات سے اسلام کو قوت حاصل ہوتی تھی۔ تو اس محسن اسلام کو نہایت دردناک صورت میں دیکھا۔ دوسرا ہوتا تو اس کا کلیجہ پھٹ جاتا۔ صبر وضبط کے پتلے نے طبیعت کو سنبھالا۔ مگر آنکھوں پر قابو نہ رہا رونے لگے۔“

(شہدائے اسلام مؤلفہ مولانا حافظ اخلاق حسین قاسمی صفحہ ۱۸۔ ۱۷ اسنٹرل بک ڈپو دہلی طبع اول)

اور یہی نہیں بلکہ روایت ہے کہ جب اُحد کے شہیدوں پر انصار کی عورتوں نے نوحہ وماتم شروع کیا۔ اور ان کے رونے کی آواز حضرت ﷺ کے کان میں آئی تو بڑی حسرت سے یہ فرمایا۔ "یا انا الحمزہ فلا بوا کی " (افسوس! میرے چچا حمزہ پر کوئی رونے والا نہیں) یہ سن کر انصار اپنے گھروں میں پہنچے اور اپنی عورتوں سے کہا کہ پہلے حضرت ﷺ کے چچا پر جا کر روؤ بعد کو اپنے مردوں پر نوحہ کرنا۔ چنانچہ عورتوں نے ایسا ہی کیا۔

جب آنحضرت ﷺ نے حمزہ کے گھر سے رونے کی آواز سنی اور آپ کو معلوم ہوا کہ زنانِ انصار میرے چچا پر رو رہی ہیں تو آپ نے ان کو یہ دعا دی۔ "رضی الله عنکن و عن اولادکن و اولادکن و اولاد کن۔ (خدا تم سے اور تمہاری اولاد سے اور اولاد کی اولاد سے راضی وخوشنود ہے) (مدارج نبوۃ جلد صفحہ ۶۰۸)

مولانا قاسمی حضرت جعفر طیار کی شہادت (غزوہ موتہ) کا ذکر کرتے ہوئے حضور کے بارے میں لکھتے ہیں۔

”آپ خود وہاں موجود نہیں تھے۔ مگر اللہ کے نبی کا دل وہیں پڑا ہوا تھا۔ اس

لیے واقعہ کی ایک ایک بات سے حضور اکرم ﷺ کو آگاہ کیا جارہا تھا۔ جب آپ نے صحابہ کرام کے سامنے حضرت جعفر طیارؓ کی شہادت کا حال بیان کیا تو آپ کے چہرے پر انتہائی رنج وملال کے آثار طاری تھے۔ اور آنکھیں بے اختیار آنسو بہا رہی تھیں۔“

آگے لکھتے ہیں کہ

”جب گھر کی عورتوں کو خبر ہوئی تو وہ رونے لگیں۔ حضرت فاطمہ کو اطلاع ہوئی تو وہ بھی روتی ہوئی آئیں۔ حضور ﷺ نے تسلی دے کر واپس کیا اور فرمایا۔“ بے شک جعفر پر رونے والیوں کو رونا چاہئے۔“

(شہدائے اسلام صفحہ ۵۰۔ ۴۹)

اسی طرح غزوہ موتہ میں شہادت حضرت عبداللہ ابن مروہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ”حضور اکرم ﷺ نے جب ان کی شہادت کی خبر سنی تو آپ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔“ (سرفراز محرم نمبر ۱۳۵۶ھ صفحہ ۵۶۔ ۵۱) اور غزوۂ خندق میں سعد ابن معاذ کی شہادت کے موقع پر تحریر فرماتے ہیں ”جب دفن کر کے واپس آئے تو محبوب خدا ﷺ نے سعد کی جگہ کو خالی پایا۔ داڑھی آپ کے ہاتھ میں تھی۔ اور اس پر مسلسل آنسو گر رہے تھے۔“

(سرفراز محرم نمبر ۱۳۵۶ھ صفحہ ۵۶۔ ۵۱)

خود آپ کے وصال کے موقع پر آپ کے اہل بیت وارواح میں گریہ برپا ہوا جب سرور کائنات ﷺ کے پردہ فرمانے کا وقت قریب آیا تو حضرت مولیٰ علی علیہ السلام نے عرض کیا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ ڈھال میری ٹوٹ گئی۔ فرمایا ”تمہاری سپر میں تھا۔ اور اس کا ٹوٹنا میرا دار فانی سے جانا ہے“ حضرت امام حسنین علیہما السلام نے عرض کیا ”یا جدی ہم نے یہ خواب دیکھا ہے کہ ایک درخت بزرگ گر پڑا۔“ فرمایا ”اے فرزند! وہ میں ہوں کہ اس جہاں سے جاؤں گا۔“ بعد اس کے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے عرض کیا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ میرے گھر کا ستون گر گیا ہے۔ فرمایا۔ ”اے عائشہ! جو عورت یہ خواب دیکھے اس کا شوہر مر جاتا ہے۔ اس وقت تمام بی بیاں، سب یار اور اہل بیت سارے زار زار روتے بے قراری سے کپڑے پھاڑے اور

سر پر خاک اڑائی۔"

(قصص الانبیاء ترجمہ اردو خلاصۃ الانبیاء بحوالہ فضائل اہل بیت صفحہ ۲۸۔ از محمد عسکری)

حضور ﷺ کے بعد جب حضرت علیؑ کی شہادت ہوئی تو بھی گریہ وزاری کا یہ عمل جاری رہا۔ عقد الفرید جلد ۲ (۲ بحوالہ فضائل اہل بیت صفحہ۔ ۱۲۸ از محمد عسکری) میں "زید بن حسینؓ سے مروی ہے کہ جب شہادت کی خبر حضرت اُمّ کلثوم بنت عمرؓ کے ذریعہ مدینہ شریف پہنچی۔ تمام شہر میں کہرام مچ گیا۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو روتی نہ ہو۔ بالکل وہی منظر پیش تھا۔ جو رسول اللہ ﷺ کے پردہ فرمانے کے دن دیکھا گیا تھا۔ جب ذرا سکون ہوا تو صحابہ نے کہا "چلو امّ المومنین عائشہ کو دیکھیں کہ رسول اللہ ﷺ کے چچازاد بھائی کی موت کا سن کر ان کا کیا حال ہے؟" حضرت زید کہتے ہیں۔ "سب لوگ ہجوم کر کے امّ المومنین کے گھر گئے۔ اور اجازت چاہی انہوں نے دیکھا کہ شہادت کی خبر یہاں پہلے سے پہنچ چکی ہے اور ام المومنین غم سے نڈھال آنسوؤں سے تر بتر بیٹھی ہیں۔ لوگوں نے یہ حالت دیکھی تو خاموشی سے لوٹ آئے۔

حضرت زید فرماتے ہیں کہ دوسرے دن مشہور ہوا کہ امّ المومنینؓ رسول اللہ ﷺ کی آرام گاہ پر تشریف لے جا رہی ہیں۔ مسجد میں جتنے انصار اور مہاجرین تھے۔ استقبال کو اٹھ کھڑے ہوئے اور سلام کرنے لگے مگر ام المومنین نہ کسی کا جواب دیتی تھیں اور نہ بولتی تھیں شدت گریہ سے زبان بند تھی۔ دل تنگ تھا۔ چادر تک نہ سنبھلتی تھی۔ بار بار پیروں میں الجھتی اور آپ لڑکھڑا کر رہ جاتیں۔ بدقت تمام پہنچیں لوگ پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ حجرۂ مبارک میں داخل ہوئیں تو دروازہ پکڑ کر کھڑی ہو گئیں۔ اور ٹوٹی ہوئی آواز میں فرمایا۔ "اے نبی ہدایت! تجھ پر سلام۔ میں آپ کے محبوب ترین عزیز کی شہادت کی خبر سنانے آئی ہوں میں آپ کے عزیز ترین کی یاد تازہ کرنے آئی ہوں آپ کا چنا ہوا حبیب منتخب کیا ہوا عزیز قتل ہو گیا۔ واللہ وہ قتل ہو گیا جو ایمان لایا اور ایمان کے عہد میں پورا اترا۔ میں رونے والی غم زدہ ہوں۔ میں اس پر آنسو بہانے اور دل جلانے آئی ہوں اگر تیری قبر کھل جاتی تو تیری زبان بھی یہی کہتی کہ تیرا عزیز ترین اور افضل ترین وجود قتل ہو گیا۔" (بحوالہ اسوۂ علیؑ از سید رئیس احمد جعفری صفحہ ۲۷۔ ۱۷ آفتاب اکیڈمی کراچی طبع اوّل)

حضرت امام حسینؑ کے لیے تو وقتِ ولادت ہی رسول نے گریہ فرمایا۔ حدیث ہے کہ

جب حضرت امام حسینؑ پیدا ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ہوئی۔ آپ خاتون جنت کے مکان پر تشریف لے گئے۔ مولود کو گود میں لیا اور فرمانے لگے کہ افسوس اس صاحبزادے کو باغی لوگ شہید کریں گے۔ پھر مولا علیؑ و فاطمہ زہرا نے فرمایا کہ یا رسول اللہ ﷺ اس موقعہ پر آپ اور ہم ہونگے۔ آپ نے فرمایا کوئی نہ ہوگا۔ پھر فرمایا یا رسول اللہ ﷺ ہمارے بچوں پر ماتم کون کرے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جبرئیل نے مجھ کو خبر دی ہے کہ تمہارے امتی ماتم کریں گے۔ اس پر مولا علیؑ شیر خدا و فاطمہ زہرا رو پڑے۔

(سرفراز محرم نمبر ۱۳۶۱ھ ذکر شہادت فرزند رسول داروغہ بندہ علی خاں سنی حنفی)

(تمہید ابو شکور سلمٰی۔۔۔ مشکوٰۃ شریف مطبوعہ لاہور جلد ۸ صفحہ ۳۶ صواعق محرقہ صفحہ ۱۳ مصر۔ رسالہ البلاء المبین صفحہ ۵)

ان تمام حوالہ جات کا مقصد محض اس بات کی وضاحت کرنا ہے کہ اگر فی نفسہ رونا برا ہوتا تو انبیاء علیہم السلام کا شعار نہ قرار دیا جاتا۔ اور نہ صحابہ کبار کا معمول ہوتا۔ نہ رسول ﷺ خود گریہ فرماتے نہ حضرت عائشہ آنسو بہاتیں۔ اسی لیے مولانا روم فرماتے ہیں

ہر کجا آب رواں سبزہ بود

ہر کجا اشک رواں رحمت شود

چنانچہ نہ صرف رسول اکرم ﷺ بلکہ ساری کائنات نے امام حسینؑ کا ماتم کیا۔ جناب سلمان فارسی سے روایت ہے کہ کوئی ملک آسمان پر ایسا نہ تھا جس نے رسول ﷺ کی خدمت میں آ کے حسینؑ کے غم کی تعزیت نہ ادا کی ہو۔ غرضیکہ امام مظلوم کی شہادت پر زمین آسمان انبیائے عظام سبھی نے گریہ فرمایا۔ اور سارے عالم نے عزاداری کی۔ (صواعق محرقہ صفحہ ۱۹ تاریخ الخلفاء صفحہ ۱۴۱ مجتبائی) میں رقم ہے۔

ترجمہ: "قتل امام کی وجہ سے آسمان سرخ ہو گیا۔ آفتاب کو گہن لگ گیا کہ دن دہاڑے تارے نکل آئے۔ اور لوگوں کو خیال ہوا کہ قیامت آ گئی۔ ابن جوزی نے ابن سیرین سے نقل کیا ہے کہ تین روز تک تمام دنیا تیرہ و تاریک ہو گئی۔ اس کے بعد آسمان پر سرخی ظاہر ہوئی۔ جب امام حسینؑ شہید ہوئے تو تمام دنیا میں انقلاب پیدا ہو گیا۔ سات دن تک دنیا کی یہ حالت رہی۔ اس غم سے

آفتاب کا رنگ ایسا ہوگیا کہ دیواروں کی دھوپ زعفرانی چادریں معلوم ہوتی تھیں۔ ستارے آپس میں ٹکراتے تھے۔ آپ کی شہادت روزِ عاشورہ ہوئی۔ اور اسی روز آفتاب کو گہن لگا۔ آسمان کے کنارے چھ مہینے سرخ رہے اور پھر ہمیشہ کے لیے وہ سرخی باقی رہی جو قبلِ شہادت کبھی نہیں دیکھی تھی۔ بیت المقدس کا جو پتھر اٹھایا جاتا تھا۔ اس کے نیچے سے خون تازہ نکلتا تھا۔ فوج و لشکر میں جس قدر گھاس تھی وہ راکھ ہوگئی۔ اشقیاء ایک ناقہ نحر کیا تو علقم (اندرائن) کی طرح کڑوا نیم نکلا۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اپنی کتاب ''سر الشہادتین'' میں تحریر فرماتے ہیں

ترجمہ: ''چونکہ شہادت دو قسم کی تھی۔ ایک شہادت خفی، دوسری جلی، پس یہ دونوں قسمیں ان دونوں صاحبزادوں (حسنینؑ) پر یوں تقسیم کی گئیں کہ قسم اول کے ساتھ بڑے صاحبزادے کو اور قسم دوم کے ساتھ چھوٹے نواسے کو مخصوص کر دیا گیا۔ اور چونکہ یہ بات شہرت اور اعلان پر موقوف تھی۔ سب سے پہلے وحی کے ذریعہ سے حضرت جبرئیل و دیگر ملائکہ کے توسط سے اس کی اطلاع ہوئی۔ پھر تخصیص مکان، اسم مکان، اور تخصیص وقت کے ساتھ اطلاع دی گئی کہ وہ ۶۱ھ کا شروع ہوگا۔ پھر یہ بات مشہور ہوگئی اور اس کا ذکر زبان امیر المومنینؑ پر جاری ہوا جبکہ وہ سفر صفین میں تھے پھر جب یہ واقعہ ہائلہ ہوا تو اس کی شہرت اس طور پر ہوئی کہ مٹی خون ہوگئی۔ آسمان سے خون تازہ برسا۔ ہاتف غیبی کے مرثیے سنے گئے۔ جنوں نے گریہ وزاری کے ساتھ نوحے پڑھے۔ جسدِ اطہر کی پاسبانی کے لیے درندے دورہ کرتے ہوئے پائے گئے اور اس برگزیدہ باری کے قاتلوں کی ناک میں سانپ داخل ہو گئے اور اس کے علاوہ بہت سی باتیں باعث شہرت تھیں کہ حاضر و غائب اس واقعہ سے مطلع ہو جائیں بلکہ بکاء و حزن دائمی باقی رہے اور یہ واقعہ ہائلہ امت رسولﷺ میں روز قیامت تک بپا کیا جائے۔ پس اس کی شہرت ملاء اعلیٰ سے لے کر اسفل تک غائب و حاضر، جن و انس اور ناطق وضاحت ہوئی۔''

عزاداری کے تاریخی پس منظر پر اگر غور کیا جائے تو ایک عجیب و غریب بات سامنے آتی ہے۔ وہی قاتلانِ حسینؑ جو چند روز پیشتر اسیرانِ اہل بیت اور سرہائے شہدائے کربلا کی تشہیر کو ہر بڑے شہر، بازار اور کوچے میں اپنے رعب و داب، فتح و نصرت اور استحکام سلطنت کے لیے ضروری خیال کرتے تھے۔ وہی حق کی تشہیر و تبلیغ کا سبب بن گئے۔ وہ اس طرح کہ جب انہوں نے یہ دیکھا

کہ اس اقدام سے ان کی فتح و نصرت کے ڈنکے بجنے کے بجائے حسینی مظلومیت، آلِ محمدﷺ کی صداقت، اہل بیت رسول کی حقانیت کی تشہیر ہوتی جارہی ہے۔ اور اموی ظلم و استبداد سے عوام میں نفرت و حقارت کے جذبات پرورش پا رہے ہیں۔ تو انہوں نے اس واقعہ ہائلہ کے متعلق اخفاء کی پالیسی وضع کرلی۔ رونا حرام قرار دیا۔ واقعات کربلا کا بیان جرم سمجھا جانے لگا۔ نام حسینؑ لینا بغاوت کے مترادف ہوگیا۔ قبر حسینؑ کو مٹانا اور زیارت قبور پر پابندی لازمی اور ضروری محسوس ہوئی۔ تاکہ اس واقعہ کا ذکر اور نام و نشان باقی نہ رہے۔ لیکن اس کا اثر ان کے حق میں اور ضرر رساں ثابت ہوا۔ یعنی عزاداری ایک مستقل، مضبوط اور منظم تحریک کے طور پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قائم ہوگئی۔ اور شیعوں نے اس کے استحکام و انعقاد میں زبردست رول ادا کیا۔ عزاداری شیعوں کی زندگی کا ایک اہم جز و اور قومی علامت بن گئی۔ اور ساری دنیا اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہوگئی کہ عزاداری حسینؑ کے بغیر قوم شیعہ کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ مشہور جرمن مورخ موسو ماربین (M.M.Marbun) اپنی کتاب (السیاستہ الاسلامیہ) میں لکھتا ہے۔

ترجمہ:۔ ''حسینؑ کا واقعہ عالمانہ، حکیمانہ، اور سیاسی حیثیت کا تھا۔ جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس انقلاب کا پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست روحانی جو عوالم سیاست میں بڑی مہتم بالشان چیز ہے۔ از سرنو بنی ہاشم میں اور مخصوص اعقاب حسینی میں مسلم ہوگئی۔ خاندان معاویہ سے سلطنت نکل گئی۔ اور اب ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں جب کبھی ان کا ذکر آجاتا ہے تو مسلمان ایک کلمۂ شماتت اس کے ساتھ منطبق کر دیتے ہیں۔ بنی عباس کے زمانے میں اس انقلابی حالت کا اثر کم ہونے لگا۔ اس لیے اب اس کی صورت اس طرح بدل دی گئی کہ ایک جگہ جمع ہو کر حسینؑ کے مصائب کا ذکر شروع کر دیا۔ اور اس میں برابر ترقی ہوتی رہی۔ اور عزاداری کی بناء قائم ہوئی۔ جس کو بعض مورخین نے بوجہ ناواقفیت مجنونانہ رسم و رواج لکھا ہے وہ بالکل نہیں سمجھے کہ احساس مذہبی کی حرکت اور تعزیہ داری سے جو ملکی بیداری اس قوم میں پیدا ہوگئی ہے کسی قوم میں نظر نہیں آتی۔ اس کی بدولت ہندوستان میں جو قوم انگلیوں پر شمار ہوتی تھی۔ آج ہندوستان میں بہ حیثیت اعداد تیسری قوم قرار پاگئی۔ (فی الحال مسلمان ہندوستان کی دوسری بڑی اکثریت ہیں ر۔ش۔ع)

اسی طرح سیاست اور انقلاب کا احساس جس سے مراد ظلم و ستم کی اطاعت نہ کرنا ہے جو

حکمائے سیاست کے نزدیک نہایت عمدہ طریقہ اور نہایت مبارک سعادت ہے۔ اس قوم میں حسینؓ کی عزاداری کی بدولت پیدا ہو گیا ہے۔ اور جب تک وہ اس عمل کو اپنا شعار بنائے رہیں گے۔ عزت کی موت کو ذلت کی زندگی پر ترجیح دیں گے۔ ساری قوم حقیقی سرفروشی' قومی عزت اور نوعی افتخار کی مالک ہو جائے گی۔ روحانی رواسم جو آج مسلمانوں میں مروج ہیں۔ ان میں حسینؓ کی تعزیہ داری کے سوا کوئی چیز بھی مسلمانوں میں پولیٹکل احساس پیدا نہیں کر سکتی۔ اگر دو قرن تک مسلمانوں میں اسی طرح تعزیہ داری کو فروغ رہے اور تمام مقامات میں قومیت حاصل ہو تو مسلمانوں میں تازہ طور پر پولیٹکل زندگی پیدا ہو جائے گی۔''

اسی طرح فرانسیسی مورخ ڈاکٹر جوزف اپنی کتاب ''اسلام واسلامیان'' میں لکھتا ہے۔

''جب بادشاہ شام پیروانِ داماد محمد ﷺ (یعنی شیعیان علیؓ) کے قتل و غارت کی بنیاد ڈال کر اس داماد (حضرت علیؓ) کا نام فحش و دشنام سے لینے لگا تو اس معاملے میں بات بڑھ گئی۔ اور شیعہ و سنی میں عداوت پیدا ہو گئی۔ یہاں تک کہ فرقہ شیعہ نے بھی ان کے بزرگوں سے نفرت کرنے کا عمل نیک سمجھا۔ مگر چونکہ شیعوں کو قوت واقتدار میسر نہیں تھا۔ ان کی قوت و طاقت زیادہ نہ تھی۔ ٹڈیوں کی طرح منتشر تھے۔ اور جان کے خوف سے اپنے تئیں علانیہ ظاہر نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ محمد ﷺ کے نواسے حسینؓ کو یزید نے قتل کیا۔ اس سانحہ نے بڑی شورش پیدا کی۔ اور شیعیان علیؓ کو برانگیختہ کر دیا۔ اور قوی و آمادۂ جنگ بنا دیا۔ انہوں نے بہت کچھ غم کیا۔ اور حسینؓ کی عزاداری کو جزو ایمان و مذہب ٹھہرا لیا۔ ان کے اماموں نے بھی ان لوگوں کو امام حسینؓ کی عزاداری کی تاکید کی۔''

رفتہ رفتہ یہ عزاداری مذہب شیعہ کا ایک رکن بلکہ رکن اعظم قرار پا گئی۔ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں یہ فرقہ اتنا ظاہر نہ تھا۔ تقیہ نے اس فرقہ کو قوی بنا دیا۔ چونکہ ظاہر نہ تھے۔ ان کے زبردست مخالف ان کے قتل و غارت کا موقع نہ پاتے تھے۔ اور یہ لوگ خفیہ مجلس' ماتم برپا کر کے مصائب امام حسینؓ پر روتے تھے۔ یہ اثر دلوں میں ایسا راسخ ہوا کہ کچھ عرصہ نہ گذرا کہ اس گروہ نے بلندی حاصل کر کے ترقی کی۔ اور کتنے ہی وزیر اور بہت سے بادشاہ و خلیفہ بعضے تقیہ میں بعضے علانیہ

اس مذہب کے معتقد ہو گئے۔

.........اس ترقی سے جو اس فرقہ نے بغیر کسی ظلم کے تھوڑے عرصہ میں کی ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ شیعہ ایک دو قرن میں مسلمانوں کے تمام فرقوں سے شمار میں بڑھ جائیں گے۔ اور اس کا سبب یہی تعزیہ داری ہے۔ جس نے اس فرقہ کے ہر فرد کو اپنے مذہب کا مشنری بنا رکھا ہے۔ آج روئے زمین پر کوئی مقام ایسا نہیں جہاں دو شیعہ ہوں۔ اور امام حسین کی عزاداری نہ کریں۔ اور اس کے لیے زر و مال خرچ نہ کریں۔ مورخ موصوف آگے رقم طراز ہے۔

''میں نے بندر مارسل میں ایک بحرینی عرب شیعہ کو دیکھا۔ کہ ہوٹل میں تن تنہا مجلس عزا قائم کی ہے۔ اور کتاب لیے کرسی پر بیٹھا ہوا کچھ پڑھ رہا ہے۔ اور رو رہا ہے۔ بعد ازاں جو شربت و طعام اس نے مجلس کے لیے تیار کیا تھا۔ فقراء کو تقسیم کیا۔ یہ لوگ اس راہ میں بے حساب مال و دولت خرچ کرتے ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کے تمام فرقے ملا کر بھی اس فرقے کے برابر اپنے مذہب کی راہ میں مال و دولت خرچ نہیں کرتے۔ اس فرقے میں سے ہر ایک اپنے مذہب کا مشنری ہے اور یہ نکتہ مسلمانوں پر پوشیدہ ہے۔ یہاں تک کہ شیعوں کو بھی اپنے اس عمل سے اس فائدے کا خیال نہیں ہے۔ ان کی نیت ثواب عاقبت ہے۔ لیکن چونکہ لابد ہے کہ ہر عمل اس عالم میں بالطبع' اپنا اثر بخشے۔ اس وجہ سے یہ فعل بھی شیعوں کو اپنا پھل دیتا ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ جس مذہب میں پچاس ساٹھ ملین (پانچ چھ کروڑ) مشنری ہوں لامحالہ جو ترقی ان کے لیے ہے وہ رفتہ رفتہ اس کو ضرور حاصل کریں گے۔ اس فرقے کے روسائے روحانی اور بادشاہ و وزیر تک بھی مشنری گری (دعوت مذہب) کی صفت سے خالی نہیں ہیں۔ اس فرقہ کے فقراء و مساکین چونکہ اس طریقہ سے پورا فائدہ اٹھا چکے ہیں۔ اور اٹھاتے ہیں۔ اس لیے وہ ماتم داری کے بجا لانے میں بزرگوں سے زیادہ کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ اس سے عقبےٰ میں اجر اور دنیا میں اجرت حاصل کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس فرقہ کے بہت سے عالم کاروبار دنیاوی چھوڑ کی اس عمل میں مشغول ہو گئے ہیں۔ اور اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے بزرگان دین کے فضائل اور ان مصائب کا ذکر جو اس خاندان پر گذر رہے ہیں۔ گویائی کی طاقت سے منبروں پر اور عام مجلسوں میں لوگوں کے سامنے بہ احسن وجوہ پڑھیں۔ ان مشقتوں کے سبب سے جو یہ لوگ اس فن میں اٹھاتے ہیں۔ ان لوگوں کے

واعظین بھی اسلام کے تمام فرقوں سے زیادہ ہیں۔اس کا نتیجہ یہاں تک پہنچا ہے کہ شیعوں کے ان پڑھ لوگ دوسرے اسلامی فرقوں کے پڑھے لکھے لوگوں سے اپنی مذہبی معلومات میں جوانہوں نے اپنے بکثرت علماء سے سنی ہیں زیادہ واقف ہوتے ہیں.......آج روئے زمین پر جس طرف نظر ڈالیے لیاقت ،معرفت' علم وعزت میں شائستہ سے شائستہ مسلمان فرقہ' شیعہ ہی میں نظر آئیں گے۔اس فرقے کی مشنری گری (دعوت مذہب) اپنے یا دیگر اسلامی فرقوں تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ جس قوم میں یہ لوگ قدم رکھتے ہیں اس پر بھی ایسا ہی اثر اور جذبہ ڈال دیتے ہیں۔کثیر تعداد شیعہ کو آج ہندوستان میں دیکھے جاسکتے ہیں سب عزاداری کی بدولت ہیں۔''

(اصلاح ۳ ماہ ربیع الاول ۱۳۵۷ھ جلد ۴۲ صفحہ ۴)

اس میں شک نہیں کہ عزاداری ہی وہ رسم ہے جس نے مذہب شیعہ کو تمام عالم میں تقویت وشہرت عطا کی ہے۔حالانکہ مسلمانوں کے دیگر فرقے بھی عزاداری کرتے ہیں۔مگر شیعوں کے زیر اثر۔شیعہ اور عزاداری لازم وملزوم بن کر رہ گئے ہیں۔

ذیل میں شیعوں کی عزاداری کے مختلف طریقوں اور رسومات کا ذکر کیا جارہا ہے جن میں مجالس عزا' تعزیہ داری' علم ومشک' ماتم داری' دُلدل یا ذوالجناح' تابوت شبیہ اور ضریح' مہندی' گہوارہ' طوق' سبیلیں' نذرونیاز وغیرہ خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

۱۔ ''مجلس عزا''

''مجلس'' عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں بیٹھنے کی جگہ۔ایک جگہ بیٹھے ہوئے آدمی محفل' مجمع' جلسہ۔لیکن شیعی اصطلاح میں عموماً اور لکھنؤ میں خصوصاً مجلس اجتماع غم حسینؑ کے معنوں میں مستعمل ہے۔بیٹھے ہوئے لوگوں کا وہ اجتماع جس میں مرثیہ خوانی' سوز خوانی یا ذاکری ہو اور مصائب بیان کیے جائیں۔اس کے مقابلے میں اجتماع مسرت کے لیے محفل کا لفظ مستعمل ہے۔نیز وہ تقریر جو فضائل ومصائب اہل بیت پر مشتمل ہو۔لیکن شرط یہ ہے کہ آخر میں گریہ وبکا ہو۔(سرفراز محرم نمبر ۱۳۸۴ھ صفحہ ۹۹ مجلس عزا التعارف تاریخ ارتقاء از مولانا سید مرتضی حسین)

ان مجالس کے انعقاد کا دستور عام طور پر یہ ہے کہ ایک شخص یا جماعت یا انجمن کی جانب

سے وقت معینہ اور مقام مقررہ کا اعلان کیا جاتا ہے۔جہاں لوگ جمع ہوکر ذکر حسینؑ وجمیع شہدائے کربلا کا بیان فرماتے ہیں۔اور سنتے ہیں۔ماتم ہوتا ہے اور اجتماعی طور پر غم منایا جاتا ہے۔ویسے تحقیق یہ بتاتی ہے کہ تیسری صدی ہجری کے آخر میں علماء کے درس کو مجلس کہا جاتا تھا۔چونکہ شیعہ علماء نے اس مجلس میں بیان قرآن وحدیث کے بعد ایام عزا کا تذکرہ بھی کرنا شروع کیا۔اس لیے اس مخصوص اجتماع کے لیے یہی اصطلاح سب نے اپنائی اس سلسلہ عزا کے قائم کرنے میں اوّلاً اور اصولاً دو امر مدنظر ہیں۔ایک یہ کہ رونے کے ذریعہ سے لوگ جمع ہوں۔آپس میں ملیں۔تبادلۂ خیالات ہوں۔امام یا عالم کی زبانی اپنے فرائض واحکام سن سکیں۔دوسرے یہ کہ حسینؑ مظلوم کے قصے کے ساتھ ساتھ سارے احکام وفرائض وعلوم بیان ہوں۔تاکہ دل خوب رقیق ہوکر ہر اچھے اثر اور نقش کو قبول کرنے کے قابل ہوجائے۔شکستہ اور رقیق دل پر ہدایت کا اثر جلد ہوتا ہے۔لہٰذا مجلس عزا عوام کو نیکی کی طرف راغب کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

تیسرا مقصد ان مجلس عزا کا یہ ہے کہ اس وسیلہ سے ہم دوسروں یعنی غیر مسلموں کو واقعہ کربلا کے ذریعہ حق وباطل کی تمیز اور اسلام کی حقیقت اور ایمان کی قوت سے آگاہ کراسکتے ہیں۔ تاکہ سننے والے امام حسینؑ اور ان کے اصحاب کے اسوۂ حسنہ کو اپنا سکیں۔اور حسینی اخلاق وآداب کا نمونہ بن سکیں۔

تفسیر درمنشور از علامہ جلال الدین سیوطی کی چند حدیثیں مجلسوں کی جلالت اور قدر ومنزلت اور عظمت کو ثابت کرتی ہیں آیت مبارکہ (فَاذْكُرُونِيْ اَذْكُرْكُم)یعنی تم لوگ میرا ذکر کیا کرو میں تم لوگوں کا ذکر کروں گا (پارہ سورہ بقرہ آیت ۵۲) کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

ترجمہ:۔''حضرت رسول خدا نے فرمایا کہ خدا قیامت میں فرمائے گا آج مجمع والے جان لیں گے کہ کون لوگ بزرگ ہیں عرض کیا گیا کہ یا حضرت ﷺ کون لوگ بزرگ ہیں۔فرمایا مجلسوں والے جن میں ذکر ہوتا ہے پھر فرمایا آنحضرت ﷺ نے کہ جو لوگ خوشنودئ خدا حاصل کرنے کے لیے اکٹھے ہوں۔اور ذکر خدا کریں ان کو آسمان سے ایک منادی ندا کرے گا۔کہ جب تم یہاں سے اٹھو گے تو تمہارے کل گناہ بخش دیے جائیں گے۔اور تمہاری کل برائیاں خوبیوں سے بدل دی جائیں گی۔ابن عمر نے آنحضرت سے پوچھا کہ جن مجلسوں میں ذکر ہوگا ان میں شرکت کا ثواب'

ہوگا؟ فرمایا "بہشت ہی مل جائے گی" پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ خدا قیامت میں ایسے لوگوں کو مبعوث کرے گا۔ جن کے چہروں میں نور ہوگا۔ وہ موتی کے منبروں پر ہونگے۔ جن کی شان دیکھ کر دوسرے لوگ رشک کریں گے۔ حالانکہ وہ نہ نبی ہونگے نہ ہی شہید۔" ایک اعرابی نے کہا" یا حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم سے ان کا حلیہ بیان فرمادیں۔ تاکہ ہم ان کو پہچان سکیں۔ فرمایا وہ لوگ ہیں جو خدا کے لیے ایک دوسرے سے دوستی رکھیں گے۔ مختلف خاندانوں اور مختلف شہروں کے ہونگے۔ خدا کا ذکر کرنے کے لیے (مجلسوں میں) جمع ہوا کریں گے۔ (بحوالہ اصلاح)

شیعہ ان حدیثوں کی روشنی میں مجلس عزائے حسینؑ ہی کو مجالس ذکر خدا سمجھتے ہیں کیونکہ عام طور پر مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں شیعوں کے علاوہ لفظ "مجلس" کا استعمال مشکل ہی سے کسی کے یہاں ہوتا ہے اہل حدیث "اجتماع" کے عادی ہیں۔ ان کے یہاں کوئی مجلس نہیں ہوتی حنفیوں کے یہاں مولود یا عرس ہوتا ہے۔ مولود میں ذکر خدا نہیں ہوتا بلکہ نعتیں یا سلام پڑھے جاتے ہیں۔ عرس میں ناچ گانا ہوتا ہے۔ البتہ صرف مجلس عزائے حسینؑ ہی میں ذاکر منبر پر جاتے ہیں۔ اعوذ باللہ من الشیطٰنِ الرجیم پڑھتا ہے۔ اور ذکر خدا کرتے ہوئے بسم اللہ الرحمن الرحیم کے ساتھ خطبہ پڑھتا ہے۔ جس میں حمد و ثنائے خدا و نعت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوتی ہے کہ یہ بھی ذکر خدا ہے۔ پھر کسی آیت کی تلاوت کرتا ہے یہ بھی ذکر خدا ہے پھر اس کی تفسیر بیان کرتا ہے یہ بھی ذکر خدا ہے پھر توحید و نبوت کے دلائل بیان کرتا ہے اسلام کے محاسن کا ذکر کرتا ہے۔ مخالفین اسلام کے جواب دیتا ہے اور احکام خدا اور رسول کی عقلی خوبیاں دکھاتا ہے۔ یہ سب ذکر خدا ہے۔ لہٰذا مجلس حسینؑ شروع سے آخر تک ذکر خدا ہی سے بھری رہتی ہے۔ اور وہی ان احادیث کی مصداق ہیں جن کا ذکر ابھی تھوڑی دیر پہلے کیا گیا۔

اس میں شک نہیں کہ ان مجالس میں اکثر فضائل حضرت علیؑ بیان کئے جاتے ہیں اور معترضین یہ کہہ سکتے ہیں کہ پھر ذکر خدا کیسے ہوگا۔ لیکن کنز العمال مطبوعہ مصر جلد ۵ صفحہ ۳۰ پر قول رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شیعوں کے اس نظریہ پر دال ہے عن عائشہ ذکر علیؑ عبادہ و علیؑ ابن سعود النظر الیٰ وجه علیؑ عبادہ (جناب عائشہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ علیؑ کا ذکر عبادت ہے تو اس میں ذکر خدا یقیناً موجود ہے۔)

مجلس عزائے حسینؑ کا ذکر خدا سے تعلق بتاتے ہوئے مولانا سید عمر فرماتے ہیں دنیا کی تمام کتابوں میں خواہ وہ آسمانی ہوں یا غیر آسمانی، صرف قرآن کا یہ اعجاز ہے کہ جس قدر اس کے پڑھنے کی تکرار ہوگی۔ اسی قدر ذوق طبیعت بڑھتا جائے گا جدّت پیدا ہوتی چلی جائے گی۔ اور لطف میں ترقی محسوس ہوگی۔ اسی طرح محض ذکر حسینؑ ہی کا یہ شرف ہے کہ ایک ہی واقعہ ایک ہی دن کا واقعہ مگر ناممکن ہے کہ اس کے بیان یا اس کی سماعت سے طبیعت بھر جائے۔ جتنا ذکر کیجئے لذت بڑھتی چلی جائے گی۔ (تلاوت قرآن و ذکر حسینؑ سرفراز محرم نمبر ۱۳۵۵ھ از مولانا سید محمد) پس اس سے ظاہر ہے کہ تلاوت قرآن کو ذکر خدا سے کم نہیں۔ اور مجلس عزا جہاں ذکر حسینؑ ہوتا ہے۔ دونوں کے اثرات ایک سے ہیں جس طرح قرآن عظمت خدا کی برہان ہے۔ اسی طرح عزائے حسینؑ بھی حقیقت اسلام کی روشن دلیل ہے۔ اسی لیے تو خواجہ معین الدین چشتیؒ نے کہا تھا۔

حقا کہ بنائے لا الہ است حسینؑ

مشہور شیعی عالم مولانا سید ابن حسن جارچوی جنہیں فخر المحققین کہا جاتا ہے فرماتے ہیں۔

"جو لوگ تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ مذہب امامیہ کی ترویج و ترقی زیادہ تر مجلس عزا کی رہین منت ہے ان مجلسوں کے ذریعہ سے ایک طرف تو ہم نے تبلیغ دین کی اور دوسری طرف تحفظ ملت کا اہم فرض انجام دیا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عظیم الشان کارناموں کا ذکر اگر ایک طرف سننے والوں کو ہمارے دین کی طرف مائل کرتا ہے تو دوسری طرف ہمارے اندر اخلاق حسنہ کی طرف رغبت کرنے کی تحریک پیدا کرتا ہے۔"

علامہ سید نجی نوری فرماتے ہیں۔

یہ مجلس عزا در حقیقت اسلامی یونیورسٹیاں اور دینی ادارے ہیں۔ جہاں ایمان ہدایت سے تمسک کی دعوت دی جاتی ہے۔ ثقلین کے اتباع، اجر رسالت کی ادائیگی اور احیاء امر اہل بیت کے اسباب فراہم کئے جاتے ہیں۔ ان مجالس میں علماء و خطباء ان منبروں سے خطاب کرتے ہیں۔ جنہیں ظلم سے جہاد، جرائم سے مقابلہ اور بداعمالیوں کے استیصال کے لیے وضع کیا گیا ہے۔

جن کی بناء اقت کے لیے مواعظ ونصائح، الٰہیات کے تذکرے، معارف اسلامیہ کی شرح اور احکام دینیہ کی تفصیل کے ساتھ اخلاقی اصول کی توضیح اور اجتماعی شیون کی تحقیق کے لیے ہوتی ہے۔ ان میں بہترین انداز اور اعلیٰ ترین اسلوب کے ساتھ دین الٰہی کی دعوت دی جاتی ہے۔ عواطف کی بیداری، غلطیوں پر تنبیہہ اور غفلت سے چونکانے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اعلان رسالت، آیات اسلام، رہنمایان دین کی سیرتوں کے گرد گفتگوں ہوتی ہے۔ سیرت اہل بیت کے ذیل میں ان کی قربانیوں اور راہ حق میں صبر وثبات کے ساتھ مصائب کا مقابلہ کر کے اعلیٰ کلمۃ الحق کے مجاہدات کا تذکرہ ہوتا ہے۔ ممدوح و مذموم اخلاقیات میں خط فاضل کھینچا جاتا ہے۔ اور لوگ ان مجالس یا مدارس سے عقیدہ وشریعت، فقہ، حدیث وتاریخ کے گوناگوں سبق کوائف برادران ملت تعاون و اشتراکِ عمل وتبادلۂ خیالات وافکار جیسے اجتماعی فوائد بھی فراموش کرنے کے قابل نہیں ہیں۔

(انقلاب حسینؑ از علامہ سید تکی نوری ترجمہ: السید ذیشان حیدر جوادی)

مجلس عزا کی تاریخ بہت پرانی ہے بعض روایات یہاں تک ظاہر کرتی ہیں کہ اس کا سلسلہ ابتدائے خلقت انسان تک پہنچتا ہے۔ یعنی حضرت آدمؑ کا بھی اس عالم گیر غم میں رونا بیان کیا جاتا ہے۔ اور ان کے بعد تمام انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے عہد میں اس آنے والے واقعے سے مطلع ہوکر نہایت متاثر وغمناک ہوئے۔ اور گریہ فرمایا

علمائے تحقیق نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ پہلی مجلس تخلیق آدمؑ سے قبل ہوئی جب خدا نے فرمایا۔ اِذْ قَالَ لِلْمَلٰئِكَةِ اِنّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِيْفَة۔ (اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے رب نے ملائکہ سے کہا کہ میں زمین پر اپنا خلیفہ قرار دینے والا ہوں) تو ملائکہ نے کہا۔ کیا تو زمین پر ایسے کو خلیفہ بنائے گا جو فساد اور خونریزی کرے"۔

بعض تفاسیر میں ہے کہ ملائکہ نے اس وقت واقعہ کربلا دیکھا تو غمگین ہوئے اور غم وحسرت کے عالم میں انہوں نے کہا۔ "کیا تو زمین پر ایسے کو خلیفہ بنائے گا جو فساد اور خوں ریزی کرے"۔ حداوند عالم نے جواب دیا۔ "اِنّی اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْن۔" جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔

تخلیق آدمؑ کے بعد جو مجلس ہوئی وہ مقام عرفات میں ہوئی۔ جب جناب آدمؑ نے

مساق عرش کی طرف نظر کی۔ اور اسماء خمسۂ نجباء کو دیکھا اور جناب جبرئیل نے تلقین کی کہ یوں کہو۔

یا حمید بحق محمدؐ یا علیؑ بحق علیؑ یا فاطمه بحق فاطمهؑ یا محسن بحق الحسنؑ و الحسینؑ و فلك الاحسان۔

جب امام حسینؑ کا ذکر کیا تو حضرت آدم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ اور دل پگھل گیا۔ جبرئیل سے کہا۔ "اے اخی جبرئیل! پانچویں نام کے ذکر میں میرا قلب مضطر ہوجاتا ہے اور آنسو جاری ہوجاتے ہیں۔ تب جناب جبرئیل نے امام حسینؑ کی شہادت کا سبب بیان کرنا شروع کیا۔ اور واقعہ شہادت سنایا۔ جناب آدمؑ نے اور ان ملائکہ نے جو وہاں پر تھے، سنا اور روئے۔

شریعت موسوی میں بھی محرم کے متعلق غم کے امکانات موجود ہیں۔ اور توریت کے مختلف حصوں میں مجلس عزا کا تذکرہ ہے (کتاب گنتی با۲۹ آیت ۷ مناقب الحسین عرفان المظلوم علامہ الشیخ جعفر شوستری ترجمہ خصائص الحسین ومزایا المظلوم از مولانا الشیخ عطا حسین النجفی صفحہ ۲۰۲)

"اے بنی اسرائیل! تم سب ساتویں مہینے کے عاشورہ کو ایک مقدس مجلس برپا کرو۔ اور اپنی روحوں کو غم زدہ بنادو۔"

کتاب احبار باب ۲۹ آیت ۲۹ جو روح اس دن غمزدہ نہ ہوگی۔ وہ اپنی جماعت سے کٹ جائے گی۔" آیت ۳۰" جو انسان سوائے غم کے اور کام کرے گا۔ اس کو قوم سے فنا کردوں گا۔

توریت کی مندرجہ بالا آیات کی یہ عبارت کہ ساتویں مہینے کے عاشورہ کو ایک مقدس مجلس کرو۔ ایسا سربستہ راز تھا۔ جس کا انکشاف محرم سنہ ۶۱ھ کی دسویں تاریخ کو ہوا۔ یہودیوں میں ساتویں مہینے کا نام تشرین ہے۔ جس کو انگریزی میں تھسری کہتے ہیں۔ جبکہ آفتاب برج میزان میں ہوتا ہے۔ جس طرح شمسی وقمری مہینوں کی تاریخیں مطابق ہوتی رہتی ہیں اسی طرح موسوی اور اسلامی تاریخیں بھی مطابق ہوجاتی ہیں۔ چنانچہ تاریخ طبری مطبوعہ مصر سے واضح ہے کہ یکم محرم الحرام سنہ ۶۱ھ مطابق یکم تشرین سنہ ۲۸۰ ہے جیسا کہ یعقوبی نے بھی اپنی تاریخ میں لکھا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ یکم محرم الحرام سنہ ۶۱ھ کو ماہ تشرین کی بھی پہلی تاریخ تھی۔ بعض عجمی شہروں میں اس

دن آفتاب برج میزان میں ساڑھے سترہ درجے پر اور چاند برج دلو کی بیسویں منزل پر تھا۔
غرضیکہ محرم ۶۱ھ سے ماہ تشرین کی تاریخیں توام ہوگئی تھیں۔ ہزاروں برس کا پردۂ راز اٹھ گیا
تھا۔ تاکہ اہل عالم بچشم ظاہر دیکھ کر سمجھ لیں کہ تشرین کا یوم غم اور عاشورہ محرم ایک ساتھ جمع ہو کر
اعلان کر رہا ہے کہ اس دن کی یادگار کو دو ہزار دو سو برس پہلے جناب موسیٰ قائم فرما گئے تھے۔"
(اصلاح جلد ۳۶ صفحہ ۳۵ ۱۳۵۱ھ از ابو الارشد رفیق احمد قادری حنفی)

یہ احکام غم جناب رسول خداؐ کی نبوت و رسالت کی صداقت پر زبردست اور معتبر
گواہ ہیں۔ کلیم اللہ کی آواز ہے کہ جو عاشورہ کو شریک غم نہیں وہ ہماری جماعت سے خارج ہے۔ اور
ادھر رسول رحمت اللعالمینؐ کا فرمان ہے کہ جس نے میرے اہل بیت کا حق محبت ادا نہیں کیا۔
میں اس کا رسول نہیں ہوں۔ قُلْ لَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی

اسی طرح تمام انبیاء علیہم السلام نے اپنی زندگی میں مجلس اعزا میں شرکت کی یہاں تک
کہ پیغمبر آخر نے بھی مجلس عزا میں حصہ لیا۔ یعنی جس تاریخ کو امام حسینؑ پیدا ہوئے اسی وقت سے
خدا نے ان کی عزاداری اور گریہ و بکا کی مجلس برپا کرنا شروع کر دی۔ جنانچہ مشکوۃ شریف مطبوعہ
لاہور جلد ۸ صفحہ ۳۹) میں ہے۔

ترجمہ:۔ جناب ام الفضل دختر حارث بیان کرتی ہیں کہ میں ایک دفعہ حضرت رسول
خداؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اور حضرت سے عرض کیا کہ اے رسول خداؐ میں نے
ایک وحشت ناک خواب دیکھا ہے حضرت نے فرمایا۔ (بتاؤ تو) وہ ہے کیا؟ ام الفضل نے کہا میں
نے دیکھا کہ گویا ایک ٹکڑا آپ کے بدن مبارک سے کاٹا گیا ہے۔ اور میری گود میں رکھ دیا گیا
ہے۔ حضرت رسول خداؐ نے فرمایا (اے ام الفضل گھبراؤ نہیں) تم نے اچھا خواب دیکھا ہے
اگر خدا نے چاہا تو میری بیٹی فاطمہ کے ایک لڑکا پیدا ہوگا۔ جو تمہاری گود میں ہوگا۔ ایسا ہی ہوا کہ
جناب سیدہؑ کے بطن مبارک سے امام حسینؑ پیدا ہوئے۔ اور میری گود میں آئے۔ جیسا کہ
آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا تھا۔ ایک روز میں اس صاحبزادے کو لے کر حضرت رسول
خداؐ کی خدمت میں آئی۔ اور انہیں حضرت کی گود میں رکھ دیا۔ پھر میں ادھر اُدھر دیکھنے
لگی۔ اب جو آنحضرتؐ کی طرف نظر کی تو دیکھا کہ آپ کی دونوں آنکھوں سے آنسوؤں کے

دریا جاری ہیں میں نے (گھبرا کر) عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ میرے ماں باپ آپ پر فدا
ہو جائیں۔ کیا ہوا کہ آپ رونے لگے۔ حضرت نے فرمایا کہ میرے پاس جبرئیل آئے اور مجھے خبر
دی کہ میری امت میرے اس فرزند کو قتل کرے گی۔ میں نے (تعجب سے) کہا۔ کیا اس بچہ کو؟
حضرت نے فرمایا ہاں۔ اور جبرئیل نے میرے پاس اس کی شہادت کی جگہ سے کچھ مٹی بھی لا کر دی
ہے جو سرخ ہے۔

پھر جب امام حسینؑ ایک سال کے ہوئے تو ملائکہ جناب پیغمبرؐ کے پاس حسینؑ کی
تعزیت کے لیے آنا شروع ہوئے۔ یہ امام کا مرثیہ پڑھتے تھے اور آنحضرتؐ کو تعزیت دیتے
تھے۔ اور آنحضرتؐ کے ہاں مجلس عزا برپا ہوئی۔ پھر رسول نے اس شہادت عظمیٰ کی خبر سیدۂ
عالم کو سنائی۔ خود بھی روئے اور جناب سیدہ کو بھی رلایا۔ تاریخ اسلام میں یہ پہلی مجلس عزا تھی جن
کے ذاکر خود آنحضرتؐ تھے سامعین میں جناب سیدہ حضرت علیؑ حسنین علیہم السلام اور چند
افراد اہل بیت تھے۔

روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے بعد آنحضرت کی زندگی میں اور واقعہ کربلا
شہادت امام حسینؑ سے قبل اس آنے والے حادثے کا تذکرہ کر کے خود اللہ کی جانب سے
مسلمانوں کو مجلس عزا منعقدہ کرنے کا اشارہ کیا گیا۔ لیکن اہم ترین مجالس وہ تھیں جو حضرت امام
حسینؑ کے عزم سفر سے اہل بیت کی واپسی مدینہ تک منعقد ہوئیں۔ روانگی کے وقت مدینہ والوں کا
گریہ و بکا کرنا خود اس کی طرف اشارہ کناں ہے۔

شہادت حسینؑ کے بعد پہلی مجلس مقتل سید الشہداء میں ہوئی۔ جب اشقیاء قافلہ اہل
بیت اطہار کو قید کر کے کوفے لے جا رہے تھے تو بجائے اس کے کہ سیدھے راستے سے لے
جائیں۔ دانستاً مقتل کی طرف سے لے گئے۔ جب جناب زینبؑ کی نظر بھائی کے جسم مبارک پر
پڑی تو نعش سے لپٹ گئیں۔ چیخیں مار مار کر رونے لگیں۔ اور مدینہ کی طرف منہ پھیر کر کہا۔

ترجمہ:۔ یا رسول اللہؐ! یہ آپ کے حسینؑ ہیں جن کو آپ چوما کرتے تھے اور اپنے
سینے سے لگایا کرتے تھے۔ اور جن کے گلوئے مبارک کے بوسے لیتے تھے۔ یہ صحرا میں گرا دئے
گئے۔ ان کے اعضاء مجروح ہوگئے۔ ان کا سر گردن سے علیحدہ کیا گیا اور نیزہ پر چڑھا دیا گیا۔ ان

کا سینہ چور چور ہے اور ان کا سینہ باغی اور آزاد کردہ لوگوں کی اولاد کے گھوڑوں کے سُموں سے پامال اور پاش پاش ہے۔ اے نانا! ہم آپ کے اہل بیت عالم مسافرت میں حقیر اور رسوا کیے گئے۔ اور کافروں اور فاجروں کے قیدی ہو گئے۔"

جناب زینب کی اس ذاکری پر تمام اہل بیت رونے لگے۔ اور گریہ وزاری کی صدائیں بلند ہو گئیں۔ اور اس مجلس عزا کا اثر یہ ہے کہ آج تک مزار حسینؑ پر مجالس عزا ہوتی ہیں۔

اس کے بعد وہ مجلس ہے جو مسجد اموی (شام میں) منعقد ہوئی۔ جس کے ذاکر امام زین العابدینؑ تھے۔ اور جگہ دربار یزید تھی۔ آپ یزید ملعون سے اجازت لے کر منبر پر تشریف لے گئے۔ اور مجلس شروع کی۔ اس وقت یزید کے دربار میں شام کے تمام روسا اور امراء موجود تھے۔ امام زین العابدینؑ نے منبر پر جا کر ایک خطبہ پڑھا۔ جس میں پہلے حمد الٰہی بجالائے۔ پھر نبی کا ذکر کیا۔ ان کی تعریف و توصیف کی۔ پھر اپنے جد بزرگوار امیر المومنین علیؑ کے فضائل بیان کیے۔ اور اس کے بعد اپنے والد مظلوم کا مرثیہ پڑھنا شروع کیا۔ اور تمام مصائب بیان کیے جنہیں سن کر تمام حاضرین چیخ مار کر رونے لگے۔ یزید نے سوچا کہ اب رنگ بدل نہ جائے۔ لہٰذا فوراً مؤذن کو اشارہ کیا مؤذن نے اللہ اکبر کہا۔ اس وقت رونے کی آواز بلند تھی۔ اور مؤذن ان کے گریہ کو اذان سے روک رہا تھا۔

ایک مجلس یزید کے حرم میں بھی برپا ہوئی۔ جب امام حسینؑ کے لٹے ہوئے قافلے کی عورتیں زنان خانے میں پہنچائی گئیں تو جناب زینب و ام کلثومؑ اور امام حسینؑ کی صاحبزادیوں نے ذکر مصائب شروع کیا اور یزید کے محل کی تمام عورتیں رونے پیٹنے لگیں۔ اور مجلس عزا برپا ہو گئی۔

خاندان رسالت کو تقریباً سال بھر قید رکھنے کے بعد یزید نے رہا کیا جناب زینبؑ سے کہا۔ اگر کوئی حاجت ہو تو فرمائیے۔ جناب زینبؑ نے ایک آہ سرد بھری اور فرمایا۔ "ہمارے سید و سردار امام حسینؑ شہید ہوئے۔ ہمیں ان پر نوحہ و بکا کرنے کا موقع نہ ملا۔ یہاں زنداں میں ان کی بیٹی سکینہ دار فانی کو سدھاریں۔ اس کے لیے بھی رونے کی اجازت نہیں ملی۔ میں چاہتی ہوں کہ ایک وسیع و کشادہ مکان ہمارے لیے خالی کرا دیا جائے۔ تا کہ ہم وہاں حسینؑ ابن علیؑ کا ماتم بپا کریں۔" پھر اس جگہ مجالس عزا برپا ہوئی۔

جب یہ قافلہ دمشق پہنچا تو وہاں کی عورتیں جناب زینبؑ کے غم میں شریک ہوئیں۔ جناب زینبؑ نے مجلس پڑھی۔ اور ان کا بیان سن کر چاروں طرف سے گریہ و بکا کی آوازیں بلند ہوئیں۔ یہ مجالس عزا دمشق میں سات روز تک رہیں۔

سنہ ۶۲ھ میں اہل حرم مدینہ پہنچ گئے۔ اور غالباً پہلی باقاعدہ مجلس اس وقت ہوئی جب امام زین العابدینؑ نے بشیر بن جذلم کو مدینہ سے اعلان کے لیے بھیجا اور خود بیرون شہر اترے۔ جب اہل شہر کو شہادت حسینؑ اور واقعات کربلا کی خبر ملی تو لوگ جوق در جوق امام زین العابدینؑ کے پاس پہنچے۔ نحیف و لاغر پردیسی بچھڑے عزیزوں کو دیکھ کر تڑپ گئے۔ اور گریہ و بکا کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر مجلس عزا برپا ہوئی۔

مندرجہ بالا تمام مجلسیں بالاہتمام نہیں ہوئی تھیں۔ بلکہ اتفاقاً برپا ہوئیں لیکن جو مجلس قصداً اور ذاکر سے ذکر کا وعدہ لے کر خواتین کو پس پردہ جگہ دے کر باقاعدہ اہتمام کے ساتھ منعقد ہوئی۔ اس کے بانی حضرت امام رضاؑ اور ذاکر دعبل خزاعی تھے جن کی وفات سنہ ۲۴۶ھ میں ہوئی۔

اس کے بعد مدینہ میں دو مجلسیں خصوصیت کے ساتھ ہوتی رہیں۔ ایک وہ مجلس تھی جو جناب ام البنین مادر جناب عباسؑ جنت البقیع کے عزا خانے میں برپا کرتی تھیں۔ چوتھی صدی ہجری کے مصنف ابوالفرج اصفہانی اموی نے مقاتل الطالبین میں لکھا ہے کہ ام البنین کو تعزیت دینے کے لیے لوگ بقیع آتے اور ان کے ساتھ روتے تھے۔

(سرفراز محرم نمبر ۱۳۸۴ھ صفحہ ۰۰ مجلس عزا۔ از مولوی سید تفضی حسین رضا کار لاہور اربعین نمبر صفحہ ۵۲)

اگر بنی امیہ و بنی عباس کی مخالفت کی وجہ سے آل احمدﷺ مدینہ سے دور نہ جاتے تو جنت البقیع عزا خانے مجلس کا عالمی مرکز بن جاتا۔ مختصر یہ کہ کربلا کے روح فرسا واقعہ کے بعد اس کی یاد تازہ کرنے کے لیے محبان آل رسولﷺ کسی مقام پر جمع ہو کر ان مصائب کا ذکر کیا کرتے تھے۔ جو بنی امیہ کے ہاتھوں اولاد رسولﷺ پر پڑے۔ چونکہ اس قسم کے مجمعے اور ذکر و افکار اس وقت کی حکومت کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا کرتے تھے۔ اس لیے حکومت نے ان پر بندش عائد کی۔ اور تندہی سے کوشش کی کہ مجالس عزائے حسینؑ برپا نہ ہوں مگر جس قدر ممانعت بڑھی۔ اسی قدر مجالس زیادہ ہوئیں۔ حکومت نے اپنے تمام ذرائع اس تحریک کو بند کرنے کے لیے صرف کیے۔ جا

بجا جاسوس مقرر تھے۔ جو طرفداران آل محمدؐ کا پتہ لگاتے تھے۔ اور آئے دن کوئی زنداں میں بند کر دیا جاتا تھا۔ اور کوئی دار پر چڑھایا جاتا تھا۔ اس طرح مجالس عزا نے شیعوں میں وحدت مقصد اور وحدت عمل پیدا کی۔ اور اس وحدت سے ایک ایسی جماعت عالم وجود میں آئی۔ جس نے آل محمدؐ کے کارنامے سن سن کر ظلم وستم سے نفرت اور عدل وانصاف سے محبت کرنے کا عزم صمیم کر لیا۔ (ایضاً فلسفۂ آل محمد صفحہ ۲۵ کا حاشیہ از مولوی ابن حسن جارچوی)

بنی عباس کے آخری دور اور امام حسن عسکریؑ کے بعد دیلم وعراق میں شیعوں کی آبادی نمایاں طور پر پھیل گئی۔ دیلمیوں کے اقتدار سے شیعوں کو یہ فائدہ ہوا کہ ان کے دبے ہوئے جذبات رُکے ہوئے منصوبے، منتشر اشخاص اور خاموش تعلیمات کا پرچار ہو گیا۔ انہوں نے اپنے دائرہ اقتدار میں علمائے شیعہ کی سرپرستی کی۔ ان کے مرکزوں کو آزاد کیا۔ ان کے مراسم کو پابندیوں سے چھڑایا۔ آئمہ کے روضوں کی تعمیر اور غم امامؑ کا اظہار عام کر دیا۔ تقریباً چار سو برس کی آوارہ وطنی کے بعد شیعوں کو سہارا ملا۔ تو سب سے پہلے مجالس عزا اور جلوس ہائے غم امام حسینؑ آزانہ منظر عام پر آئے۔ اور غالباً ۳۵۲ھ کا محرم پورے اہتمام اور انتہائی جوش وخروش کے ساتھ منایا گیا۔

غرضیکہ مختارؒ کی وفات کے بعد سے ایرانیوں کے عروج تک جو مجالس عزائے حسینؑ ہوتی رہیں۔ وہ اکثر وبیشتر صرف رونے ہی پر مشتمل ہوتی تھیں۔ حامیان اہل بیت کو دم لینے کا موقعہ حاصل کرتا تھا تا کہ عباسی مظالم کا منہ توڑ جواب دیا جائے اس دور میں رونے رلانے اور دل کی بھڑاس نکالنے اور جوش کے فرو کرنے پر بت زور دیا گیا۔ شیعہ رہنماؤں نے اس دور میں رونے پر انتہائی زور دے کر بہت بڑا سیاسی مقصد حاصل کر لیا۔ جوش میں بھرے ہوئے نوجوانوں کو روکنا اپنی سیاسی اور مذہبی کوششوں اور منصوبوں کی حفاظت کرنا اس دور میں شیعوں کی اہم ترین ضرورت تھی۔ اور وہ لوگ اس میں کامیاب ہوئے اور پورے طور پر کامیاب ہوئے۔

(سرفراز محرم نمبر ۱۳۵۵ھ مجالس عزا انجم الحسن زیدی)

عباسیوں کے آخری دور میں جب خلیفہ بغداد تقریباً معطل تھا۔ اور عنانِ اقتدار آل بویہ کے ہاتھ میں تھی۔ علانیہ عزاداری ہونے لگی تو مجالس کا معیار بھی بڑھا اور مصائب اور فضائل کے ساتھ ساتھ تبلیغی پہلو بھی اس میں داخل ہونے لگا۔ لیکن نہ

اس قدر کہ اصل غرض پر حاوی ہو جائے۔ اور نہ اس طرح کہ مختلف عقائد رکھنے والوں کو ناگوار ہو۔

آل بویہ کے بعد اگرچہ شیعہ انتقام کی زد میں آگئے۔ لیکن جو کچھ ہو چکا تھا۔ اس کا سلسلہ بہرحال قائم رہا۔ ابو جعفر طوسیؒ نے نجف کو اپنا مستقر اور علمی مرکز بنانے کے لیے کوشش کی۔ چنانچہ شیعوں کی ایک مرکزی جگہ بن گئی۔ عراق میں کربلا نجف، کاظمین اور ایران میں مشہد مقدس۔ ان مقامات پر شیعہ کسی قدر اور بڑی حد تک اپنی اکثریت کی وجہ سے آزاد تھے۔ اس لیے ان مقامات پر خوشی وغم کے مظاہرے ہوتے تھے۔ مجلس عزا اور حلقۂ درس قائم تھے۔

جب ایران میں تیموری عروج ہوا تو عام خیال کے مطابق عزاداری نے اس عہد میں فروغ پایا۔ کیونکہ تیمور خود شیعہ تھا۔ ہو سکتا ہے اسی زمانہ میں نجف کربلا اور ایران وروم میں مجلس ہوتی ہو۔ کیونکہ تیموری بادشاہ سلطان حسین مرزا کہ عہد میں ملا حسین واعظ کاشفی نے روضۃ الشہداء (۹۰۸ھ) تالیف کی۔

جب آہستہ آہستہ ایران شیعت کا مرکز بنا اور صفویوں نے عروج پایا تو انہوں نے تنظیمی اور تبلیغی دونوں قسم کے فوائد اس سے حاصل کئے۔ بادشاہ سے لے کر فقیر تک سب شیعہ تھے۔ اور دل کھول کر عزائے حسینؑ میں حصہ لیتے تھے۔ کثرت سے مجلسیں ہوتی تھیں۔ اور ان ہی کا یہ اثر تھا کہ ایران اور اس کے آس پاس کے ممالک میں شیعوں کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی۔

(فلسفۂ آل محمد صفحہ ۱۲۵ کا حاشیہ)

جب تیمور کی اولاد ہندوستان آئی اور محبتِ اہل بیت کے علانیہ اظہار پر کوئی قدغن نہ رہا تو ہندوستان میں بھی مجلسیں شروع ہوئیں اور ''روضہ خوانی'' کے طریقے پر ذکر حسینؑ ہوتا رہا۔ ملا حسین واعظ کاشفی کی مرتب کردہ ''روضۃ الشہدا'' کا ترجمہ ہر مجلس میں پڑھا جاتا تھا۔

ویسے ہندوستان میں شیعہ تاریخ کا پہلا باب دکن سے شروع ہوتا ہے۔ دکنی سلاطین صفوی بادشاہوں کی طرح مداح اہل بیتؑ تھے۔ اس لیے ذکر محمدؐ وآل محمدؐ عام ہو گیا۔ بقول نصیر الدین ہاشمی مجالس میلاد اور مجالس عزا کا بھی خاص دستور پڑ گیا تھا۔ اس قسم کی مجالس کا آغاز بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت میں ہوا۔ مگر قطب بادشاہوں اور نظام شاہوں نے بھی اس کو رواج دیا۔ (دکن میں اردو نصیر الدین ہاشمی صفحہ ۱۸۰ طبع سوم) نثر میں مجلس خوانی کا آغاز ''روضۃ

الشہداء" اور اسی قسم کی دوسری فارسی کتابوں سے ہوا۔ پھر اس کے اردو اور دکنی ترجمے پڑھے گئے۔ اس کے بعد وہ مجلس نامی کتابیں لکھی اور پڑھی جانے لگیں۔

اودھ میں جب شیعہ حکومت قائم ہوئی تو شیعیت کے ساتھ ساتھ یہاں بھی مجالس عزا کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور نثر و نظم کے ذریعہ سے مصائب اہل بیتؑ بیان ہونے لگے۔ آہستہ آہستہ مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کا دور شروع ہوا۔ اور حق یہ ہے کہ اس کی وجہ سے مجالس مقبول عام ہوگئیں۔ ہندوستان سب ان مجالس میں شریک ہوتے تھے۔ اور شعراء کے کلام سے مستفید ہونے کے ساتھ ساتھ اہل بیتؑ کی عظمتوں اور کارناموں سے بھی واقفیت حاصل کرتے تھے۔ سلاطین اودھ کے یہاں مجلسیں پڑھنے والے عموماً ایرانی تھے۔ جن میں سے ملا خطا شوستری کی مجلس "واقعات ملاحظہ" کے نام سے شائع ہوئی ہیں۔ امام باڑہ حسین آباد شاہ نجف و آصف الدولہ میں جو مجلسیں عہد شاہی سے ہوتی رہیں ان میں چار چار پانچ پانچ ذاکر عام طور پر زینت منبر ہوتے تھے جن میں واقعہ خواں، سوز خواں، مرثیہ خواں، ذاکر اور واعظ ہوا کرتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس عہد میں مجلس کی یہی شکلیں تھیں۔ (سرفراز محرم نمبر ۱۳۸۴ھ صفحہ ۱۰۷)

علمائے اکابر جیسے ملا محمد تقی برغانی وغیرہ نے روایات و احادیث کو بیان کرنے اور مسائل کلام اور فقہ و اخلاق کو عنوان قرار دینے کا طریقہ پھر سے رائج کیا۔ اور خلاصۃ المصائب، مجالس علویہ، نزہۃ المجالس، اخبار ماتم، دفتر ماتم جیسے مسودے سامنے آئے۔ اور اس کے علاوہ نئے علوم، نئے مسائل اور موضوعات پر بحث بھی اس میں شامل ہوگئی۔

صرف اودھ ہی پر منحصر نہیں۔ بلکہ ایرانی لوگ جہاں جہاں گئے۔ وہاں مجالس کو مقبول عام بنانے کی کوشش کی۔ دکن، سندھ، ملتان اور پنجاب کے علاقوں میں یہ سلسلہ عرصہ دراز سے جاری ہے۔ ہندوستان میں مجالس عزا کا خاص نتیجہ یہ ہوا کہ یہ صرف شیعوں تک محدود نہیں رہیں۔ بلکہ سنیوں نے بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور یہ اجتماعات دو اسلامی فرقوں کے اتحاد و اتفاق کا ذریعہ بن گئے۔

انگریزوں کی شاطرانہ حکمت کی وجہ سے شیعوں اور سنیوں کے باہمی جنگ عقائد اور مناظرہ بازی نے آہستہ آہستہ اس اتحاد کو پاش پاش کر دیا۔ اور ابھی تک صحیح معنوں میں شیشۂ دل پر

آیا ہوا یہ بال مٹا نہیں ہے کیونکہ اس کی ایک اور وجہ وہ نام نہاد نا اہل اور نا قابل ملا ہیں جن کی دال روٹی اس نفاق پروری کے سہارے چلتی ہے۔ حالانکہ مسلمانوں کو ملانے کے لیے مجالس عزا بہترین ذریعہ ہیں۔ اگر واعظین و ذاکرین اختلافی مسائل کو ذرا احتیاط سے بیان کریں تو ہر اسلامی فرقہ ان میں شریک ہو کر فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اور یہ مجالس عزا جو ایک زبردست انسٹی ٹیوشن سے کم نہیں نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو اور دیگر غیر مسلم اقوام کے اتحاد کا سبب بن سکتی ہیں دنیا کی ہر قوم امام حسینؑ کی حمایت، انسانیت و حق پسندی اور ان کے بلند اغراض و مقاصد سے ہمدردی رکھتی ہے اس لیے صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ اس دور مادہ پرستی میں حسینؑ کی سیرت تمام دنیا کے سامنے پیش کی جائے۔ اور ان کا پیغام امن، اقوام عالم کو سنایا جائے۔ اور اس طرح مجالس عزا کو ایک بین الاقوامی انسٹی ٹیوشن بنا دیا جائے۔ (فلسفۂ آل محمد صفحہ ۱۲۶)

مختصر یہ کہ مجلس خالص مذہبی علامت اور یادگار سید الشہداء امام حسینؑ ہے۔ اس کا مقصد تعارف و تشہیر واقعہ کربلا ہے اور یہی تشہیر واقعہ کربلا شیعیت کی تبلیغ کا سبب بن گیا ہے۔ مجلس کا ایک خاص اسلوب و آہنگ ہوتا ہے جو مسلمانوں کے دیگر فرقوں کے مذہبی اجتماعات میں نہیں پایا جاتا۔ ابتداء قرآن کے کسی سورہ یا مخصوص آیت کی تشریح سے ہوتی ہے۔ پھر شرعی مسائل پر بحث یا فضائل اہل بیت ہوتے ہیں۔ تاریخ اسلام کا اعادہ بھی کیا جاتا ہے۔ اور مجلس کے آخری حصے میں کچھ دیر کے لیے مصائب اہل بیت اور شہادت امام حسینؑ یا کسی شہید کربلا کا بیان ہوتا ہے۔ ان مجالس کی خاص حدیں اور معین مقاصد ہیں۔ ان کا خاص رکھ رکھاؤ ہوتا ہے۔ اور مخصوص آداب و لحاظ۔ ذاکر کی تقریر کے اختتام پر ماتم اور سینہ زنی برپا ہوتی ہے۔ اور ابتداء میں مرثیہ خوانی اور سوز خوانی۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ مجلس عزا شیعہ قوم کے مذہبی و تمدنی رکھ رکھاؤ کی آئینہ دار ہیں۔ اور ان کے خیالات و نظریات اور عقائد کو سمجھنے میں بہت حد تک مدد دیتی ہیں۔ اردو شاعری میں ایسے مرثیے ملتے ہیں جو ایسی ہی مخصوص اور یادگار مجلسوں کی دین ہیں۔

۲۔ جلوس عزا

شیعوں کی عزاداری محض مجالس عزا ہی تک محدود نہیں بلکہ جلوس عزا بھی ان کی عزاداری

کا ایک خاص حصہ ہے اس کا سبب دراصل یہ ہے کہ جب تک بنو عباس اور بنو امیہ کی حکومتیں رہیں اور شیعوں پر مظالم جاری رہے۔ امتناع عزاداری کا قانون لاگو رہا۔ عزاداروں پر سختیاں کی جاتی رہیں۔ اس وقت تک ائمہ کرام کے حجرے اور اہل بیت کے خانہ ہائے مبارک ذکر حسینؑ کا مرکز بنے رہے اور گھروں ہی میں مجالس عزا منعقد ہوتی رہیں۔ امام حسینؑ کا غم کھل کر منایا نہ جا سکا۔ لیکن جب آل بویہ یا خاندان صفویہ کی حکومتوں میں انہیں مذہبی آزادی حاصل ہوئی تو غم حسینؑ بالا علان شاہراہوں، گلیوں اور کوچوں اور بازاروں میں منایا جانے لگا۔ تاکہ امام اعظم مظلوم پر زمین و آسمان اور ساری کائنات گریہ کناں ہو جائے۔ اور گریہ و بکا کی یہ صدائیں وہ طبقہ بھی سن سکے جو ان مجالس میں شریک نہیں ہوتا تھا۔ اور وہ لوگ بھی امام حسینؑ کی مظلومیت سے واقف ہو جائیں جنہیں تلوار کی نوک پر حقائق سے دور اندھیرے میں رکھا گیا تھا۔ اور جو نادانستگی میں ظالم کو مظلوم اور مظلوم کو ظالم سمجھ رہے تھے۔

مظلوم کی مظلومیت وحقانیت کے سرِ بازار اعلان کا یہ پہلا موقع نہ تھا۔ بلکہ قرآن نے اس قسم کے جلوس کی مثال پہلے ہی مسلمانوں کے سامنے رکھ دی تھی جب ایک عورت کی مادّی خواہشیں پوری نہ کرنے کے جرم میں حضرت یوسفؑ کو اسیر کر کے معصوم کو خطا کار ثابت کیا جا رہا تھا۔ اور زنجیر و سلاسل کی جھنکار میں قدم بڑھاتے ہوئے حضرت یوسفؑ مصر کے بازار میں تشریف لا رہے تھے۔ اور ظالم طبقہ کا ایک بدسرشت انسان پکار پکار کے کہہ رہا تھا۔

هذا عبدمن كنعان . العزيز عليه غضبان

(یہ کنعانی غلام ہے اور عزیز اس پر غضبناک ہے)

حضرت یوسف کا جواب تھا

هذا خير من سرابيل القطران

(یہ (دنیاوی قید) آتش جہنم کے شعلہ اور پیراہن سے بہتر ہے) تفسیر سورہ یوسفؑ

ایک جلوس وہ بھی تھا جب حضرت یوسفؑ قید سے رہا ہوئے تھے۔ اور بادشاہ نے عزت افزائی کے خیال سے اپنا طوق ان کی گردن میں پہنا کر اپنی سواری پر انہیں سوار کیا تھا۔ اور جب یہ جلوس شاہراہ سے گذر رہا تھا تو پھر نقیب کی آواز آئی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اب یہ (امیر) حاکم مصر ہے"۔ یعنی

حضرت یوسفؑ وہ مصیبت زدہ اسیر تھے جن کا انجام راحت و آرام کی منزل پر ختم ہوا۔ اور ان کا جلوس نکالا گیا۔ شیعوں نے بھی اسی طرح اسیران کربلا امام زین العابدین کا جلوس نکالنا شروع کیا۔ اس اسیر کا جلوس جس کا انجام مصیبت واذیت کی منزلوں پر ختم ہوا۔

تاریخ اسلام کا ہر مصنف اور ایماندار مورخ اور قاری جانتا ہے کہ کربلا سے کوفے تک امام حسینؑ کے لیے ہوئے قافلے کو کتنی اذیت ناک منزلوں سے گذرنا پڑا۔ حرم رسول کا یہ لٹا ہوا قافلہ بلاؤں پر بلائیں اور مصیبتوں جھیلتا ہوا کہاں کہاں سے گذرا کس کس مقام پر ٹھہرا۔ اور کربلا سے کوفے اور پھر کوفے سے دمشق تک کس تباہی و بربادی کے عالم میں پہنچا۔ بازاروں میں کیونکہ پھرایا گیا۔ درباروں میں کس عنوان سے لایا گیا۔ قید و بند کا زمانہ کب ختم ہوا۔ اور کب رہائی ملی کس طرح اور کتنے دنوں بعد یہ کارواں مدینہ پہنچا۔ یہ سب ایک طویل افسانہ اندوہ الم ہے۔ اور انہیں میں شہادت حسینؑ کی عظمت، اسلام کی حیات و بقا اور اہل بیت کی قربانی و ایثار کی کہانی چھپی ہوئی ہے نیز یزید کا ظالم دور حکومت، اشقیاء کی ایذا رسانی' حق و باطل کی کشمکش کا صحیح راز بھی اسی میں پوشیدہ ہے۔ اگر ان حقیقتوں پر پردہ ڈال دیا جاتا (جیسی کہ کوشش کی جاری تھی) تو یزیدی نظریات کو پنپنے کا آسان موقع مل جاتا۔ لیکن شیعوں نے جلوس عزا کی شکل میں واقعہ کربلا کے اس آخری دود ناک باب کا بھی اظہار کر دیا۔ اور حقیقت دنیا کے سامنے زندہ ہوگئی۔

ویسے جلوس کا رواج شیعوں کا قائم کردہ نہیں' قدیم زمانہ سے چلا آ رہا ہے اور ہر جگہ اور ہر زمانہ میں مختلف قسم کے جلوس نکلتے یا نکالے جاتے رہے ہیں۔ پہلے جب کوئی بادشاہ کسی سلطنت کو فتح کرتا تھا تو اپنا جلوس شان و شوکت کے ساتھ نکالتا تھا اور مفتوحین اور اسیران کو بھی اس جلوس کے ساتھ گھمایا پھرایا جاتا تھا ہندوستان میں اشومیدھ یگیہ نامی جلوس کا رواج عام تھا۔ اکثر کسی بادشاہ کی تخت نشینی کے موقع پر بھی جلوس نکالا جاتا تھا۔ حکومت برطانیہ میں جشن تاجپوشی کے موقعوں پر اکثر شاندار جلوس اور دربار ہوتے تھے چنانچہ آج بھی دربار دہلی کی یاد ہندوستانیوں کے دلوں میں تازہ ہے۔ یا ایسے موقع پر جب کسی بادشاہ کا انتقال ہو جاتا تھا۔ لوگ اس کا تعزیتی جلوس نکالتے تھے۔ سکندر اعظم کی موت پر جو جلوس نکلا تھا وہ تاریخ میں آج بھی محفوظ ہے۔ بادشاہ روم مصر بھی اس قسم کے جلوس نکالا کرتے تھے۔ فرانس اور ہندوستان میں بھی جلوس عام تھے۔ اہل عرب بھی

اس سے مستثنیٰ نہیں تھے عہد جاہلیت میں بدو قبیلے اکثر فرط مسرت میں جشن فتح منانے کے لیے جلوس نکالا کرتے تھے۔ حج کے بعد گیارہ ذی الحجہ کو حجاج بن یوسف کے عہد میں مکہ معظمہ میں محمل مصری کا ایک جلوس نکلتا تھا۔ (اور غالباً) اب بھی نکلتا ہے) جو ام المومنین حضرت عائشہ کی سواری کا منظر ثانوی ہے۔ اس کی خوبصورتی' سجاوٹ' آرائش دیکھنے کے قابل ہوتی ہے عربی باجوں اور موسیقی کے ترانوں کا اژدہام عظیم ہوتا ہے یہ محمل ہودبی شکل کی ایک تومند اونٹ پر آتی ہے ریشمی پردے۔ سچے موتیوں کی جھالر طلائی کام یاقوت اور دیگر جواہرات سے آراستہ کر کے دو لاکھ پچاس ہزار دینار کی لاگت سے تیار ہوتی ہے۔ ابراہیم رفعت پاشا ابن سویعنی بن عبدالحواد بن مصطفیٰ نے اپنی تاریخ ''مراۃ الحرمین'' عربی باتصویر چھاپ مصر ۱۳۴۴ھ جلد اول و دوم صفحہ ۸۳ اور صفحہ ۳۰۴ میں دو جگہ اس پر روشنی ڈالی ہے (حوالہ رضا کار لاہور اربعین نمبر صفحہ ۵۲) اس سے واضح ہوتا ہے کہ کسی برآوردہ مذہبی انسان کی سواری کا جلوس نکالنا مسلمانوں کا قدیم طریقہ ہے۔

جب آل محمد ﷺ کا لٹا ہوا قافلہ بازار کوفہ میں پہنچا تو بہت اژدہام تھا۔

سید سجاد نے بعد خطبہ لوگوں کو اس طرح مخاطب فرمایا۔

''جو شخص مجھے جانتا ہے اور جو نہیں جانتا وہ اب جان لے کہ میں علیؑ ابن الحسینؑ ابن علی ابی طالب ہوں'' میں اس شخص کا بیٹا ہوں جو فرات کے کنارے ذبح کر دیا گیا۔ میں اس شخص کا بیٹا ہوں جس کی ہتک حرمت کی گئی۔ اس کے خیمے کو لوٹ لیا گیا۔ اس کے مال کو غارت کیا گیا' اس کے خاندان کو قید کر دیا گیا۔

شیعہ اپنے چوتھے امام سید سجادؑ ہی کی تاسی میں جلوس عزا نکالتے ہیں۔ ان جلوس ہائے عزا کو زمانہ اور مقام کے لحاظ سے اختیار کیا جاتا ہے۔ تاکہ یادگار صحیح وقت پر منائی جاسکے۔ مثلاً عاشورہ محرم یا چہلم یا آٹھ ربیع الاول کے موقع پر۔ اس جلوس میں زنجیر کا ماتم بھی خاص طور پر امام زین العابدین کی یاد ہی میں کیا جاتا ہے۔

جب سرہائے شہدائے کربلا نیزوں کی نوکوں پر بلند بازار کوفہ میں داخل ہوئے تو امام حسنؑ کا سر اقدس سب سروں کے آگے تھا۔ ریش مقدس سے خون کا قطرہ بازار کوفہ کی زمین پر ٹپکا۔ حضرت زینبؑ کی نظر پڑی تو اپنا سر محمل کی لکڑی پر دے مارا۔ یہاں تک کہ خون کا پرنالہ بہہ نکلا

۔اور یہ اشعار پڑھے۔

ترجمہ:۔'' اے میرے پہلی رات کے چاند! تجھے مصائب نے گہنایا اور تو غروب ہوگیا۔ اے میرے بھائی! میرے اس بہنے والے خون کو قبول فرما۔ اور اسے تقرب کا موقع دے''
(مقاتل العوام)

شیعہ بازاروں کے جلوس ہائے عزا میں حضرت زینب کے اس عمل کی تاسی میں اپنا خون بہاتے ہیں۔ چونکہ یہ قافلہ ننگے سر اور ننگے پر ویران و پریشان تھا۔ لہذا شیعہ بھی جلوس عزا میں ننگے سر اور ننگے پیر سیہ لباس میں شرکت کرتے ہیں۔ چونکہ اس لٹے ہوئے قافلے میں آگے آگے سرہائے شہداء نیزوں پر بلند تھے۔ لہذا شیعہ علم اور پھریرے نکالتے ہیں اور پیاسوں کی یاد میں شربت یا پانی تقسیم کرتے ہوئے چلتے ہیں۔ اس کے علاوہ میدان کربلا میں شہید ہونے والے امام حسینؑ کے بہتر ساتھیوں کے لیے طبل جنگ کی آواز چونکہ آغاز حرب ہی نہیں۔ فرحت و نشاط کا پیغام لا رہی تھی۔ لہذا جلوس عزا میں ماتمی باجوں کی دھوم بھی عزاداران حسینؑ کے لیے جاں نثاری کا پیغام ہوتی ہے۔ جنگی باجوں کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا تھا کہ آن واحد میں پورے لشکر میں آغاز جنگ کی خبر پہنچ جائے۔ اسی طرح جلوس عزا میں بھی جنگی باجوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ طولانی جلوس میں دور دور تک شرکت کرنے والے جلوس نکلنے پر مطلع ہو جائیں۔ یا دور کے رہنے والے آواز سن کر جلوس میں شامل ہوں۔

اسیران حرم کا قافلہ بھوکا پیاسا کوفہ و شام کے بازاروں سے گزر رہا تھا لہذا جلوس عزا میں ان کی ارواح مقدسہ کے ثواب کی خاطر ایک شخص شرکائے جلوس اور غریب و فقیر طبقہ میں روٹی یا کچھ اور چیز بطور تبرک تقسیم کرتا ہے۔ اور لوگوں کو پانی یا شربت پلاتا ہے۔

جلوس کے نشان کے طور پر علم نکالے جاتے ہیں۔ یزیدیوں نے شہداء کے سرہائے مبارک کو نیزہ پر بلند کیا تھا۔ اس واقع کی یاد میں پنجے نکالے جاتے ہیں۔ غرضیکہ جلوس میں تابوت' علم' نشان' گہوارہ' ذُلدل' ضریح مبارک اور آخر میں عماریوں کجاوے سر برہنہ مجمع کے ساتھ ہوتے ہیں۔

یہ مجمع گریہ و ماتم کرتا ہوا کسی مخصوص مقام پر جا کر ختم ہو جاتا ہے وہاں ایک بار پھر مجلس

عزا منعقد ہوتی ہے ماتم ہوتا ہے اور آخر میں جلوس اختتام پذیر ہوتا ہے۔ جلوس میں نکالے ہوئے
علم، تعزیہ اور نشان وغیرہ واپس اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچا دیئے جاتے ہیں۔ اردو شاعری میں ان
جلوس ہائے عزا کا ذکر بھی کسی نہ کسی انداز میں پایا جاتا ہے۔

۳۔ سیہ پوشی

رنگوں کی بھی اپنی ایک اہمیت اور حیثیت ہوتی ہے ان کی پسندیدگی مزاج کی عکاس بھی
ہوتی ہے۔ مثلاً عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ گلابی رنگ پسند کرنے والے نفیس پسند ہوتے ہیں۔ سفید
رنگ پسند امن کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ نیلا رنگ روحانیت کا ثبوت مانا جاتا ہے۔ سرخ رنگ
خطرے کا سگنل خیال کیا جاتا ہے یا اشتراکیت کا نشان اور زرد رنگ فنکارانہ مزاج کا غماز تصور کیا جاتا
ہے۔ اسی طرح شروع ہی سے سیاہ رنگ غم والم کا عکاس نظر آتا ہے۔ بادلوں کا رنگ سیاہ ہوتا
ہے۔ انسانی آنکھ کی پتلی کا رنگ سیہ ہے اور دونوں کا کام برسنا یعنی رونا ہے۔ ایسے بھی جب کسی قسم
کے غم وغصہ کا اظہار کرنا ہوتا ہے تو سیاہ جھنڈیاں دکھائی جاتی ہیں استعمال کی جاتی رہی ہیں حاکم وقت
کی موت پر رعایا سیاہ پٹی بازو پر باندھ کر وفاداری اور ہمدردی کا ثبوت دیتی ہے۔ (چنانچہ ہندوستانی
مسلمانوں نے اپنی وزیراعظم اندرا گاندھی کے فرزند عزیز سنجے گاندھی کی ناگہانی موت پر بازو پر سیہ
پٹیاں باندھ کر نماز جمعہ ادا کی) اور ایسے کئی موقعوں پر یہی عمل دہرایا گیا اور دہرایا جاتا ہے۔

غرض یہ کہ سیہ پوشی کی رسم بہت قدیم ہے۔ اور ہر خطہ میں اس کا رواج ہے۔ چین میں
میت جس گاڑی میں اٹھائی جاتی ہے اس پر سیاہ پردے پڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ عیسائی اپنے
عزیزوں کی موت پر چالیس دن تک سیاہ کپڑے پہنتے ہیں عرب میں مصیبت زدہ کے لیے سیہ
لباس پہننے کا عام رواج ہے۔ مشہور عربی شاعر متنبی کا یہ شعر اس کا ثبوت ہے۔

و مثلك يوتى من بلاد بعيدة
ليمحك ربات الحداد اليواكيا

(تیرے مثل بہت سے ہیں جو دور دور کے شہروں سے آتے ہیں۔ تا کہ ہنسادیں۔ ان رونے والی
عورتوں کو جو سیاہ لباس پہنے ہوئے ہیں۔)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیہ پوشی عرب میں شروع ہی سے غم کی نشانی سمجھی جاتی رہی
ہے۔ ایک راہب کو کسی نے سیاہ بالوں کی چادر اوڑھے دیکھ کر پوچھا کہ سیاہ پوش کیوں ہے؟ اس
نے جواب دیا "یہ پوشش غمزدہ لوگوں کی ہے اور میں سب سے بڑا غمگین ہوں" پوچھا کس چیز نے
تجھے غم زدہ کیا ہے۔ کہا "میں نے اپنے نفس کو گناہوں کے میدان میں قتل کر دیا ہے۔ اب اس
مقتول پر روتا ہوں"

(سرفراز محرم نمبر ۱۳۶۱ھ صفحہ ۴۲ سیہ پوشی از مولانا سید آغا مہدی، بحوالہ کتاب المستحسن صفحہ ۵)

حضرت ہابیلؑ کی موت پر خدائے تعالیٰ نے آدمؑ و نسل آدم کو دفنانے کا طریقہ سکھانے
کے لیے ایک کوے کو بھیجا۔ (پ ۶ نصف جز صفحہ ۱۱ قرآن مجید مطبوعہ نظامی دہلی ۱۳۲۴ء)

اس کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ "یہ (کوا) ایک ملک تھا جو زاغ کی صورت میں بے خبر
انسان کے لیے تعلیم دینے آیا تھا چونکہ نبی زادہ کے قتل کا سخت واقعہ تھا ممکن ہے کہ خدا نے پسر مردہ
کے باپ کی تسکین کے لیے اس طائر کو منتخب کیا جو خود سیہ پوش ہے۔" (ایضاً)

اول نبی کے فرزند کا غم سیہ پوش کی طرف اشارہ کناں ہے تو ظاہر ہے کہ خاتم
النبیینﷺ کے فرزند کے غم میں سیہ پوشی شیعوں کی رسم ہی نہیں۔ نبیﷺ کے غم میں شرکت کا
اظہار کرتی ہے۔ ویسے بھی روایتوں میں موجود ہے کہ امام حسینؑ کا غم تمام عالم نے منایا اور فضاؤں
نے سیہ ردا اوڑھ کر ماتم کیا۔ خود خانہ کعبہ بھی سیہ پوش نظر آتا ہے۔ یہ چادر مصر سے آتی ہیں جیسا کہ
ابراہیم رفعت پاشا ابن سویلی بن عبدالجواد بن مصطفیٰ عرب کی باتصویر تاریخ میں لکھتے ہیں۔

ترجمہ: کعبہ کی پوشش کالے ریشم کی ہے جو مصر کی بنی ہوئی ہے۔ اس پر لکھا ہوا ہے اللہ جل
جلالهٔ لا الله محمد رسول الله۔" (بحوالہ ایضاً)

(مراۃ الحرمین صفحہ ۲۶۵ جلد اول مطبوعہ مصر ۱۳۴۴ھ ۳)

چادر کعبہ کا رنگ کس کے حکم سے سیہ اختیار کیا گیا۔ اور کب سے اس کے متعلق بہت کم
لوگ جانتے ہیں۔ البتہ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ ہجرت رسولﷺ سے ایک ہزار برس پہلے اللہ
تعالیٰ نے اپنے گھر کو اسعد بن تبع حمیری (جس کو طبری و صاحب حبیب السیر نے تبع اصغر کے نام
سے پکارا ہے) کے ہاتھوں سے سیاہ پوش کرادیا تھا۔ (رسالہ براہین ترحمیہ فی اثبات الرسالہ محمدیہ

مولفہ ناصرالدین ابوالامیر محمد رحم الٰہی منگوری)

چنانچہ اہل اسلام ہر سال آٹھ ذی الحجہ کو سیاہ رنگ کا غلاف (جو رنگ عام دنیا میں نشان غم مانا گیا ہے) بیت اللہ کو پہناتے ہیں۔ اس کا حقیقی راز یہ ہے کہ اسی آٹھ ذی الحجہ کی تاریخ کو حسب تصریح مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی مصنف سرالشہادتین "جناب امام حسینؑ مع اہل بیت کے (اپنے آخری حج کو بحالت خوف عمرہ سے تبدیل کر کے) زمانہ حج میں خانہ کعبہ سے اندوہ گیں رخصت ہو کر بہ سمت مقتل کربلا روانہ ہوئے تھے۔"

(بحوالہ اصلاح جلد ۶ ۱۳۵۱ھ صفحہ ۳۵)

مگر مولوی سلیمان ندوی نے تسلیم کیا ہے کہ یہ چادر عاشورے کے دن تبدیل کی جاتی ہے۔ (مجموعہ فتاوٰی تعزیہ داری صفحہ ۲۷ شائع کردہ انجمن تحفظ ملت لکھنؤ)

خود رسول مقبول ﷺ کی چادر کا رنگ بھی سیاہ تھا۔ (بحوالہ اصلاح جلد ۶ ۱۳۵۱ھ) اور اسی وجہ سے اکثر صوفیائے کرام انہیں کالی کملی والا کہہ کر یاد کرتے تھے۔ جناب سیدہ فاطمۃ الزہراؑ کے متعلق بھی عام طور پر یہی خیال کیا جاتا ہے کہ وہ سیہ پوش رہتی تھیں۔ علامہ ابو اسحٰق اسفرائینی نے جناب سکینہ بنت حسینؑ کا ایک خواب نقل فرمایا ہے جس میں جناب سیدہ کے بارے میں تحریر کرتے ہیں۔

"سکینہ دختر حسینؑ کا بیان ہے کہ میں نے پھر پانچ خواتین دیکھیں جن کی عظمت اور نورانیت بہت بڑھی ہوئی تھی۔ اور ان کے درمیان میں ایک عظیم الشان خاتون اپنے سر کے بال کھولے ہوئے اس طرح کہ سیاہ لباس زیب جسم اور ہاتھوں میں خوں آلودہ پیراہن تشریف رکھتی ہیں"

یزید کے دارالسلطنت میں بھی بعد شہادت امام حسینؑ جو مجلس عزا لٹے ہوئے قافلے نے منائی تھی۔ اس کے بارے میں خواجہ لطیف انصاری لکھتے ہیں۔

شیعہ حضرت امام حسینؑ اور جمیع شہیدان کربلا کے غم میں محرم کی پہلی تاریخ سے لے کر چالیس روز تک سیاہ لباس پہنتے ہیں۔ اور یہ رسم ان کے یہاں اتنی عام ہوگئی ہے کہ اب زمانہ محرم میں سیہ پوشی شیعیت کی علامت خیال کی جاتی ہے۔ شیعہ اپنے تابوت و جنازہ پر بھی سیاہ کپڑا ڈھکتے

ہیں۔ ان کے علماء و آئمہ بھی سیاہ عمامہ و عبا پہنتے ہیں۔ عورتیں سیاہ برقعہ استعمال کرتی ہیں۔ محرم کے جلوس میں جو علم یا پھریرے لٹکائے جاتے ہیں وہ بھی عام طور پر سیاہ ہی ہوتے ہیں۔ مجلس عزا میں شہداء کی یاد میں جو تابوت اٹھائے جاتے ہیں۔ ان پر بھی سیاہ چادر ڈالی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ مزاروں پر بھی سیاہ چادر کا استعمال عام ہے۔

لیکن اگر دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھیے تو یہ رنگ محض غم کی علامت نہیں بلکہ احتجاج کی علامت بھی ہے۔ چنانچہ ساری دنیا میں جب کسی ظلم و زیادتی یا ناانصافی کے خلاف آواز اٹھائی جاتی ہے تو احتجاج کنندگان یا تو سیاہ لباس پہنتے ہیں، سیاہ جھنڈیاں نکالتے ہیں یا پھر اپنے بازوؤں اور پیشانیوں پر سیاہ پٹیاں باندھتے ہیں۔ واقعہ کربلا کے بعد حامیان حسینؑ نے یزیدی ظلم و ستم کے خلاف برسر راہ جب احتجاجی جلوس نکالے تو اسی سیاہ لباس، سیاہ جھنڈیاں اور سیاہ پٹیوں کا سہارا لیا۔ اور ساری دنیا پر آشکارا کر دیا کہ حق پر حسینؑ تھے یزید نہیں۔ اگر شیعیان حسینؑ ایسا نہ کرتے تو آج عالم اسلام کا ہیرو یزید ہوتا، امام حسینؑ نہیں۔ اور نہ ہی اسلام وہ اسلام ہوتا جو حضور ﷺ نے پیش کیا تھا۔ بلکہ ایک ایسا باطل پرست مذہب بنام اسلام رہ جاتا جو یزید کا پیدا کردہ تھا۔ شیعیان حسینؑ کی یہ سیہ پوشی اسلام کو روشنی عطا کر گئی۔ اور تب سے آج تک صدیوں سے اس حقیقت کے اعادے اور یاد دہانی کے طور پر وہ محرم میں سیہ پوشی کی رسم جاری ہے۔ تاکہ ہر دور کے انسان یزید کے فسق و فجور اور ظلم و ستم سے واقف ہوں اور نام حسینؑ کی حق پرستی و سرفروشی اور اسلام کی از سر نو زندگی کا احساس دلوں میں زندہ و تابندہ رہے۔

۴۔ تعزیہ داری

لفظ "تعزیہ" "تعزیت" سے نکلا ہے۔ جس کے معنی ماتم پرسی یا مرنے والے پر اظہار رنج و غم کے ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں شیعہ اور سُنّی علماء کے درمیان قدرے اختلاف پایا جاتا ہے مثلاً...

مولوی خیرات احمد وکیل شیعہ نے اپنی کتاب "نور ایمان صفحہ ۳۳۲ سے ۳۸۴ تک تعزیہ اور اس کے متعلقات پر مفصل بحث کی ہے۔ اس میں درج ہے کہ تعزیہ نقلِ روضۂ مبارک امام حسینؑ ہے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی تحفہ اثناء عشریہ باب گیارھواں خواص شیعہ کے ذیل میں نوع شانزدہم میں فرماتے ہیں۔

"کسی چیز کی صورت اور نقل کو اصلی ٹھہرالینا یہ ایک وہم ہے۔ اور اس وہم نے اکثر بت پرستوں کو سیدھی راہ سے بہکا کر گمراہی کے گڑھے میں گرادیا۔ شیعہ حضرات میں بھی اس قسم کے وہم نے بہت غلبہ حاصل کرلیا ہے۔ یہ لوگ حضرت امام حسینؑ و حسنؑ اور حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہؑ کی قبروں کی نقل بنا کر خیال کرتے ہیں کہ یہ ان بزرگوں کی نورانی قبریں ہیں۔ اور ان کے ساتھ اور کے ساتھ از حد تعظیم کرتے ہیں۔ بلکہ سجدہ بھی کرتے ہیں۔ فاتحہ درود و سلام بھیجتے ہیں اور خوب شرک کی داد دیتے ہیں۔"

شیعوں کے مجتہد اعظم آقائی خوئی کے وکیل مولانا سید ابوالحسن تعزیہ کی بابت رقم طراز ہیں۔

"تعزیہ ہو یا ضریح محاورے میں اس کو نقل روضۂ سید الشہداء کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ دنیا کبھی اسے بدعت بتاتی ہے۔ اور کبھی بت پرستی کا لباس پہناتی ہے اور جب کوئی بس نہیں چلتا تو اصراف بے جا کا ڈھونگ رچا کر سد راہ ہوتی ہے۔ تعزیہ دفن کرنے کو بے حرمتی تصور کرتی ہے"

(سرفراز محرم نمبر ۱۳۷۵ھ اروا سم ماہ محرم صفحہ ۱۶)

خطیب اہل بیت مولانا سید عباس رضوی "اسلام اور تعزیہ داری" صفحہ ۱۷ پر شاہ عبدالعزیز کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "تعزیہ فقط روضہ امام حسینؑ کی نقل ہے۔ غیر ذی روح چیز اس کی نقل بنانا آپ کی شریعت خاص میں شرک ہو تو ہو مگر مسلمات اسلام کی رو سے شرک نہیں ہے۔ منبر رسول ﷺ کی نقل میں کروڑوں منبر بنا کر مسجدوں میں رکھے جاتے ہیں۔ اور ان کا احترام کیا جاتا ہے۔ مسجد نبوی کی نقل میں کروڑوں مسجدیں بنائی جاتی ہیں۔ اور ان کی حرمت و تعظیم ہر مسلمان پر واجب ہے۔ اور آپ کی شریعت نقل روضہ کو حرام و شرک قرار دیتی ہے۔ بڑی عبرت کا مقام ہے۔"

ڈاکٹر جوزف اپنی کتاب "اسلام و اسلامیان" میں رقم طراز ہیں۔

"من جملہ امور سیاسی کے جس کو فرقۂ شیعہ کے بزرگوں نے چند قرن سے اس طرف مذہبی لباس پہنادیا ہے۔ اور جس نے اپنے اور بیگانوں کے دل اپنی طرف کھینچ لیے ہیں۔ اظہار کا اختیار کرنا ہے جس کا نام شبیہہ و تعزیہ ہے۔ ماتم حسینؑ میں فرقۂ شیعہ نے اس نکتہ سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر اس کو مذہبی لباس پہنادیا ہے۔ بہرصورت جو اثر کہ تعزیہ اور شبیہہ سے خاص و عام کے دل پر ہونا چاہئے وہ ہوتا ہے............ اور جتنا خیال میں آسکتا ہے اس سے بھی زیادہ اس فرقہ کے اعتقاد کو مضبوط کرتا ہے اور انہیں باریک نکتوں سے اس بات کا پتہ لگتا ہے کہ مذہب شیعہ کی ترقی کے آغاز سے آج تک یہ نہیں سنا گیا کہ ان میں سے چند لوگوں نے یا ایک جماعت نے اسلام کو ترک کیا ہو۔ یا دیگر اسلامی فرقوں کی طرف مائل ہوئے ہوں۔ یہ لوگ شبیہہ کو کئی طرح نکالتے ہیں۔ کبھی مجالس مخصوص میں اور کبھی مقررہ مقامات پر............ اس عمل شبیہہ نے خاص و عام کو ایسا گرویدہ بنالیا ہے کہ بعض اسلامی فرقے اور ہنود بھی۔ شیعوں کی تقلید کر کے شبیہہ نکالنے میں ان کا ساتھ دیتے ہیں۔"

حالانکہ شیعوں کی اس رسم تعزیہ داری پر عام طور پر اکثر غیر شیعہ مسلمان اعتراضات کرتے ہیں۔ لیکن شیعہ بھی ان کا جواب دیتے رہے ہیں۔ مثلاً

۱۔ تعزیہ داری پر سب سے پہلے اعتراض جو کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ تعزیہ دار بت پرستی کرتے ہیں۔ شیعہ حضرات اس کے جواب میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ تعزیہ داری بت پرستی ہرگز نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ تعزیہ میں حضرت امام حسینؑ کا کوئی مجسمہ یا تصویر نہیں ہوتی خود تعزیہ بت نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ بت کے لیے ضروری ہے کہ مجسمہ کسی ذی روح کا ہو۔ جو پتھر کا بنا ہو۔ اور اسے لوگ اپنا معبود سمجھتے ہوں۔ کسی عمارت کے نقشے کو خواہ وہ اینٹ، گارا، پتھر، کاغذ یا لکڑی وغیرہ سے بنایا گیا ہو۔ بت نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ اگر عمارت کے نقشوں کو بت تصور کیا جائے تو دنیا کی مساجد جو مسجد اقصیٰ واقع آسمان کے نمونے پر ترتیب دی گئی ہیں۔ ضرور مسجد اقصیٰ کا بت کہلائیں گی۔ لہٰذا تعزیہ بت نہیں ہوسکتا۔ اب رہ گئی اس کی تعظیم جس کو بت پرستی سے مشابہ کیا جاتا ہے۔ یہ

مشابہت بالکل غلط ہے۔تعزیہ کی تعظیم محض روضۂ حسینؑ کی نقل ہونے کی حیثیت سے عقیدتاً و محبتاً کی جاتی ہے۔جیسے اکثر مدینہ منورہ یا کعبہ شریف کے کاغذی نقشے کی جانب جن کو لوگ اپنے کمروں میں بطور زیبائش و بغرض برکت لگاتے ہیں۔پیر نہیں پھیلاتے۔آج تک کوئی مسلمان ان تصویروں پر پیر رکھ کر کھڑا ہونے کی گستاخی نہیں کر سکا۔حالانکہ یہ اصل نہیں۔اسی طرح تعزیہ کو روضۂ حسین کی نقل ہونے کی وجہ سے قابلِ تعظیم و احترام سمجھا جاتا ہے۔اور اس کے ساتھ بدتہذیبی معیوب سمجھی جاتی ہے۔

دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ چونکہ تعزیہ داری بت پرستی ہوتی ہے لہٰذا تعزیہ فروش بت فروش کے برابر ہے۔تعزیہ داری کے حامی مسلمان پہلے اعتراض کی دلیل کی روشنی میں دوسرے اعتراض کا بھی جواب دیتے ہیں۔یعنی جب تعزیہ داری بت پرستی نہیں تو تعزیہ فروش بت فروش کیسے ہوسکتا ہے۔؟

ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ تعزیہ میں دو قبریں بنائی جاتی ہیں اور بلا مردے کے قبر بنانا گناہ عظیم ہے۔تعزیہ داروں کا جواب یہ ہے کہ تعزیہ میں قبر ہرگز نہیں بن سکتی۔قبر کے لیے زمین کا ہونا لازمی ہے۔اور کھودا جانا ضروری ہے جس کو کم علم قبر کا نام دیتے ہیں۔وہ دراصل نشان تربت بنایا جاتا ہے۔جس کے لیے کوئی حکم نہیں۔دو قبروں کے نشان اس غرض سے دکھائے جاتے ہیں کہ امام حسنؑ و حسینؑ دونوں کی شہادت کا ایک ہی مقصد تھا۔لہٰذا حیات جاوید حاصل کرنے کے بعد بھی ایک دوسرے سے جدا نہیں رہ سکتے۔(بحوالہ سرفراز محرم نمبر ۱۳۵۵ء صفحہ ۴)

تعزیہ داروں پر ایک اور اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اسے چوما جاتا ہے۔سجدے کئے جاتے ہیں۔اور دعائیں مانگی جاتی ہیں۔جبکہ یہ تمام افعال شرک ہیں۔شیعہ اس سلسلہ میں عام مسلمانوں کی غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ تعزیوں کو سجدے ہرگز نہیں کئے جاتے۔جب اصل مزار امامؑ کو سجدہ نہیں ہوتا تو نقل کو کیسے ہوسکتا ہے؟ البتہ تعزیہ کو چومنا عقیدت و احترام کو ظاہر کرتا ہے۔لوگ تعزیہ کا نہیں بلکہ اس نسبت کا احترام کرتے ہیں جو انہیں روضۂ سید الشہداؑ سے ہے۔اور شعائر اللہ کی تعظیم کو اسلام نے شرک کبھی نہیں بتلایا۔بلکہ نصِ قرآن جائز ثابت ہوتا ہے۔یعنی صفا و مروہ خود معمولی پہاڑ ہیں۔لیکن سعی ہاجرہؑ سے شعائر الٰہی ہوگئے۔اور محترم

ہیں۔منیٰ کا احترام اس لیے ہے کہ اس مقام پر حضرت ابراہیم نے مرضئ الٰہی کی تکمیل کے لیے اپنے عزیز فرزند کے گلوئے مبارک پر چھری رکھ دی تھی۔اور خدا کی راہ میں حضرت اسمٰعیل کو ذبح کرنے کے لیے تیار ہوگئے تھے۔جب یہ تمام مقامات مقدس ہوسکتے ہیں تو پھر اس کا مزار مبارک اور اس کے آثار شعائر الٰہی سے کم کیسے ہوسکتے ہیں۔جس نے نہ صرف اپنا گھر بار لٹایا۔بلکہ راہ خدا میں اپنے تمام عزیزوں، رشتہ داروں اور دوستوں کو قربان کردیا۔بلکہ خود بھی گلا کٹادیا؟ اگر اللہ کے اس محبوب بندے کے وسیلے سے کوئی اللہ کی جناب میں دُعا کرے تو کون سا گناہ لازم آتا ہے۔جبکہ قرآن پاک خود وسیلہ اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ یَـا اَیُّهَـا الَّـذِیْـنَ آمَـنُوْا اتَّقُو اللّٰه وَاَبْتَغُوْ اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ ۔

حجر اسود کا پتھر قابل بوسہ اور لائق احترام ہے۔اور اس کے پاس کھڑے ہوکر دعا کرنا باعثِ قبولیت سمجھا جاتا ہے۔کعبہ ایک گھر ہے جس کو بندے کے ہاتھوں نے بنایا۔لیکن اللہ نے اپنے سے نسبت دیدی تو مسجد خلائق بنا۔تعزیہ بھی چونکہ سید الشہداء سے منسوب ہوتا ہے۔لہٰذا اس کی تعظیم و توقیر کی جاتی ہے۔

یہ تو تھے تعزیہ داری پر عام اعتراضات اور اس کے جوابات اب رہ جاتا ہے سوال اس کی ابتداء و اصل کا۔کہ تعزیہ داری کی رسم کب اور کس نے شروع کی۔اس سلسلے میں بھی مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔

مولانا مراد از ہروی رسالہ ''مولوی'' ماہ ذی الحجہ ۱۳۵۲ھ کے شہید نمبر میں اپنے مضمون ''تعزیہ داری کی حقیقت'' میں لکھتے ہیں۔

> ''اس کی اصل نہ عہد رسالت سے ہے اور نہ زمانۂ صحابہ سے۔اور نہ وقت شہادت حضرت امام حسینؑ سے۔بلکہ کئی صدیاں گذر جانے اور خلافت ہائے امیہ و عباسیہ کا تخت اقبال الٹ جانے کے بعد اس کی بناء قائم ہوئی۔''
>
> (صفحہ ۴۱)

یہ ایک مضحکہ خیز خیال ہے روضہ حسینؑ رسول ﷺ کے زمانے میں کب تھا جو اس کی نقل رہتی؟ البتہ کربلا کی مٹی کو ہاتھ میں لے کر رسول اللہ ﷺ نے ضرور گریہ فرمایا ہے۔حضرت شیخ

عبدالقادر جیلانیؒ غنیۃ الطالبین جلد دوم کے صفحہ ۶۱ پر تحریر فرماتے ہیں۔

''حضرت ام سلمہ سے روایت ہے کہ ایک روز جناب رسول خدا ﷺ میرے گھر میں تھے۔ اور حسینؑ آپ کے پاس آئے۔ میں نے جب دروازے سے جھانک کر دیکھا تو حسینؑ کو سینۂ پیغمبر ﷺ پر پایا۔ حضور ﷺ کے دست مبارک میں مٹی تھی۔ اور آپ رو رہے تھے۔ جب حسینؑ باہر گئے تو میں نے عرض کی آپ پر میرے ماں باپ فدا۔ یارسول اللہ جب میں آئی تو آپ کے ہاتھ میں مٹی دیکھی اور آپ رو رہے تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ حسینؑ کے آنے کی وجہ سے خوش تھا اور وہ میرے سینے پر کھیل رہا تھا کہ جبرئیلؑ آئے اور خبر شہادت دی اور یہ مٹی دی اس لیے رویا۔''

بعد شہادت حسینؑ کربلا میں حضرت کا روضہ بنا اور کربلا عرب میں واقع ہے وہاں کے لوگوں کو کیا ضرورت جو اس کی نقل بنائیں؟ زمانہ محرم میں ہر قریہ سے وہاں لوگ جمع ہو کر روضۂ اقدس کی زیارت اور ماتم کرتے ہیں۔ (غنیۃ الطالبین مصنفہ غوث الاعظم عبدالقادر جیلانی) البتہ عرب کے علاوہ ہر ملک میں ماتم خانہ موجود ہے۔ مثلاً مصر' ترکستان' ایران' ہندوستان وغیرہ (مولانا شبلی و خواجہ حسن نظامی) لیکن بنی امیہ اور بنی عباس کی خلافت کے بعد کیونکہ اس زمانہ میں بنی فاطمہ پر وہ وہ مظالم ہوئے کہ جس کی کوئی حد نہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ وہ غم حسینؑ میں صف ماتم بچھانے کی اجازت خلفائے وقت سے پا سکتے تھے۔ جبکہ قبر حسینؑ ہی کے مٹا دینے کی فکریں کی گئیں تو اس کی نقل تعزیہ بنانے کی کیسے اجازت مل سکتی تھی؟

تعزیہ داری کے متعلق سب سے عام خیال یہ ہے کہ اس کی بناء امیر تیمور نے ڈالی چونکہ تیموری عہد میں بادشاہ' وزراء' بیگمات و اہل لشکر تمام شیعہ تھے۔ لہٰذا امیر تیمور نے امام حسینؑ کے روضہ کی نقل لا کر تعزیہ کی صورت میں تیار کرایا۔ تاکہ ہندوستان کے شیعہ اسی نقل کے ذریعہ زیارت کربلائے معلیٰ کا ثواب حاصل کر سکیں۔

صاحب طوفان البکا نے مرقع صفحہ ۸۳ پر لکھا ہے امیر تیمور نے ہی ہندوستان میں نفاذ تعزیہ داری کیا۔

فرقت کاکوروی لکھتے ہیں۔

''تعزیہ داری کے بارے میں ابھی تک پوری تحقیق اور تدقیق کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی ابتداء کہاں سے ہوئی۔ البتہ اس کے آغاز کے بارے میں ایک روایت یہ ضرور مشہور ہے کہ سب سے پہلا تعزیہ صاحب قرآں امیر تیمور نے رکھا تھا۔ اور اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ تیمور کو حضرت امام حسینؑ سے بے حد عقیدت تھی۔ اور وہ ہر سال کربلائے معلیٰ روضۂ اطہر کی زیارت کو جاتا تھا۔ ایک سال جنگ و جدال میں وہ اس درجہ مصروف رہا کہ زیارت نہ کر سکا۔ چنانچہ اس نے روضۂ اقدس کی شبیہ منگوا کر اس کو تعزیہ کی صورت میں بنوا لیا۔ اور اس کی زیارت سے تسکین حاصل کر لی۔''

مولانا مراد ار ہروی بھی لکھتے ہیں۔

''رفتہ رفتہ تیموری فتوحات کا دائرہ ارض ہند تک وسیع ہو گیا اور ان کے لشکر کے ہندوستان میں قیام اور سلطنت و جنگ کے انتظام کے باعث یہ ضرورت داعی ہوئی کہ تمام وزراء و امراء و اہل لشکر اپنے اپنے مرکز میں موجود ہیں۔ اور سال بہ سال کربلائے معلیٰ کا جانا موقوف کر دیں۔''

چنانچہ احکام نافذ ہو گئے۔ جب دلوں میں آگ ایک طرف سلگ گئی تو اس کا بجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ شکایات بڑھنے لگیں۔ شکوے شروع ہو گئے۔ سلطان تیمور تک بھی شیعوں کے اس اضطراب کی خبریں پہنچنے لگیں۔ تیمور کو اہل لشکر کی دلجوئی منظور تھی۔ اور انہیں زیارت کی اجازت بھی نہ دے سکتا تھا۔ آخر اہل دربار کی رائے سے اور نامور ماہرین کو کربلائے معلیٰ بھیج کر روضۂ امام شہید کی ایک تصویر منگوا کر اور پھر اس کے مطابق اس کی ایک نقل بنوا کر لشکر میں رکھ دی۔

تاکہ لشکری اس کی زیارت کر کے کربلائے معلیٰ کا ثواب حاصل کر لیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور شیعہ حضرات اس نقل کی زیارت کو کربلائے معلیٰ کی زیارت سمجھنے اور باعث ثواب سمجھنے لگے تھے۔''

امامیہ مشن لکھنؤ کا رسالہ نمبر ۱۱۲ (عزائے حسین پر تاریخی تبصرہ) کے صفحہ ۸۷ پر تحریر ہے۔

''تعزیہ سب سے پہلے تیمور بادشاہ نے بنایا۔ مگر یہ ہماری کوتاہی معلومات ہے۔ کہ اب

تک اس زمانہ کی تاریخوں میں اس کے ماخذ کا پتہ نہیں چلا ہے۔"

البتہ الطفیر ان العتابیہ الاحراق مصائد الوہابیہ کے حوالے سے سید ہادی حسین نقوی تیمور کا ایک خواب بیان کرتے ہیں کہ جب میں نے روم پر چڑھائی کی۔ لشکر میرا قریب کربلائے معلی مقیم ہوا۔ شب کو میں نے خواب میں دیکھا کہ چند آدمی کربلائے معلی کی طرف سے آتے ہیں۔ ایک شخص ایک ضریح سر پر لیے ہوئے آتا ہے۔ قریب آ کے انہوں نے سلام کیا۔ اور کہا کہ ہم روضۂ منورہ امام حسینؑ کے خدام ہیں حضرت نے یہ ضریح خاک پاک تمہارے واسطے بھیجی ہے۔ اور فرمایا ہے کہ اس کو اپنے ساتھ رکھو کہ یہ تیری فتح و نصرت کا ذریعہ ہوگی۔" بعد اس کے میری آنکھ کھل گئی۔ جب صبح ہوئی اور میں نے کوچ کی تیاری کی سامنے سے اتنے ہی آدمی سر پر ضریح رکھے ہوئے دکھائی دیے۔ نزدیک آ کر سلام کیا اور جیسا میں نے خواب میں دیکھا تھا وہی تقریر کی۔ اور ضریح مجھ کو دے کر چلے گئے۔ اس ضریح کو بہ احترام تمام اپنے ساتھ رکھا تھا۔ اور میں نے جو روم پر فتح پائی یہ برکت اسی ضریح مبارک کی ہے" ('یہ 'تزک تیمور' غالباً وہی ہے جس کا دعویٰ ابو طالب حسینی نے کیا تھا۔ ۱۷۸۳ء میں میجر ڈیوی اور جوزف وائٹ نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا۔ ۱۷۸۷ء میں پروفیسر لنگ نے فرانسیسی ترجمہ کیا۔ اصل کتاب تُرکی زبان میں تھی)

"کیفیت شاہِ ہند" میں ایک دوسری روایت مرقوم ہے۔

"امیر تیمور کی عمر ۲۵/سال کی تھی۔ ستارہ اقبال عروج پر آیا۔ بلخ کی عنانِ حکومت ہاتھ میں آئی۔ سمرقند کو دارالحکومت قرار دیا۔ اسی زمانہ میں کوفہ پہنچا۔ اور وہاں سے کربلائے معلی حضرت امام حسینؑ کے روضے میں گیا تو ایک ہاتف غیبی کی آواز سنی کہ حضرت حر کی قبر پر جا کر تبرک لے۔ چنانچہ وہ وہاں گیا۔ وہاں دو علم اور ایک رومال اس کو عنایت ہوا۔ اور حکم دیا گیا کہ جب ہندوستان پہنچے تو محرم کی چاندرات سے یہ دونوں نشان کھڑے کرنا۔ اور دسویں محرم کو سال سال فاتحہ دلانا۔ ہندوستان کی فتح کر لیا۔ اور دہلی کے تخت پر قابض ہوا۔ اس روز سے تعزیہ کا رواج ہوا۔" ('رضا کار' سید الشہدا ، نمبر ۱۹۷۸ء صفحہ ۳۷)

بعض لوگ اس خیال سے متفق نہیں کہ تیمور تعزیہ داری کا بانی یا موجد ہے اور اس کے

جواز میں مختلف دلیلیں پیش کی جاتی ہیں۔ اول یہ کہ تعزیہ کا وجود ایران میں نہیں۔ جہاں تیمور کی اولاد کوئی سو برس تک اس سرزمین کے مختلف علاقوں پر حکمرانی کرتی رہی۔ دوم تیمور آندھی کی طرح آیا اور بگولے کی طرح لوٹ گیا۔ اور اس سرزمین پر اس نے عشرۂ محرم نہیں کیا۔

ان اعتراضات کے جواب سے قبل احمد ابن عرب شاہ کی کتاب کا انگریزی ترجمہ (جو جے۔ ایس سینڈرز نامی آئی۔ سی۔ ایس افسر نے کیا ہے۔) کا حوالہ دینا ضروری نظر آتا ہے۔ عرب شاہ نے ایک مذاکرہ کا نقشہ کھینچا ہے۔ جس میں تیمور کے ساتھ اسلام کے مختلف فقیہہ موجود تھے۔ ان فقہاء میں ابنِ عرب شاہ کے علاوہ عبدالجبار بن نعمان خوارزمی (حنفی) قاضی علیم الدین (مالکی) اور قاضی شریف الدین وغیرہ شامل تھے۔ ابن عرب شاہ لکھتا ہے۔

"اور آخری سوال جو تیمور لنگ نے کیا وہ یہ تھا۔ علیؑ معاویہ اور یزید کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ یہ سن کر قاضی شریف الدین نے جو میرے پاس بیٹھے تھے۔ میرے کان میں آہستہ سے کہا کہ یہ (تیمور) شیعہ ہے اس لیے تم کو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کو کس طرح سے جواب دیا جائے۔ ابھی میں نے یہ الفاظ پوری طرح سنے بھی نہ تھے کہ قاضی علیم الدین المالکی نے تیمور سے مخاطب ہو کر کہا کہ ان میں سے ہر ایک اپنے عقائد کے لیے لڑا۔ یہ سن کر تیمور لنگ غصہ سے بھر گیا۔ اور کہا "علیؑ جائز خلیفہ تھے۔ جبکہ معاویہ و یزید غاصب............ لیکن تم حلب کے لوگ دمشق والوں سے مل جاتے ہو۔ جنہوں نے یزید کے پیروکار ہونے کی وجہ سے حسینؑ کو شہید کیا" پھر میں نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے المالکی کی طرف سے یہ کہتے ہوئے معذرت چاہی کہ المالکی نے ایسا جواب دیا جو کہ اس نے کتب میں دیکھا لیکن اس کا مفہوم نہ سمجھا۔ اس پر تیمور لنگ کا غصہ فرو ہوا۔ اور اس نے خاموشی اختیار کی۔" (صفحہ ۱۲۹ کتاب مذکور)

اس واقعہ سے تیمور لنگ کے محبِ علیؑ اور عاشق حسینؑ ہونے میں کوئی شک نہیں رہ جاتا۔ لہٰذا عاشق حسینؑ ہوتے ہوئے اگر اس نے حسینؑ کی یادگار قائم کرنے کے لیے کسی طریقہ کی بنا ڈالی تو اس کو قبول کرنے میں ہچکچاہٹ کیسی؟ یہ کوئی تعجب خیز امر تو نہیں؟ البتہ یہ

امکان ضرور ہے کہ جو شبیہہ روضۂ مطہر کی امیر تیمور نے بنائی تھی۔ اس سے موجودہ تعزیہ وضریح مختلف ہو۔

اب رہی یہ بات کہ اگر تیمور اس کا موجد تھا تو ایران میں اس کا رواج کیوں نہ ہوا۔ تو اس کے جواب میں سب سے پہلے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ تیمور اس کا موجد ضرور تھا لیکن مروج نہ تھا۔ تعزیہ داری اس نے کربلا سے دورہ کر اپنے ذاتی عقائد کی تسکین کے لیے شروع کی۔ کسی رسم کے طور پر اس کی بنیاد نہیں ڈالی تھی۔ لہٰذا اس کا رواج پاجانا ضروری نہیں اور پھر اس کی ساری زندگی فتوحات ومہمات میں گذری۔ اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ وہ کسی بات کو رواج دیتا۔ وہ تعزیہ اس کی اپنی ذاتی ملکیت کی حیثیت سے اس کے خانوادے میں تبرکاً استعمال ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ جب بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا تو وہ ضریح اس کے ساتھ تھی۔ اور جب فتح دہلی کے بعد محل سرا میں مقیم ہوا تو وہ ضریح اس کے ساتھ تھی اور جب فتح دہلی کے بعد محل سرا میں مقیم ہوا تو ایک حصہ درگاہ کے نام سے تعمیر کیا۔ اور اس میں اس ضریح کو نصب کیا۔ اسی کو دیکھ کر لوگوں نے نقل روضہ بنانی شروع کی۔ چونکہ اس سے قبل شاہانِ تیمور میں کسی نے اس کو ایسی انفرادی حیثیت ومقام نہ دیا تھا۔ جیسا کہ بابر نے ہندستان میں پہنچ کر کیا۔ لہٰذا ایران میں تعزیہ داری کا رواج نہ ہوا۔

(بحوالہ ُرضا کار ُلاہور سید الشہد اءنمبر صفحہ۔۲۴ ۸ ۱۹۷ء)

رسالہ مولوی شہاب الدین بن شمس بن عمر دولت آبادی میں مسطور ہے کہ یہ تعزیہ داری تیمور کے عہد سے بر بنائے یاددہانی وقیام عزاداری وزیارت شبیہہ ضریح جاری ہوئی۔ بعدۂ تمام سلاطین مغلیہ کے وقت میں الیٰ یومنا ھذا جاری رہی۔ اور اورنگ زیب ایسے متشرع بادشاہ کے وقت جس کے یہاں علمائے عرب وعجم وروم وغیرہ علاوہ علمائے ربانی اہل ہند کے موجود تھے۔ اور صدہا مشرکانہ رسومات توڑے گئے۔ مگر یہ رسم بدستور مرسومہ اس کے زمانے میں بھی جاری رکھی گئی۔ (اسلام اور تعزیہ داری صفحہ۔۲۱۔۲۰)

چنانچہ پروفیسر سیل چند نے اپنی کتاب "تاریخ عالمگیری" میں لکھا ہے کہ "روز عاشورہ اورنگ زیب نے ایک ضعیفہ کو دیکھا کہ سر پر تعزیہ رکھے قلعہ کی طرف جارہی ہے۔ دیکھنے کے ساتھ

ہی بادشاہ پر جذب واستغراق کی کیفیت جو کشف ومشاہدہ سے حاصل ہوتی ہے۔ طاری ہوگئی۔ جس سے وہ سر وپا برہنہ اس ضعیفہ کی طرف پیچھے پیچھے دوڑا یہاں تک کہ تعزیہ اس سے لے کر اپنے سر پر رکھ لیا اور قلعہ میں داخل ہوا۔ اور اس وقت سے عزاداری کرنے لگا۔ عہد عالمگیری کے اسباب عزاداری ابھی تک آگرے کے قلعہ میں محفوظ تھے۔ جن کی حفاظت گورنمنٹ خود کرتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ آگرہ کے قلعہ میں گورنمنٹ کی طرف سے مجالس عزا بھی برپا ہوتی تھیں۔" (مسلکِ اہلِ سُنّت اور عزاداری پر تحقیقی نظر از شمسی کاظمی کامرانی سجادۂ چشتیہ نظامی مطبوعہ ُسرفراز ُمحرم نمبر ۱۳۸۴ھ صفحہ۔۴۷۔۱۴۶)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ تعزیہ داری ہندوستان میں بہت پہلے سے موجود ہے۔ اور شیعہ حضرات کے یہاں خصوصیات سے باقاعدہ طور پر یکم محرم سے چہلم تک تعزیہ داری ہوتی ہے۔ انہیں کے زیر اثر سنّی اور ہندو حضرات بھی تعزیہ داری کرتے ہیں۔ چنانچہ مہاراجہ گوالیار اور بڑودہ باقاعدہ تعزیہ داری کرتے تھے۔ خود دکن میں اور لکھنؤ میں بھی کئی ہندو حضرات تعزیہ رکھتے تھے۔

لکھنؤ میں تعزیہ داری خاص اہتمام سے ہوتی ہے۔ اور مختلف طرح کے تعزیے بنتے ہیں۔ اور تعزیہ داروں کے نام سے منسوب ہیں۔ مثلاً فقیر کا تعزیہ' بخشو کا تعزیہ، چودھرائن کا تعزیہ' چھوٹی رانی کا تعزیہ وغیرہ۔

تعزیہ داری حالانکہ شیعہ اور سنیوں دونوں کے ہاں ہوتی ہے۔ لیکن شیعوں کے تعزیے سُنیوں سے قدرے مختلف ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی تصنع یا بناوٹ نہیں ہوتی معمولی طرح کے تعزیے ہوتے ہیں۔ لیکن سنیوں کے تعزیوں میں صنعت وحرفت کے اعلیٰ نمونے پیش کئے جاتے ہیں اور ان پر کافی دولت صرف کی جاتی ہے۔

۵۔ ماتم

وہ اہم خصوصیات جو کسی شیعہ کی شناخت سمجھی جاسکتی ہے۔ ماتم کی رسم ہے۔ شیعہ دنیا کے کسی بھی جگہ کا رہنے والا ہو۔ بچہ ہو یا بوڑھا۔ جاہل ہو یا تعلیم یافتہ، شہری ہو یا دیہاتی۔ مہذب ہو یا غیر مہذب ماتم حسینؑ کو اپنا فریضہ سمجھتا ہے اور اس میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتا ہے۔ اور یہی وہ رسم

ہے جس کی وجہ سے شیعہ عام طور پر دیگر فرقوں کی نظر میں ہدف ملامت کا شکار بنتے ہیں۔ یہی وہ رسم ہے جس نے شیعیت کو فروغ بھی پہنچایا ہے۔ اور اعتراضات کا شکار بھی بنایا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ماتم حسینؑ کی رسم شیعوں میں نہ ہوتی تو واقعہ کربلا کے سانحۂ عظیم ہونے کا احساس دنیا کو ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شروع ہی سے برسر اقتدار حکومتوں نے اس رسم پر نہ صرف پابندی لگانے کی کوشش کی۔ بلکہ اسے خلاف مذہب یا بدعت بھی قرار دیتے رہے۔ اور آج بھی مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد اس رسم کی مخالفت میں پیش پیش رہی ہے حالانکہ یہ وہ رسم ہے جس سے متاثر ہو کر غیر مسلم اقوام شیعیت کے توسط سے اسلام کی طرف راغب ہوئی ہیں۔ گاؤں اور دیہاتوں میں اب بھی بہت سے ہندو ماتمی جلوس میں عملی شرکت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

ویسے بھی تقریباً ہر مذہب وملت نے اپنے یہاں کسی کے مرنے پر کچھ نہ کچھ اوقات ماتم داری مقرر کیے ہیں چنانچہ منوسمرتی کے پانچویں ادھیائے میں لکھا ہے۔

> ''لڑائی کے میدان میں تلوار وغیرہ کے زخم کھا کر مرجائے تو اس کا کریا کرم
> اسی وقت ختم ہوجاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ پاکی بھی ختم ہوجاتی ہے۔ اگر غیر
> ملک میں مرجائے اور دس دن پورے نہ ہوئے ہوں تو دس دن میں جتنی کمی ہو
> اتنے دن اس کا ماتم کریں'' (ہندوؤں میں عزاداری و ماتم کے ایام
> از سید محمد اکبر مشمولہ فراز محرم نمبر ۱۳۶ھ صفحہ ۔ ۴۷)

یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جو عزاداری امام حسینؑ کے مخالف ہیں۔ ایک دوسرے کے یہاں کسی کے انتقال پر تعزیت و اظہار غم کے لیے آتے ہیں۔ مرد عورت سب اس کام کو انسانی فریضہ سمجھتے ہوئے انجام دیتے ہیں۔ اور صرف یہی نہیں کہ دنیا کی قومیں ایک دو دن ماتم پرسی و سوگ نشینی کرکے خاموش ہوجاتی ہیں۔ بلکہ کسی بڑی شخصیت کے انتقال پر ایک ایک ہفتہ دو دو ہفتے بلکہ اس سے بھی زیادہ دنوں تک ماتم پرسی اور سوگ مناتی ہیں اور مرنے والے کے آخری رسوم جہاں ادا کی گئی وہاں پھولوں کی چادر چڑھاتی ہیں۔ ہندوستان ہو یا عرب امریکہ ہو یا یورپ ہر جگہ اس کی ہزاروں مثالیں ہیں۔ اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کی جاتی بلکہ سالانہ ماتم پرسی کا رواج بھی قائم ہے پھر ایسے حالات کو دیکھتے ہوئے رسول اسلام کے نواسے' انسانیت کے محسن امام حسینؑ کی عزاداری

کے خلاف زبان و قلم کو حرکت میں لانا کیا معنی رکھتا ہے؟ اسی لیے شیعوں میں ماتم کی رسم اتنی ہی پرانی ہے۔ جتنا پرانا واقعۂ کربلا ہے۔

تاریخ عالم شواہد ہے کہ اس واقعہ فاجعہ پر نہ صرف یہ کہ چشم انسانی اشکبار ہوئی بلکہ قتل حسینؑ پر تمام کائنات نے ماتم کیا۔ یہاں تک کہ عاشورہ محرم کو دشت کربلا میں بعد زوال آفتاب قیامت برپا ہوئی۔ آسمان سے خون برسا۔ زمین کو زلزلہ آیا۔ خاک کے ذرات ہوا کی سیاہ چادر میں لپٹ کر آندھی بن گئے۔ دریائے فرات کا پانی موجوں کی صورت میں تڑپنے لگا۔ پہاڑوں کے سینے شق ہوگئے۔ پتھروں سے خون نمودار ہوا۔ حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ محبوب رب العالمین خاک آلود اور غمگین نظر آئے۔ ۲ زمین کربلا کی مٹی مدینہ میں خون بن گئی۔ ۳ چرند پرند مشغول نوحہ و بکا ہوئے۔ ایک طائر (غالباً کبوتر) نے سوگوار قاصد کا کام کیا۔ ہاتف غیبی نے آواز دی۔ ''قتل الحسینؑ بکربلا ذبح الحسینؑ بکربلا''۔ اسلامی مورخین تو یہاں تک کہتے ہیں کہ افق آسمان میں سرخی یوم شہادت فرزند رسول سے شروع ہوئی ہے۔ جواب تک نظر آتی ہے۔ اور اس سے قبل نمایاں نہ تھی۔ (مستدرک حاکم، مسند احمد حنبل)

تاریخ کامل' جزو چہارم صفحہ ۳۷ پر تحریر ہے کہ ''امام حسین کی شہادت کے دو یا تین مہینے بعد تک لوگ آفتاب کے نکل کر بلند ہونے تک دیواروں کو سرخ رنگ دیکھتے تھے۔ جیسے خون میں بھری ہوئی ہوں''۔ (درمنثور سیوطی۔ صواعق محرقہ وغیرہ)

علامہ ابن حجر مکی کی مشہور کتاب صواعق محرقہ صفحہ ۱۹ مطبوعہ مصر ۱۳۰۸ھ سے بحوالہ دلائل النبوۃ حافظ ابونعیم کی ایک روایت ہے کہ ''جب حسینؑ'' ابن علیؑ قتل ہوئے آسمان سے خالص خون تازہ کی بارش ہوئی۔ اور جب صبح ہوئی تو کنویں اور پانی کے کوزوں کو خون سے بھرا پایا گیا'' (اسلام اور تعزیہ داری صفحہ ۔ ۳۱)

سر الشہادتین (شاہ عبدالعزیز دہلوی) میں ہے۔ ''جب امام حسینؑ قتل ہوئے تو آسمان سے خون برسا۔ بیت المقدس میں جو پتھر اٹھایا گیا اس کے نیچے سے خون تازہ نظر آتا تھا۔''

غرضیکہ امام حسینؑ کی المناک شہادت پر مخلوقات عالم میں ان چیزوں سے آثار غم ظاہر ہوئے جن کی تحت میں بے شمار مخلوق ہے۔ یعنی جب آسمان سے خون برسا تو آسمان کی متعلقہ

چیزوں نے خون کے آنسو بہائے۔آسمان پر خونی شفق اور آفتاب عالمتاب جو صبح کو زمین کربلا پر طلوع ہوا۔تا زوال اس انقلابی منظر کا شاہد عینی ہے۔اسی طرح جب زمین کانپی اور زرات زمین خون بن گئے۔تو زمین کی متعلقہ چیزیں بھی متاثر اور مغموم ہوئیں۔یعنی پتھر ایسی سخت چیز سے خون نمودار ہوا۔پس اگر انسانی دل اس غم میں ماتم کناں ہوئے تو کوئی تعجب کی بات نہیں اور جس نے اس ماتم سے روکا وہ پتھر سے بھی سخت دل ہوا۔ایک شیعہ شاعر کہتا ہے۔

کرتا ہے عیاں منظر عاشور محرم ۔۔۔ شبیر ہوئے قتل دگرگوں ہوا عالم
نقارۂ بدعت سے نکلتی ہے یہ آواز ۔۔۔ جائز نہیں مقتول کا مظلوم کا ماتم

پتھر دل حامیان یزید اور بنوامیہ نے بنی ہاشم کو عام طور پر اور شیعیان آل محمد کو خاص طور پر ذکر حسینؑ اور یادگار شہادت قائم کرنے اور ماتم گساری سے روکا۔مگر یُریدون لیطفئوا نوراللہ واللہ متمّ نورہٖ ولو کرہ الکافرون (لوگ یہی چاہتے ہیں کہ نور خدا کو گل کر دیں مگر خدا کافروں کے علی الرغم اسے تابناک تر فرماتا ہے) کے مصداق ماتم حسینؑ کم نہ ہوسکا۔قیدی مخدرات عصمت اور معتوب شیعیان آل محمد ﷺ نے دعوؤں کے بغیر عملاً سوگ منانا شروع کیا۔زینب وام کلثوم نے نظم و نثر میں مجلیس پڑھیں۔جناب زینب نے چل کر پہلا اجتماع کوفہ میں دیکھا تو بھرے مجمع کو للکارا خود روئیں اور دوسروں کو رلایا۔اور دنیا کو بتایا کہ اس طرح ماتم مظلوم کا ماتم کرنا اور غم منانا صالحہ عابد حسین لکھتی ہیں۔

"روایت ہے کہ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد جب یزید کی فوج اہل حرم کو اسیر کرکے لے گئی اور شہدائے کربلا کے لاشے صحرا میں بے گور وکفن پڑے رہ گئے۔تو کربلا کے آس پاس کے دہقانوں نے جن کا پیشہ کھیتی باڑی تھا۔یہ دیکھا مگر یزید کے خوف سے چپ رہے مگر جب یہ حقیقت ان کی عورتوں پر ظاہر ہوئی تو انہوں نے حسینؑ پر گریہ و ماتم کیا۔اور مردوں کو نفرین کی۔ان کی غیرت کو للکارا۔تب قبیلۂ بنی اسد کے مردوں نے ان کو دفن کیا۔جب کوفے میں شہیدوں کے سر نیزوں پر بلند پہنچے اور قاتلان حسینؑ اور دشمنان اہل بیتؑ کی عورتوں کو یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ یہ رسول ﷺ کی نواسیاں قید ہو کر آئی

ہیں۔اور خاندان رسول کے سر قلم ہوئے ہیں تو وہ سر و سینہ پیٹتی ہوئی گلیوں میں نکل پڑیں۔" (خواتین کربلا کلام انیس کے آئینے میں صفحہ۔۱۹)

یزید نے اس ڈر سے کہ امام حسینؑ زندہ جاوید ہوگئے۔آل محمد ﷺ کو دمشق سے مدینہ واپس کر دیا کہ کہیں عوام اس غم کو نہ اپنالیں۔اہل حرم نے یہاں بھی ماتم کیا۔منہ پر طمانچے مارے۔اور گریبان چاک کئے خاک پر بھی بیٹھے اور پالان شتر پر بھی مرثیے پڑھے کوچہ و بازار میں نام حسینؑ کے نعرے لگوائے (آج تک حسین حسینؑ کی صدائیں بلند ہوتی رہتی ہیں) مکہ و مدینہ، کوفہ و بصرہ، مصر و دمشق ہر جگہ ماتم حسین تھا)

اس کے علاوہ ام البنین والدہ حضرت عباسؑ کا یہ عالم تھا کہ بقیع میں چلی جایا کرتی تھیں اور وہاں کربلا والوں کی یاد میں خود روتیں اور سننے والے لوگوں کے مجمع کو رلایا کرتی تھیں۔قبرستان بقیع گویا سوگواران آل محمد ﷺ کا امام باڑہ تھا۔یہیں حضرت فاطمہ زہراؑ اپنے والد کا ماتم کر چکی تھیں۔اور اب امام حسینؑ کی یاد میں ماتمی مرد و زن یہاں آتے تھے۔ (ایضاً)

رسم ماتم کے سلسلے میں خطیب اہل بیت مولانا سید عباس رضوی اپنی کتاب "اسلام اور تعزیہ داری" میں جواز ماتم پر استدلال کرتے ہیں کہ جب حضرت اویس قرنی نے سنا کہ سرکار ﷺ کے دندان مبارک ایک جنگ میں شہید ہوگئے تو فرط عشق و محبت سے بدحواس ہو کر پتھر سے اپنے بتیس دانت توڑ دیئے۔" لیکن اویسؓ کے اس عمل پر نہ سرکار ﷺ نے اعتراض کیا اور نہ کسی صحابی نے حرف زنی کی ۲(۲صفحہ ۶۸۔۶۷) شیعہ بھی اسی طرح عشق حسینؑ میں بدحواس ہو کر ماتم کرتے ہیں۔

جب کوئی مذہبی عقیدہ سماجی رسم کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو اس کی ادائیگی میں بھی علاقائی، نسلی یا جغرافیائی اعتبار سے فرق پیدا ہوجاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ تمام دنیا کے شیعوں میں ماتم کے مختلف طریقے پائے جاتے ہیں۔مثلاً صرف ایک ہاتھ سے ماتم کرنا۔یا پھر دوہتھا ماتم ایک ہاتھ سے ماتم یا تو کھڑے رہ کر سادہ طریقہ پر کیا جاتا ہے یا پھر حلقہ بنا کر نوحہ خوانوں کی آواز کی لے کے ساتھ بوشہری ماتم ہوتا ہے۔حلقہ کا ماتم اپنا جگہ کھڑے رہ کر بھی کیا جاتا ہے اور گھوم گھوم کر بھی دوہتھا ماتم کے بھی دو طریقے ہیں۔یعنی دونوں ہاتھ باری باری سینے پر مارے جاتے ہیں۔یا

پھر ایک مرتبہ دونوں ہاتھ ایک ساتھ سینہ کے دائیں طرف پھر بائیں طرف۔ تین ہاتھ کے ماتم میں ایک ہاتھ تین مرتبہ سینہ پر مارا جاتا ہے پھر کچھ وقفہ کے بعد نوحے کی لے کے ساتھ یہی عمل دہرایا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ آگ پر بھی ماتم کیا جاتا ہے۔ یعنی راستے پر دہکتے ہوئے کوئلے بچھا دیتے ہیں یا الاؤ کھود کر اس میں شعلے بلند کئے جاتے ہیں یا انگارے بچھائے جاتے ہیں اور ماتمی دستے ان انگاروں پر ماتم کرتے ہوئے دھیرے دھیرے آگے بڑھتے ہیں

ایک اور ماتم قمع کا ماتم کہلاتا ہے۔ جس کا رواج عام طور پر ایرانیوں میں پایا جاتا ہے ہندوستانی شیعہ بھی ایسا ماتم کرتے ہیں قمع ایک قسم کی چھری ہوتی ہے جو پیشانی سے کچھ اوپر سجدے کے نشان پر پرے بیچ سر میں کھڑی لگائی جاتی ہے۔ ماتم کرنے والا اسی مخصوص جگہ پر بار بار قمع مارتا ہے۔ یہاں تک کہ خون میں نہا جاتا ہے۔

زنجیر سے ماتم کا رواج بھی ہندوستان کے تمام شہروں میں عام ہے۔ باریک باریک زنجیروں میں تیز دھار کی چھوٹی پتلی سی چھریاں جڑی ہوتی ہیں اور ان تمام چھریوں کی زنجیروں کو یکجا کر کے لکڑی کے ایک دستے میں جوڑ دیا جاتا ہے اور پھر اس دستے کو ہاتھ میں پکڑ کر پشت پر مارتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے زخم پست پر آتے ہیں۔ غرض مختلف طریقوں سے شیعہ ماتم کرتے ہیں۔

۶۔ عَلم و مشک

علم، لواء اور رایت سب کے تقریباً ایک ہی معنی ہیں جسے فارسی میں نشان اور اردو میں جھنڈا کہتے ہیں بعض اوقات لواء رایت سے چھوٹا بنایا جاتا تھا۔ یا لواء کا نام اس وقت رایت رکھا جاتا تھا جب کسی جنگ کے کئے باہر نکالا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ آج کی اصطلاح میں اس کے لیے بند اور بیرق کے الفاظ بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس کا رواج بہت قدیم زمانے سے پایا جاتا ہے کہا جاتا ہے کہ پہلی لڑائی بنی آدم میں شیث اور قابیل کے درمیان ہوئی۔ اس لیے کہ قابیل نے ہابیل کو حسد سے ناحق قتل کر دیا تھا۔ وقت جنگ حضرت شیث خدا کا بھیجا ہوا ہدیہ سیاہ لباس پہنے

ہوئے تھے۔ اور ملائکہ سفید علم اٹھائے ہوئے تھے۔ آخر ملائکہ نے قابیل کو قید کیا اور عین شمس میں پہنچا دیا۔ وہیں وہ مر گیا۔ اور اس کی اولاد شیث کی غلام قرار پائی (مناقب)

(بحوالہ اصلاح۔ ا ماہ محرم ۱۳۴۷ھ جلد ۳۲)

تواریخ سے پتا چلتا ہے کہ مصر کے قدیم باشندے اور ان کی معاصرین سلطنتوں میں اس کا وجود پایا جاتا تھا۔ ایک حدیث میں ہے کہ سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ نے علم کی بنیاد ڈالی تھی۔

عہد جاہلیت میں عرب قبائل بھی اپنا اپنا جھنڈا رکھتے تھے جس کے نیچے جنگ کے موقع پر لوگ جمع ہو جایا کرتے تھے ایام جاہلیت میں قریش کے درمیان علم برداری کا عہدہ ہوا کرتا تھا۔ جس کو وہ "منصب اللواء" کہا کرتے تھے۔ ان دنوں ان کے علم کا نام عقاب تھا۔ جو غالباً رومیوں میں ماخوذ تھا جب یہ لوگ جنگ کے لیے نکلتے تھے تو پہلے علم نکالتے تھے پھر جس کا انتخاب ہو جاتا تھا اس کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ ورنہ اس کے متولی کے پاس رہتا تھا کبھی یہ بنو امیہ کے پاس رہتا تھا۔ اور کبھی عبدالدار کی تحویل میں آ جاتا تھا۔ سیرۃ الحلبیہ میں لکھا ہے کہ غزوۂ بدر کبریٰ میں مسلمانوں کے پاس تین جھنڈے تھے۔ ایک سفید جو آنحضرتؐ نے مصعب ابن عمیر کو دیا تھا۔ اور دوسرے دو سیاہ تھے۔ جن میں سے ایک حضرت علیؑ کو عطا ہوا تھا۔ جس کا نام عقاب تھا۔ وہ حضرت عائشہ کی سیاہ پشمینہ کی چادر سے بنایا گیا تھا۔ اور تیسرا علم ایک انصاری کو دیا گیا تھا۔ مسلمانوں کی فتح کے بعد مختلف شکلوں اور رنگوں کے جھنڈے بنائے گئے۔

آنحضرتؐ کا جھنڈا سیاہ تھا۔ لیکن کتاب آثار الاوّل کا مصنف سفید بتاتا ہے۔ بنی امیہ کا جھنڈا سرخ ہوتا تھا۔ عباسیوں کا سیاہ۔

(۲ بحوالہ تاریخ تمدن اسلام حصہ اوّل صفحہ ۲۰۳ تا ۲۰۵)

زمانہ قدیم میں علم کا منصب بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ اور علم دار کو بڑی عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ لہٰذا اس منصب کی حصولی کے لیے بڑی رسہ کشی ہوتی تھی۔ ملائکہ آسمان سے علم لے کر آئے۔ پھر حضرت ابراہیمؑ نے علم دار کا منصب سنبھالا۔ پھر قریش میں علمداری آئی اور قصی بن کلاب علمدار رہے۔ پھر یہ سلسلہ عبدالمطلب تک پہنچا اور اس کے بعد زمانہ رسالت میں علمداری بنی ہاشم سے مخصوص ہو گئی۔ اور علم اسلام امیر المومنین حضرت علیؑ کو عطا ہوا۔ جسے

رسول ﷺ خدا نے مصعب ابن عمیر سے لے کر عطا کیا۔ صاحب تفسیر قشیری کے مطابق حضرت علیؑ کے ہاتھوں کے مجروح ہونے کی وجہ سے جب علم حضرت علیؑ کے ہاتھوں سے گرا تو مسلمان جمع ہو گئے۔ اور ارادہ کیا کہ علم کو خود اٹھا لیں۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا۔ اور کہا کہ علم علیؑ کے بائیں ہاتھ میں دو کہ یہی صاحب لواء ہے۔

جب آنحضرت ہجرت کر کے مدینہ میں تشریف لے گئے تو ۲ھ میں غزوہ ابوا پیش آیا۔ مورخ ابن خلدون لکھتا ہے کہ اس غزوہ میں حمزہ بن عبدالمطلب علمدار تھے۔ حمزہ کا علم اوّل علم ہے جو اسلام میں تیار کیا گیا۔

جنگ خیبر کے موقع پر مشہور روایت ہے کہ جب مسلمانوں کے قدم اکھڑنے لگے اور وہ میدان جنگ سے واپس ناکام لوٹے تو رسول اللہ ﷺ نے سب کو جمع کر کے فرمایا کہ "آج میں علم اس کو دوں گا جو کرار غیر فرار ہوگا۔" اور پھر یہ علم حضرت علیؑ کو دیا گیا۔ جو آشوب چشم کی وجہ سے اب تک جنگ میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔

اکثر جنگوں میں حضرت جعفر طیارؑ بھی اسلامی فوج کے علمبردار رہے۔ چونکہ ہر قوم میں علم کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ اور علمدار کا مارا جانا یا علم کا سرنگوں ہونا شکست کی علامت خیال کیا جاتا تھا۔ لہٰذا علمدار ہر ممکن طریقے سے اپنی آخری سانسوں تک علم کی حفاظت کرتا تھا۔ جنانچہ جنگ موتہ جعفر طیارؑ نے علم اسلامی کو سرنگوں ہونے سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ جب دوران جنگ ایک ظالم نے آپ کے ہاتھ پر تلوار ماری جس سے آپ علم کو تھامے ہوئے تھے تو آپ نے بائیں ہاتھ میں علم لے لیا۔ اور جب بائیں ہاتھ پر بھی تلوار کا وار کیا گیا تو فوراً سینے سے لگا لیا۔ تاکہ گرنے نہ پائے۔ یہی واقعہ حضرت عباسؑ کے ساتھ پیش آیا۔ مروی ہے کہ میدان کربلا میں جب صبح عاشورہ محرم طلوع ہوئی۔ نماز صبح کے بعد امام حسینؑ اپنی فوج قلیل ترتیب دینے لگے۔ حضرت نے زہیر ابن قین کو میمنۂ لشکر پر معین کیا۔ اور حبیب ابن مظاہر کو میسرۂ لشکر پر قرار جناب عباسؑ نے علم حسینی کی ایسی حفاظت کی کہ تا قیامت یادگار علم قائم ہو گئی۔ اور علمدار حسینی کا لقب ان کے لیے مخصوص ہو گیا۔

مولانا عباس رضوی لکھتے ہیں۔

"یہی علم دین امام حسین کربلا میں یزیدی بے دینوں کے سامنے لے کر آئے تھے۔ جسے سرنگوں کرنے کی پوری پوری کوشش کی گئی۔ مگر امام حسین کے بھائی جناب عباس نے اپنے ہاتھ اور سر کٹا کر بھی اس علم کو اونچا ہی رکھا۔ علم جو تعزیہ خانوں میں نظر آتے ہیں اسی علم کی مبارک یادگار ہیں ہوا خواہان یزید نے ایک علم کو نیچا کرنے کی کوشش کی تھی مگر اللہ نے کروڑوں علم بلند کروا دیئے۔ ان علموں سے انسان کو حق پرستی۔ فرض شناسی عزت دین۔ صدق و صفا' اللہ کے نام کو اونچا رکھنے کے لیے جان دینے کے سبق ملتے ہیں۔"

شیعہ حضرت عباسؑ کی یاد میں علم نکالتے ہیں۔ تاکہ حق کی فتح و نصرت کا اظہار ہو سکے۔ اور دنیا جان سکے کہ یزید کی تمام تر کوششوں کے باوجود رسول ﷺ عربی کی تعلیمات کا علم اونچا ہی رہا ہے۔ اور تا قیامت بلند رہے گا۔

علم کے علاوہ محرم کی آٹھویں شب کو جلوس کی شکل میں چھوٹے چھوٹے بچے مشکیزہ لے کر نکلتے ہیں یہ دراصل اس واقعہ کی یادگار ہے جب ساتویں محرم سے امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں پر پانی بند کر دیا گیا اور بڑے تو بڑے چھوٹے چھوٹے معصوم بچے پیاس سے جاں بلب ہو کر تڑپنے لگے۔ جب تشنگی ناقابل برداشت ہو گئی تو یہ خیام حسینی کے تمام بچے چھوٹے چھوٹے مشکیزے اور کوزے لے کر نکل پڑے۔ اور ان کی سوکھی زبانوں پر "العطش العطش" کے نعرے تھے۔ حضرت عباس سے بچوں کی یہ حالت دیکھی نہ گئی۔ اور انہوں نے فوراً پانی لانے کے لیے دریا کی طرف جانے کی اجازت طلب کی۔ دراصل وہ جنگ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن امام حسینؑ نے انہیں جنگ کی اجازت نہ دی۔ صرف پانی لانے کی اجازت دی۔ وہ پانی تو نہ لا سکے۔ البتہ پانی سے بھرے ہوئے مشکیزے کو بچانے اور خیال حسینی تک پہنچانے کی کوشش میں ان کے دونوں بازو قلم ہو گئے۔ سینہ چھلنی ہو گیا۔ مشکیزے کا پانی بہہ گیا۔ علمدار حسینی گھوڑے سے گرا اور تپتی ہوئی ریت پر دم توڑ دیا۔

۷۔ ذوالجناح

ذوالجناح امام حسینؑ کے گھوڑے کا نام ہے۔ جس پر بیٹھ کر انہوں نے میدان کربلا میں

باطل کے مقابلے پر حق کی فتح حاصل کی تھی۔شیعوں کے ہاں اس گھوڑے کو بھی احترام اور محبت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔اور یہ جائے تعجب نہیں۔اس لیے کہ قرآن وتواریخ دونوں گواہ ہیں کہ دنیا میں بعض جانور ایسے بھی گذرے ہیں جو اپنی کسی خاص خوبی کے باعث احترام وتوجہ کے مستحق سمجھے گئے۔مثلاً اصحاب کہف کے کتے کا ذکر قرآن مجید میں خود موجود ہے۔اور وہ بھی ان ہی امتیازی خصوصیتوں میں شریک کیا گیا ہے۔جو اصحاب کہف کے لیے حاصل ہیں۔اس طرح خرِ عیسیٰ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ایک مدت تک عیسائی گرجاؤں میں اس قسم کے خر کی تعظیم ہوتی رہی جو حضرت عیسیٰ کی سواری کا کام دیتا تھا۔ہندوؤں میں رام کے بھگت ہنومان کی پوجا بے حد احترام سے کی جاتی ہے۔جبکہ وہ ایک بندر کی نسل سے تھا۔اسلام میں اس دنبہ کی یادگار قائم کی گئی جو حضرت ابراہیم کے پاس ان کے فرزند اسمٰعیل کے فدیہ میں قربانی کے لیے آیا تھا۔اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بقرعید میں قربانی کا حکم دے کر اس کی شبیہہ بنانے کا قانون جاری کر دیا گیا۔مسلمانوں کے سوادِ اعظم نے اس اونٹ اور محمل کی یادگار قائم کی جس پر ام المومنین حضرت عائشہ سوار ہوئی تھیں۔اور اب تک مصر سے مکہ معظمہ بہ تزک واحتشام بھیجی جاتی ہے۔

ساتویں محرم سے دس محرم تک جب خیام حسینی میں پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔اور چھوٹے چھوٹے بچے تک پیاس سے جاں بہ لب تھے۔یہ گھوڑا بھوکا پیاسا لاشوں کو اٹھانے‘ میدان جنگ جانے اور خیمے تک لانے میں امام کا ساتھ دیتا رہا۔پھر سب سے آخر میں جب امام حسینؑ اکیلے میدان کربلا میں جنگ کے لیے آئے۔اور تاریخ کی بے مثال لڑائی شروع ہوئی۔اس وقت بھی یزیدی فوج کے مقابلے پر یہی گھوڑا امام حسینؑ کے ساتھ تھا۔اور تیروں‘ تلواروں اور نیزوں کی بارش میں امام کے ساتھ ساتھ زخم پر زخم کھاتا رہا۔اس ہنگامۂ دار و گیر میں امام حسین جب قریب نہر آئے اور گھوڑے کو نہر میں ڈال کر پانی پینے کے لیے کہا تو اس وفادار نے منہ پھیر لیا۔اور پانی پینے سے یہ سوچ کر انکار کر دیا کہ جب میرا آقا پیاسا ہے تو میں کیسے سیراب ہو جاؤں۔اور اس وقت بھی جب وقت عصر آ گیا اور زخموں کی وجہ سے امام عالی مقام میں اتنی تاب بھی نہ تھی کہ گھوڑے سے اتر سکتے۔گھوڑے نے آہستہ سے اپنے مالک کو پشت سے نیچے اتار دیا تاکہ نماز عصر ادا کی جا سکے۔اور سب سے آخری منزل پر جب امام حسینؑ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو گھوڑے نے وہ کام کیا جو

انسانوں سے بھی نہ ہو سکا۔یعنی شہادت سے قبل امام حسینؑ نے اپنے وفادار عزیز واقربا کو آواز دے کر کہا تھا" ہے کوئی جو میری مدد کو آئے۔امام حسینؑ اپنے ناصر کو تلاش کر رہے تھے اور بعد شہادت ذوالجناح نے ثابت کر دیا کہ امام حسینؑ کا ایک ناصر اب بھی باقی ہے خون حسینؑ میں تر بتر اس معصوم نے اپنے فرض کو یاد رکھا۔اور بے بس ومظلوم اہل حرم تک اس جانکاہ خبر کو پہنچانے کا کام اس طرح انجام دیا کہ اپنی پیشانی اپنے آقا کے خون میں تر کی اور سید ھا در خیمہ پر جا کر ہنہنایا۔منتظر سیدانیوں نے گھوڑے کی آواز سنی تو گھبرا کر دروازے پر آ گئیں۔بقول مولانا سید علی نقی "اس کا خالی زین‘ اس کی رنگین پیشانی‘ اس کی کٹی ہوئی باگیں‘ اس کا زخمی جسم‘ اس کے جسم میں پیوست تیر وہ سب کچھ کہہ رہے تھے۔جس کی خبر دینے وہ دروازے پر آیا تھا۔"

شاید اسی آخری خدمت‘ فرض شناسی اور وفاداری کی وجہ سے اپنے آقا کے ساتھ ساتھ ذوالجناح نے بھی ابدی زندگی پالی۔شیعہ اسی وفادار خدمت گار حسین کی یاد میں ذوالجناح کی شبیہہ نکالتے ہیں۔ایک گھوڑے کو باقاعدہ فوجی اسلحہ جات سے مسلح کیا جاتا ہے۔اور اس کی جھول پر سرخ رنگ کے دھبے ہوتے ہیں۔جو اس گھوڑے کی یاد تازہ کرتے ہیں۔جو حضرت امام حسینؑ کے بعد میدان کربلا سے تنہا واپس ہوا تھا۔اکثر جگہ تو اس کام کے لیے ایک مخصوص گھوڑا سال بھر کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔اس سے اور کوئی کام نہیں لیا جاتا۔

۸۔ تابوت اور ضریح

تابوت حقیقتاً لکڑی کا وہ ڈھانچہ ہوتا ہے جس کے اندر مردے کو غسل وکفن کے بعد قبرستان لے جایا جاتا ہے۔شیعوں کا عقیدہ ہے کہ چونکہ وہ جناب امام حسینؑ کی تدفین میں شریک نہیں ہو سکے اور نہ ہی بنوامیہ نے انہیں اس کا موقعہ دیا۔لہٰذا وہ بڑی عزت واحترام کے ساتھ تابوت اٹھاتے ہیں۔

ضریح : دراصل روضۂ اقدس کے اس حصہ کی شکل کو کہتے ہیں جن پر دو قبریں بنی رہتی ہیں ضریح اور تعزیہ میں فرق صرف اتنا ہے کہ ضریح روضہ کے آدھے حصہ کی شبیہہ ہوتی ہے اور تعزیہ پورے حصے کی۔ضریح میں گنبد اور مینارے عموماً نہیں ہوتے ہیں۔مگر اسے بھی تعزیہ ہی کی

طرح رکھا جاتا ہے۔

۹۔ مہندی، گھوارا، طوق، بیڑی، چھڑ، وغیرہ

مہندی :

مہندی کی شکل بالکل کشتی نما ہوتی ہے اور یہ ساتویں محرم کو جلوس کی شکل میں نکالی جاتی ہے یہ حضرت قاسم اور جناب کبریٰ کی شادی کی یادگار ہے اور اسی یادگار کے طور پر منائی جاتی ہے۔ روایت ہے کہ ساتویں محرم کو امام حسنؑ کے صاحبزادے حضرت قاسم اور امام حسینؑ کی صاحبزادی، فاطمہ کبریٰ کا عقد امام حسنؑ کی وصیت کے مطابق ہوا تھا۔ اس کے بعد دولہن کو چھوڑ کر جناب قاسم میدان جنگ میں تشریف لے گئے اور شہید ہو گئے۔ اسی شادی کی یادگار کے طور پر مہندی کا جلوس نکالا جاتا ہے۔ ایک کشتی میں تمام قسم کے پھل اور مہندی سجائی جاتی ہے۔ اور اس کا گشت کروایا جاتا ہے۔

گھوارہ :

گھوارہ اس پالنے کی شبیہہ کو کہتے ہیں جس میں امام حسینؑ کے شیر خوار بیٹے حضرت علی اصغر لیٹے تھے۔ جب امام حسینؑ نے عصر کے وقت تنہائی کے عالم میں میدان کربلا کے فراز سے "ھل من ناصر" کی صدا بلند کی تھی۔ تو اس وقت فوج حسینی میں کوئی سپاہی بچا نہ تھا۔ جو ان کی مدد کو آ سکتا۔ البتہ اس صدا کو سن کر معصوم شیر خوار نے اپنے آپ کو گھوارے سے گرا دیا تھا۔ یہ گویا اذن جہاد طلب کرنے کا اشارہ تھا۔ آخر میں (اتمام حُجت کی خاطر امام حسینؑ اس پیاسے ششماہے کو میدان جنگ میں لے گئے۔ لیکن بے رحم اشقیاء نے اس کے گلوئے مبارک کو تیروں کا نشانہ بنا دیا۔ اور بچہ امام حسینؑ کے شانوں پر مسکرا کے خوں اگلتے ہوئے شہید ہو گیا۔ گھوارہ اسی معصوم مجاہد کی یادگار ہے۔ جو جلوس کی شکل میں نکالا جاتا ہے۔

طوق :

جناب زین العابدین کی گردن میں جو اس وقت بیمار ہونے کی وجہ سے جنگ میں شرکت

نہ کر سکے تھے۔ بعد شہادت امام حسین عالم اسیری میں آزار پہنچانے کی غرض سے جو بھاری طوق پہنایا گیا تھا یہ اسی کی یادگار ہے۔ یہ لوہے کا خاردار حلقہ تھا۔ جو بیمار کربلا کی گردن میں ڈالا گیا تھا۔

اسی طرح ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں تھیں۔ اور ان تمام کو ایک ہی زنجیر سے باندھ دیا گیا تھا۔ شیعہ اسی جانکاہ یاد میں اپنے بچوں کو منت کے طور پر طوق یا بیڑی پہناتے ہیں۔ جناب سکینہ کی ہنسلی کی یاد میں بچوں کو منت کی ہنسلی بھی پہنائی جاتی ہے۔

۱۰۔ سبیلیں لگانا

شیعہ عام طور محرم میں سبیلیں لگاتے ہیں۔ اور کورے مٹکوں میں پانی بھر کر پیاسے راہگیروں کی پیاس بجھاتے ہیں جو کسی کار ثواب سے کم نہیں۔ کیونکہ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ انسانی حیات کا دارومدار پانی ہی پر ہے۔ بلکہ ساری کائنات کی بقا پانی ہی پر ہے بقول مولانا سید قائم مہدی" دریائے آسمانی کا کشادہ کرنے والا پانی ہے۔ موتی کی آب زیادہ کرنے والا پانی ہے۔ سبزہ کو بالیدہ کرنے والا پانی ہے اثمار کو پختہ کرنے والا پانی ہے۔ دانہ کو شجر بنانے والا پانی ہے۔ زراعت کو سرسبز کرنے والا پانی ہے ..... بہرحال مدار حیات نباتات وحیوانات اور لذت حیات پانی ہے۔ جیسا کہ خداوند کریم عالم ارشاد فرماتا ہے۔ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيّ (ہم نے ہر زندہ شئے کا مادہ حیات پانی کو قرار دیا۔ (سرفراز محرم نمبر لکھنؤ۔ ۱۳۶۵ھ صفحہ ۶۵)

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو کسی مسلمان کو پانی پلائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو جنت کی شراب پلائے گا۔ (بخاری مسلم۔ ترمذی وغیرہ)

حضرت سعدؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھ کو پانی کا صدقہ پسند ہے۔ حضرت محمد بن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضرت سعد نے سرکار رسالت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ میری والدہ کا انتقال ہو گیا۔ تو کون سا صدقہ افضل ہے۔ حضور انور نے فرمایا کہ پانی کا صدقہ افضل ہے۔ سعدؓ نے کنواں بنوایا اور کہا کہ سعد کی والدہ کے لیے ایصال ثواب ہو۔ (ابو داؤد ونسائی شریف)

صحیح بخاری پ ۹ صفحہ ۴۵۳ پر ہے کہ حضرت رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ ایک دفعہ کوئی

شخص کہیں جارہا تھا۔اس پر پیاس کا غلبہ ہوا۔وہ ایک کنوئیں میں اترا اور اس سے پانی پی کر باہر نکل
آیا تو دیکھا کہ ایک کتا زبان منہ سے باہر نکالے ہے۔ پیاس کی مصیبت سے وہ مٹی چاٹ رہا تھا۔
اس شخص نے کہا پیاس سے اس بیچارے کی جان پر منہ پر آگئی ہے جس طرح میری جان نکل رہی
تھی۔ یہ سوچ کر وہ پھر کنویں میں اترا۔اور اپنے موزے میں پانی بھر لیا۔ پھر اس کو پکڑ کر باہر نکل
آیا۔اور کتے کو پلا دیا۔اس کے اس احسان کے عوض خدا اس کا شکر گزار ہوا۔اور اس کو بخش دیا اس
پر لوگوں نے کہا۔اے رسول خداﷺ کیا جانوروں کے پانی پلا دینے میں بھی ہم لوگوں کو ثواب
ملے گا۔حضرت نے فرمایا جس کا بھی جلتا ہوا جگر ٹھنڈا کیا جائے گا اس کا ثواب اس کو ضرور ملے گا۔
امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے ''بہترین صدقات و خیرات اس جگر کا سرد کرنا ہے جو پیاس کی
شدت سے جلا جاتا ہو''

امام حسینؑ نے فرمایا تھا ''اے میرے شیعو! جب پانی پینا تو میری یاد کر لینا۔'' شیعہ
اپنے اسی پیاسے امام کی یاد میں سبیلیں لگاتے اور پیاسوں کو پانی پلاتے ہیں جو میدان کربلا میں
پیاسا شہید ہو گیا۔اور اس کام میں مسلمانوں کے دیگر فرقے بھی شیعوں کا ساتھ دیتے ہیں۔

۱۱۔ نذر و نیاز

چونکہ امام حسینؑ اور ان کے ساتھی بھوکے پیاسے شہید ہو گئے۔اس کے بعد ان کے
اعزاء و اقرباء بچوں اور عورتوں کو جو خود بھی بھوکے پیاسے تھے۔اشقیاء نے بے حد ستایا۔لہٰذا شیعہ
ان تمام کی یاد میں نذر و نیاز کرتے ہیں۔تا کہ ان کی ارواح مقدسہ کو اس کا ثواب پہنچے۔اور یہ ہدیہ
بارگاہِ امام میں قبول ہو۔یہ نذر و نیاز کھانے کی صورت میں بھی ہو سکتی ہے۔مٹھائیوں یا پھلوں کی
صورت میں بھی یہ صرف شربت کے طور پر اور شیعہ اس کا ثواب بے حد خیال کرتے ہیں۔
حضرت عبداللہ انصاری سے مروی ہے کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا کہ جو شخص کسی کو پانی
پلائے گا۔وہ گناہوں سے ایسا پاک ہو جائے گا جیسے اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا۔اور جو شخص
شربت پلائے گا تو اللہ تعالیٰ ہزار حاجتیں اس کی پوری کرے گا۔اور جنت میں داخل کرے گا۔اگر
وہ شخص اس روز مرے گا تو شہید کا درجہ پائے گا۔

مجمع الروایات میں ہے۔
''کوئی شخص اپنی ملک سے طعام پکا کر کھلائے گا تو بے شبہ حلال ہے۔اس
واسطے کہ بروج حمزہؑ ان کی شہادت کے تیسرے دن، دسویں دن، بیسویں دن،
چالیسویں دن و سہ ماہی، ششماہی کا فاتحہ کر کے رسول اللہﷺ نے تقسیم
کروایا۔''
شیعہ بھی ان ہی تاریخوں میں بعد شہادت حسینؑ نذر و نیاز کرتے ہیں۔ بلکہ یہ سلسلہ
سال بھر چلتا رہتا ہے۔اور ہر مجلس کے بعد نذر تقسیم کرنا تو ایک عام رواج ہے۔

۱۲۔ جنگی باجے

فوجوں میں موسیقی کا رواج قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس
زمانہ میں سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ خفیہ طور پر یا تار برقی کے ذریعہ سپاہیوں کو حالات
جنگ سے مطلع کیا جاسکتا۔دوسرے یہ کہ اس زمانہ کی جنگ باقاعدہ بالا علان ہوا کرتی تھی اور
اعلان جنگ کا طریقہ ہی یہ تھا کہ طبل و دہل کے ذریعے سپاہیوں کو مطلع کیا جاتا تھا کہ جنگ کا آغاز
ہو رہا ہے میدان کربلا میں بھی دشمن کی جانب سے بار بار اعلان جنگ ہوا۔اور ان آوازوں پر امام
حسینؑ کے بہادر سپاہی (ساتھی) یکے بعد دیگرے میدان جنگ میں جا کر دشمنوں کو للکارتے
رہے۔لہٰذا جب جلوس عزا نکالا جاتا ہے تو اس وقت کا منظر یاد کرنے کی غرض سے جنگی باجوں کا
استعمال بھی کیا جاتا ہے۔لیکن عام طور پر یہ شیعہ حضرات کم کرتے ہیں اگر ان باجوں کا استعمال ہوتا
بھی ہے تو تعزیتی موسیقی کی حیثیت سے نہ کہ دھوم دھام پیدا کرنے کی غرض سے۔

۱۳۔ عزا خانے، امام باڑے اور کربلائیں

چونکہ عزاداری شیعوں کی زندگی کا اہم جزو ہے۔لہٰذا مشکل ہی سے کسی شیعہ کا گھر ایسا
ہو گا جہاں ایک چھوٹا موٹا عزا خانہ موجود نہ ہو۔اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ شروع سے ہی شیعہ قوم پر
حکومت وقت کی جانب سے عزاداری حسینؑ کے سلسلے میں تنی پابندی لگا دی گئیں اور وہ ظلم و ستم کئے

گئے کہ وہ خاموش اور چپکے چپکے غم حسینؑ منانے پر مجبور ہو گئے۔ حکومت کے ظلم وتشدد کے خوف سے یہ لوگ اکثر اپنے گھروں میں خاموشی سے عزاداری کرتے تھے۔ اس لیے ان کے گھروں میں چھوٹے چھوٹے عزا خانے آباد تھے۔ اور یہ رسم آج تک شیعوں میں چلی آرہی ہے۔ ان عزا خانوں میں چھوٹے چھوٹے عزا خانے آباد تھے۔ اور یہ رسم آج تک شیعوں میں چلی آرہی ہے ان عزا خانوں میں چھوٹے چھوٹے علم سجا دیئے جاتے ہیں ان پر پنجے لگائے جاتے ہیں۔ اور ان عزا خانوں کے سامنے مجلسیں منعقد ہوتی ہیں۔ ماتم کیا جاتا ہے۔

جب وقت کے ساتھ ساتھ حکومتیں بدلیں۔ اور شیعوں نے ظلم وستم سے چھٹکارا پا کر اطمینان کا سانس لیا۔ انہیں مذہبی آزادی حاصل ہوئی۔ وہ کھلے طور پر عزاداری کرنے لگے۔ اجتماعی مجلسیں منعقد ہونے لگیں۔ لہٰذا ان چھوٹے چھوٹے عزا خانوں کے علاوہ بڑے بڑے امام باڑوں کی تعمیر عمل میں آئی۔ جہاں اجتماعی طور پر ماتم کیا جاتا تھا۔ اور غم حسینؑ منایا جاتا تھا شیعہ حکومتوں نے ان امام باڑوں کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور خاص طور پر ہندوستان میں ایسے بے شمار امام باڑے تعمیر ہو گئے۔ جو راجوں اور مہاراجوں' نوابوں' امیروں' وزیروں اور جاگیر داروں کے تعمیر کردہ تھے۔ آج تک ان امام باڑوں میں ایام عزا میں مجلیس منعقد کی جاتی ہیں۔

ان امام باڑوں کے علاوہ کربلائیں بھی تعمیر ہوئیں۔ کیونکہ ہر شیعہ کے دل میں زیارت کربلائے معلیٰ کی خواہش پیدا ہوتی تھی۔ لیکن ہزاروں میل دور پہنچنا بہت مشکل تھا۔ لہٰذا اس خواہش کی تسلی کربلاؤں کی تعمیر سے ہو جاتی تھی۔ یہ کربلائیں دراصل سرزمین کربلائے معلیٰ میں روضۂ حسینؑ و دیگر شہدائے کربلا کے روضہ جات کی نقل ہیں۔ سرزمین کربلا جیسے ارض نینوا' حاضریہ' حاریہ کوادیس عمورا شط فرات' شاطی الرات طف' طف الفرات' حائر' حیر' مشہد الحسین' کرب وبلا اور کور بابل کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے تاریخ عالم میں ہمیشہ قابل ذکر رہی ہے گو کہ ۶۱ھ سے قبل کربلا کی راضی نوعیت وہ نہیں تھی۔ جو اس کے بعد نظر آتی ہے۔ پھر بھی کھنڈروں کی کھدائی اور سنگی کتبوں کے پڑھنے سے (۱۸۶۲ء میں) پتہ چلا ہے کہ دجلہ وفرات کے مابین جو دوآبہ ہے پہلے پہل انسانی آبادی اسی جگہ عالم شہود میں آئی۔ اور اسی مرکز سے ایک طبقہ نے یورپ' ایک نے افریقہ' اور ایک نے ایران و ہندوستان آباد کیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اسی دوآبہ میں سومیرین حکومت

قائم ہوئی۔ اس کے بعد کلدانیوں کی شہنشائیت، اسپرین حکومت، میڈیسن کی حکمرانی اور بابل کی حکومت کا آغاز بھی اسی مرکز سے ہوا۔ یہیں ایرانی حکومت اور رومن حکومت نے اپنا جلوہ عروج دکھایا۔ تحقیق سے ثابت ہو گیا ہے کہ فرات ودجلہ کی سرزمین گونا گوں تغیرات، اقبال وزوال اور بعثت انبیاء ومرسل اور ان کے مصائب کا مرکز رہی ہے۔ لیکن اس سرزمین کو جو اہمیت حسین ابن علیؑ کی شہادت نے بخشی ہے وہ ساری دنیا میں ناقابل فراموش ہے۔

استاد عباس محمود العقاد لکھتے ہیں۔:

"ہمیں تو زمین کا کوئی حصہ ایسا نہیں معلوم ہوتا جس کا نام نوع انسانی کے جملہ فضائل ومناقب کے ساتھ وابستہ ہے۔ جس طرح حسین کی شہادت کے بعد کربلا کا نام فضائل انسانی سے وابستہ ہو گیا۔ ہر وہ ملکوتی صفت جس کی وجہ سے انسان، انسان ہے اور جس کے بغیر اس میں اور جانور میں کوئی فرق نہیں۔ وہ تمام صفتیں شہادت حسین کی بدولت زندہ ہیں اور سرزمین کربلا پر ان کا عملی ثبوت ملتا ہے۔ نوع انسانی کے جتنے بھی اعلیٰ اور روحانی صفات ہیں۔ ایمان، فداکاری، ایثار، بیداری ضمیر، حق کو بزرگ سمجھنا، احساس فرائض، مصیبتوں میں پامردی، ظلم وستم کے آگے سر نہ جھکانا۔ موت کا مردانہ وار مقابلہ کرنا اور اس قسم کے اعلیٰ صفات یہ سب کرلا میں جلوہ گر ہوئے جب سے کہ حسینی قافلہ یہاں آکر فروکش ہوا۔" (ابوالشہد اترجمہ مولوی محمد باقر النقوی مطبوعہ ۱۹۶۷ء صفحہ۔ ۱۲ سرفراز قومی پریس)

کربلا کے سوا کسی زمین پر بھی نہ یہ تمام روشن صفتیں اکٹھا ہوئیں اور نہ کسی اور موقع پر اس طرح تابندہ ہوئیں جس طرح حادثہ کربلا میں ہوئیں۔"

امام محمد باقرؑ سے روایت ہے کہ "خداوند عالم نے کعبہ کو خلق کرنے سے چوبیس ہزار برس پہلے سرزمین کربلا کو خلق کیا۔ اسے پاک وپاکیزہ اور بابرکت قرار دیا۔ اور یہ سرزمین خلائق کی پیدائش کے پہلے بھی مقدس ومبارک رہی اور قیامت تک رہے گی۔" (تاریخ کربلا معلیٰ و حائر الحسین از ڈاکٹر عبدالجواد کلیدار ترجمہ محمد باقی النقوی صفحہ۔ ۳۷۔ ۳۸)

امام جعفر صادقؑ اپنے آباء طاہرین کے واسطے سے روایت فرماتے ہیں کہ پیغمبر خداﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "میرا فرزند اس سرزمین پر مدفون ہوگا۔ جسے کربلا کہا جاتا ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جس میں قبہ واسلام تھا۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے طوفان نوحؑ سے ان مومنین کو نجات عنایت کی تھی۔ جو نوحؑ پر ایمان لائے تھے۔"۳ (کامل الزیارت صفحہ ۲۶۹)

لیکن امام حسینؑ کے بعد شہادت کربلا میں مدفون ہونے کی وجہ سے اموی حاکموں کی ساری تمنائیں خاک میں مل گئیں۔ لہٰذا انہوں نے اس کے مٹانے کی ہر ممکن کوشش شروع کردی۔ پہلے تو زیارت پر پابندیاں لگائی گئیں۔

چنانچہ ڈاکٹر جوآد لکھتے ہیں:

"اموی عہد حکومت میں کربلا کے چاروں طرف فوجی چوکیاں قائم تھیں۔ جہاں فوج کا دستہ ہر وقت ہتھیاروں سے لیس متعین رہتا تھا۔ تاکہ زائرین قبر حسینی تک نہ پہنچ سکیں۔ اگر کوئی شخص حکم کی حلاف ورزی کرتا تو اسے طرح طرح کی سزائیں دی جائیں۔ کبھی کبھی قتل بھی کردیا جاتا۔ بہت کڑی نگرانی کی جاتی تھی۔" لیکن "چوکیوں پر متعین سپاہی دور سے اس پر نظر جمائے رہتے اور جب رات تاریک ہوجاتی تو بہت سی پرچھائیاں اس زمین پر حرکت کرتی نظر آتیں۔ یہ زائرین کی پرچھائیاں ہوتیں۔ جو قریب و دور کے مقامات سے زیارت کو آتے۔"

اس دوران نہ جانے کتنے سر کٹے، کتنے ہاتھ پیر جسموں سے جدا ہوئے۔ کتنوں کو پھانسیاں دی گئیں۔ کتنوں کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندا گیا۔ پھر بھی زائرین کا تار نہ ٹوٹا تو اس روضہ کا نام ونشان ہی مٹا دینے پر کمر باندھ لی گئی۔ چنانچہ کوئی سات آٹھ مرتبہ اس روضہ کا نام و نشان ہی مٹایا گیا۔ اور پھر اس کی تعمیر ہوئی۔

چونکہ تاریخ کربلا ان انقلابات سے گزرتی رہی۔ تو زائرین کربلا کا کیا حال ہوا ہوگا۔ اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیعوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا ہوگا کہ اس روضہ کی شبیہ بنائی جائے۔ اور اس کی زیارت سے تسکین قلب حاصل کی جائے۔ یوں شیعوں نے جہاں

ان کی آبادیاں تھیں کربلائیں تعمیر کرنا شروع کیں۔

یہ کربلائیں ہو بہو کربلائے معلیٰ کا نقشہ ہوتی ہیں۔ شیعہ وہاں جا کر مجلیس کرتے ہیں۔ نوحہ و ماتم کرتے ہیں اور اکثر نوچندی جمعرات کو وہاں جا کر مرثیہ خوانی اور مجلیس وغیرہ ہوتی ہیں اردو شعراء نے ان امام باڑوں اور کربلاؤں کے متعلق بھی اشعار کہے ہیں۔

ج ۔ متفرق رسومات

مذکورہ بے شمار تہنیتی اور عزائی رسومات کے علاوہ عقائد کے زیر اثر بعض ایسی رسومات بھی شیعوں میں رواج پا گئی ہیں جنہیں یا تو عقائد کی توسیع کہا جاسکتا ہے یا سماجی عوامل کا اثر۔ بعض باتیں شیعوں کے ہاں روزمرہ افعال کی حیثیت رکھتی ہیں بعض مخصوص مواقع کی مرہون منت ہیں۔ ذیل میں ایسی ہی چند رسومات کا تذکرہ کیا جات ہے۔

۱ ۔ امام ضامن

تمام شیعوں میں یہ رسم ہے کہ جب گھر کا کوئی فرد کسی سفر پر روانہ ہوتا ہے تو گھر والے اس کے دائیں بازو پر درود پڑھ کر چند سکے کپڑے کی ایک کتر میں لپیٹ کر باندھتے ہیں اور اسے آٹھویں امام حضرت موسیٰ رضا کی ضمانت میں دیتے ہیں۔ شیعوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اس طرح سفر پر جانے والا بحفاظت اپنے سفر سے واپس آتا ہے۔ تو بازو پر بندھے ہوئے امام ضامن کو کھول کر پیسوں کی نیاز منگالی جاتی ہے اور امام موسیٰ رضا کی نذر دی جاتی ہے۔

مولوی سید احمد دہلوی اس رسم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"امام ضامن" حضرت امام علی رضا خلف حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا جو آٹھویں امام ہیں عرف ہے۔ آپ خلفائے عباسیہ میں سے مامون ابن ہارون رشید کے زمانے (۱۴۸ھ) میں پیدا ہوئے تھے۔ چونکہ آپ کے زمانہ میں خلفائے وقت نے کربلائے معلیٰ جانے کے واسطے سخت پابندی کردی تھی۔ پس آپ ان کے ضامن اور کفیل ہوجایا کرتے تھے۔ تاکہ زائرین زیارت سے محروم نہ رہیں۔" (رسوم دہلی صفحہ ۹۳)

بہر حال امام ضامن کے باندھنے کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ مسافر کا سفر خیریت اور حفاظت سے طے ہو جائے۔ اور جب وہ سفر طے ہوتا ہے تو وہ رقم غربائے سادات کو دی جاتی ہے۔ رخصت کرتے وقت یا امام ضامن باندھتے وقت اکثر عورتیں یہی کہتی ہیں کہ امام ضامن کی ضامنی میں سونپا۔ شیعوں میں امام ضامن منگنی یا شادی کے موقع پر بھی باندھا جاتا ہے یعنی دولھا اور دولھن کو رشتہ طے کرنے کے بعد آئندہ کی خوشگوار زندگی کے لیے امام ضامن کی ضمانت میں سونپا جاتا ہے۔

۲۔ کونڈے:

شیعوں کی ایک مخصوص نیاز، نیاز امام جعفر صادقؑ ہے۔ جسے کونڈوں کی رسم سے موسوم کیا جاتا ہے اور سنی بھی اس رسم میں برابر کا ساتھ دیتے ہیں۔ ماہ رجب میں کسی بھی دن امام جعفر صادقؑ کے نام پر نذر دی جاتی ہے۔ عام طور پر یہ نذر ۱۳ رجب، یا ۲۷ رجب کو دی جاتی ہے۔ یہ نذر عام طور پر کھیر اور پوریوں پر دی جاتی ہے۔ لیکن کبھی کبھار پھلوں اور مٹھائیوں پر بھی دی جاتی ہے۔ بہر حال میٹھی چیز پر نذر امام جعفر صادقؑ دی جاتی ہے۔ اس کا رواج کب سے ہوا اور کیوں؟ اس کے متعلق کوئی مصدقہ روایت کہیں بھی نہیں ملتی لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اس نذر کا مقصد امام کی خوشنودی اور منتوں کی برآوری ہے۔ کیونکہ یہ منت اکثر کونڈے پر بیٹھ کر مانی جاتی ہے کہ اگر امام کے صدقے میں ہماری مراد بر آئی تو ہم بھی آئندہ سال ان کے نام سے کونڈے بھریں گے۔

امام جعفر صادقؑ کے علاوہ حضرت عباس اور بارھویں امام کے نام کے بھی کونڈے بھرے جاتے ہیں بارھویں امام کے کونڈے ۱۵ ر شعبان کی صبح میں بھرے جاتے ہیں۔ حضرت عباس کے کونڈے کسی وقت بھی منت کی برآوری پر بھرے جاسکتے ہیں۔ یعنی ان کے نام کی نذر دی جاتی ہے۔

۳۔ طاق بھرنا:

کونڈوں ہی کی طرح طاق بھرنے کی رسم بھی جاتی ہے لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ کونڈے گھر میں بھرے جاتے ہیں۔ اور طاق مسجدوں، امام باڑوں اور کربلاؤں میں جا کر وہاں

کے طاقوں میں نیاز کی پیالیاں اور طشتریاں بھر کر نذر دلائی جاتی ہے۔

٤۔ بی بی کی صحنک:

بی بی کی صحنک عام طور پر ہندوستان میں رائج ہے۔ بقول سید احمد دہلوی ''صحنک عربی لفظ صحن کی تصغیر ہے۔ بمعنی طباق خورد یعنی رکابی، کونڈی وغیرہ اصطلاحی معنی حضرت فاطمہؓ کی فاتحہ۔ اور فاتحہ کا طباق یا کونڈہ۔''

صحنک حضرت فاطمہ کی نیاز سے مراد ہے یہ ویسے تو اہل سنت میں عام ہے۔ لیکن بعض علاقوں کے شیعہ خصوصاً دکن میں یہ رواج شیعوں میں بھی پایا جاتا ہے۔

سید احمد دہلوی نے اس کی ایجاد عہد جہانگیری میں جودھا بائی والدۂ شاہجہاں کے ہاتھوں بتائی ہے اور اس کی وجہ سے اس کی سوت نور جہاں کی حقیرانہ چھیڑ چھاڑ کو قرار دیا ہے۔ جس کے جواب میں نور جہاں کو نیچا دکھانے کی غرض سے جودھا بائی نے پکوان پکوایا۔ اور بادشاہ کی آنکھ لگائی بیوی نور جہاں کو یہ کہہ کر ذلیل کیا کہ یہ بی بی فاطمہ کی نیاز ہے۔ اور اس صحنک کو وہی بیوی کھا سکتی ہے جس نے دوسرا خاوند نہ کیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس نیاز کے کھانے والے کے لیے صرف پاکدامن اور پارسا عورتیں مخصوص کی جاتی ہیں۔ اور خاص کر سیدانیوں کا زیادہ حق سمجھا جاتا ہے۔

مولوی سید احمد کا یہ بیان صحیح نہیں مانا جاسکتا۔ بلکہ اس کے من گھڑت ہونے کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔ اول تو یہ کہ والدہ شاہجہاں راجپوت زادی ضرور تھی۔ مگر اس کا نام جودھا بائی نہیں تھا۔ جودھا بائی تو والدۂ جہانگیر (سلیم تھی۔ دوسرے یہ کہ مولوی صاحب کا نور جہاں کو'' آنکھ لگائی بیوی'' کہنا درست نہیں کیونکہ جہانگیر سے نور جہاں کی شادی ہونے میں نور جہاں کا کوئی قصور نہ تھا''۔ تاریخ گواہ ہے کہ جہانگیر نے زبردستی اس کے شوہر شیر افگن کو مروا کر اس سے عقد کیا تھا۔ جبکہ نور جہاں اس کے لیے قطعاً راضی نہ تھی۔ نہ کسی اور بی بی کے نام کی نیاز دلا سکتی تھی۔ خود عالم اسلام میں سات بی بیوں کو قابل توقیر سمجھا گیا ہے۔ جن میں حضرت آسیہ، حضرت مریم، وغیرہ وغیرہ کے نام شامل کئے جاتے ہیں۔ البتہ جناب سیدہ بی بی فاطمہ کی عظمت و توقیر کو سمجھنے اور ماننے کا نظریہ شیعوں ہی میں پایا جاتا ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ جودھا بائی نے اس لیے بی بی فاطمہ کی

نیاز دلائی ہوگی کہ نور جہاں مسلک کے اعتبار سے شیعہ تھی اور اس کے نزدیک جناب فاطمہ کی توقیر سب سے بڑھ کر تھی تو پھر اس شرط کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے صرف پاک دامن اور پارسائی بیان ہی کھا سکتی ہیں اس کا مطلب تو یہی ہوا کہ نور جہاں پاک دامن اور پارسا نہ تھی جبکہ تاریخ میں اس کے اخلاقی کردار میں کہیں سے جھول نہیں پایا جاتا۔ یہ یا تو جودھابائی کا جلاپا تھا۔ یا پھر خود سید احمد نور جہاں سے پرخاش رکھتے تھے اور دانستاً اس کے کردار کو مسخ کرنا چاہتے ہیں البتہ یہ اس پر ضرور یقین کیا جاسکتا ہے کہ بی بی فاطمہؑ کی عصمت وطہارت اس بات کی متقاضی ہے کہ ان کو وہی عورتیں کھا سکتی ہیں جو پاکدامن اور پارسا ہو۔ ورنہ ایک (جودھابائی) نور جہاں تو کیا' کس نے دیکھا ہے کہ بی بی کی صحنک کھانے والی عورتیں کتنی پاک دامن و پارسا ہوتی ہیں؟

بہر حال اس میں ہوتا یہ ہے کہ خشکہ یا شکرانہ پکوا کر کورے کورے کونڈوں میں رکھا جاتا ہے بعض جگہ چپاتیاں اور سالن بھی پکوایا جاتا ہے۔ عطر اور پھولوں سے دسترخوان کو مہکایا جاتا ہے اور اسے سات ترکاریوں سے سجایا جاتا ہے۔ پھر اس پر نذر دی جاتی ہے اور تب سات سہاگنیں اسے نوش کرتی ہیں یہ رسم اکثر شادی بیاہ کے موقع پر انجام دی جاتی ہے اور اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ رسم شیعوں کی نہیں سنیوں ہی کی ایجاد کردہ ہے جو بعد میں شیعوں نے بھی اپنالی۔ کیونکہ شیعوں کی جتنی رسومات ہیں وہ عام طور پر عزاداری ہی سے متعلق ہیں بہر حال یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسے شیعوں نے کسی اور انداز میں شروع کیا ہو۔ جو آگے چل کر اور انداز اختیار کرگئی ہو۔

۵۔ خاکِ شفا:

خاک کربلا کی تسبیح اور سجدہ گاہ کا استعمال شیعوں میں عام ہے اور اسے خاک شفا سمجھا جاتا ہے۔ ویسے خاک کی عظمت و توقیر شروع اسلام ہی سے مسلمانوں میں پائی جاتی ہے۔ اور یہ رواج ۳۰ھ کے بعد ہی سے مسلمانوں میں چل نکلا تھا۔ شہدائے اسلام کی خاک قبر، پیغمبر کی خاک قبر اور بعض صحابہ کی خاک قبر کا احترام اور اس سے شفا چاہنا مسلمانوں کی عادت میں داخل تھا۔ خاص طور پر جناب حمزہؑ کی قبر کی خاک ہر طرح کی بیماری کے لیے سبب شفا خیال کیا جاتا تھا۔ اور سر درد کے لیے تو وہ بہت ہی استعمال کی جاتی تھی۔ اسی طرح حضورﷺ کی خاک قبر اطہر بھی بطور تبرک اور دوا استعمال کی جاتی تھی۔ (سید نور الدین شافعی سمہوری وفاء الوفا باخبار دار المصطفیٰ)

شیخ عبدالقادر فاکہی "حسین التوسل فی زیارۃ افضل الرسل" میں لکھتے ہیں کہ

"شیخ امام سبکی نے دارالحدیث کے فرش پر اپنے رخسار لے کے جس پر امام نووی (شارح صحیح مسلم) کے قدم پڑا کیے تھے۔ غرض یہ تھی کہ ان کے پیروں کی برکت انہیں نصیب ہو۔ اور ان کی بیش از بیش جلالت سے انہیں بھی فیض حاصل ہو۔

علامہ ابن خلکان' جلال الدولہ بن الپ ارسلان سلجوقی کے حالات میں لکھتے ہیں۔

شیخ ابواسحٰق (کتاب المذہب والتنبیہ کے مصنف) چار مہینے سے بھی کم مدت میں بغداد واپس آگئے۔ وہاں انہوں نے امام الحرمین سے مناظرہ کیا تھا جب وہ نیشاپوری سے پلٹنے لگے تو امام الحرمین انہیں رخصت کرنے کے لیے باہر نکلے اور رکاب تھام کر انہیں سوار کیا اس واقعہ کے بعد خراسان میں ان کا درجہ و مرتبہ بہت بلند ہوگیا۔ لوگ ان کے خچر کے قدموں کے نیچے کی خاک' برکت حاصل کرنے کی نیت سے اٹھانے لگے۔" (وفیات الاعیان الابن خلکان جلد ۲ صفحہ ۱۲۳)

شیعہ بھی اسی طرح حسین مظلوم کی خاک کا احترام کرتے ہوئے اسے تسبیح اور سجدہ گاہ میں استعمال کرتے ہیں کیونکہ یہ وہی طیب و طاہر اور پاک پاکیزہ خاک ہے جس کے فضائل میں رسول ﷺ کے ارشادات موجود ہیں۔ اور اس کی گواہی مشکوٰۃ شریف جلد ۸ صفحہ ۱۳۹ مسند امام احمد ابن حنبل جلد ۸۵ مستدرک امام حاکم جلد ۲ صفحہ ۳۹۸ وغیرہ دے رہے ہیں اور جس طرح مسلمانوں نے اسلام کے شہید اول جناب حمزہؑ کی خاک سے تسبیحیں اور سجدہ گاہیں بنائیں۔ اور بعض روایات سے تو صراحت ہوتی ہے کہ حضرت فاطمہؑ سب سے پہلے اس پر عمل پیرا ہوئیں۔ (تاریخ کربلا معلی ۷۶) اسی طرح شہید اعظم امام حسین کی خاک قبر کو سب سے پہلے امام زین العابدینؑ نے سجدے میں استعمال کیا۔ اسکے بعد تمام ائمہ طاہرین نے اس پر عمل کیا۔ جس کے نتیجہ میں ہر زمانہ اور ہر دور میں شیعہ اس کے پابند رہے اور آج تک پابند ہیں خاک شفا پر سجدہ کرنے کے جواز میں علامہ کاشف الغطاء فرماتے ہیں۔ (تاریخ کربلا معلی صفحہ ۹۹)

سجدہ میں پیشانی رکھتے وقت امام مظلوم اور آپ کے اعزا و اصحاب کی وہ عظیم ترین قربانی یاد کرے۔ جو انہوں نے دین اسلام کے اصول و عقائد کی بقاء و حفاظت اور ظلم و استبداد، فتنہ و فساد کو نیست و نابود کرنے کی خاطر پیش کیں۔ چونکہ سجدہ ارکان نماز میں سب سے اہم رکن ہے

کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ بندہ سجدے کی حالت میں اپنے پروردگار سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔لہذا مناسب ہوا کہ نماز گداز اس خاک پر پیشانی رکھتے وقت ان شہدائے راہ خدا کو یاد کرے۔جنہوں نے حق کی راہ میں اپنا جسم و جان قربان کر دیا۔اس طرح اس میں خاکساری و فروتنی کے جذبات پیدا ہونگے۔اس کے نعمات ولذات کو ذلیل وخوار سمجھے گا۔

آگے چل کر علامہ وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں۔

''جب زمین کا یہ حق ہے کہ اس پر اللہ تعالی کا سجدہ بجالائے جائے اور سوا زمین کے اور کسی چیز پر سجدہ نہ کیا جائے۔لہٰذا مناسب ترین بات جیسے ہے کہ ایسی خاک خاک قبر حسینؑ ہے اور کی وجہ محض یہ ہے کہ خاک کربلا بلحاظ مادہ وعنصر کے تمام خطہ ہائے زمین سے معزز تر اور پاکیزہ ہے''۔

خاک شفا پر سجدہ کرنے سے شیعوں کا مقصد بھی یہی ہے کہ دنیا کی ناپاک خاک پر سجدہ کرنے سے بہتر ہے کہ اس خاک پر سجدہ کیا جائے۔جس پر محسن اسلام نے اپنا آخری سجدہ ادا کیا تھا اور وہ آخری سجدہ ایسا تھا جس نے اسلام کے ہزاروں سجدوں کو شرف قبولیت کی سند دلوادی۔

۶۔ شہدائے کربلا کی قسمیں:

شیعوں میں عام طور پر اور شیعہ عورتوں میں خاص طور پر ایک اور عادت پائی جاتی ہے اور وہ کسی بات کو سچ ثابت کرنے کے لیے یا اپنی بے گناہی کا ثبوت دینے کے لیے حضرت علیؑ یا جمیع شہدائے کربلا کی قسمیں کھاتی ہیں۔ان کے نزدیک یہ قسمیں جھوٹی نہیں کھائی جاسکتیں اور اس سلسلے میں شیعہ عورتیں عقیدے کی اتنی پختہ ہیں کہ انہیں یقین ہے کہ اگر کوئی جھوٹی قسم کھائے گا تو عذاب یا مصیبت میں مبتلا ہوگا۔اردو شاعری میں ایسی قسموں کا ذکر جابجا ملتا ہے

۷۔ نادِ علیؑ

شیعوں کی ایک خاص عادت یا عمل وقت مصیبت حضرت علیؑ کو آواز دینا یا علیؑ کہنا یا ناد علی کا ورد کرنا ہے جنگ اُحد میں رسول اللہ ﷺ کو حکم خدا ہوا تھا کہ علیؑ کو آواز دو اسے ناد علیؑ کے نام

سے پکارا جاتا ہے۔

نـاد علـیؑ مظهر العجائب سجده عونالك فى النوائب كل هم و غم سیـنـجلى بولايتك يا علىؑ يا علىؑ يا علىؑ اور کہا اے رسول اللہ ﷺ! علیؑ کو آواز دو۔تم ان کو ہر مصیبت وبلا میں اپنا معین و مددگار پاؤ گے۔(مدارج النبوۃ جلد ۲ صفحہ ۱۸)

شیعوں کی دلیل یہ ہے کہ جب خود رسول اللہ ﷺ کو حکم ہوا علیؑ کے پکارنے کا۔تو ہماری مشکلیں بھی علیؑ کے توسط سے حل ہوجائیں گی اور خدا سورہ مائدہ میں خود فرماتا ہے۔

يا ايها الذين آمنو اتقو الله وابتغو اليه الوسيلة.

(اے ایمان والو! خدا سے ڈرتے رہو۔اور خدا کے لیے وسیلہ ڈھونڈلو)

ویسے بھی نام علیؑ اپنے اندر بہت سی خصوصیات رکھتا ہے حضرت علیؑ کی والدہ گرامی جناب فاطمہ بنت اسد نے آپ کا نام حیدر (شیر) رکھا تھا۔کیونکہ ولادت کے بعد ہی سے آثار شجاعت نمودار ہونے لگے تھے جناب ابوطالب چاہتے تھے ایک ایسا نام رکھا جائے جو اس مولود کی شایان شان ہو۔پروردگار عالم نے الہام کیا کہ اس مولود کا نام علیؑ رکھو۔یہ نام آپ کے مشہور اسماء سے ہے۔جو زمانہ جاہلیت واسلام میں معروف تھا۔آپ زمین وآسمان میں علیؑ ہیں۔یہ علو سے ماخوذ ہے جس کے معنی بلندی کے ہیں۔

مولانا کوثر ندوی لفظ علیؑ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں

''علی کے معنی ہیں بہت بلند اور بہت برتر۔اس کا مفہوم یہ بھی ہے کہ اتنا بلند و برتر جس کی بلندی و برتری فوق الادارک ہو۔اسی طرح آپ کا لقب مرتضیٰ ہے۔جس کے معنی ہیں پسندیدہ اور منتخب شخصیت شیعوں کے نزدیک حضرت علیؑ ہی وہ شخصیت تھی جو رسول خدا ﷺ کی پسندیدہ و انتخاب شدہ تھی۔اسی طرح حیدر سے آپ کی بہادری وشجاعت اور ابوتراب سے روحانی طاقت ظاہر ہوتی ہے۔شیعہ اسی وجہ سے نام علیؑ کو مقدس خیال کرتے ہوئے اس کا ورد آفت ومصیبت میں ضروری سمجھتے ہیں۔اردو شاعری میں شیعہ شعراء نے جابجا اپنے اس عقیدے کا فائدہ اٹھایا ہے۔

باب چہارم

ہندوستان میں شیعیت اور عزاداری

گنگناتے ہوئے آبشاروں بہتے ہوئے دریاؤں' لہلہاتے ہوئے سبزہ زاروں اور سر بفلک پہاڑوں سے معمور ملک ہندوستان جہاں اپنی سیاسی' سماجی' ثقافتی اور جغرافیائی بوقلمونی کے سبب بیرونی حملہ آوروں کے لیے کشش کا باعث بنا رہا وہیں تصادم واتصال کا مرکز بھی۔ ہر دور میں کسی نئے ملک، نئی قوم، نئے فاتح اور نئی تہذیب نے اس پر اپنا تسلط جمانے کی کوشش کی۔ آریوں سے لے کر انگریزوں تک نہ جانے کتنی قومیں ہندوستان کی خاک نمناک پر اپنے نقوشِ قدم چھوڑ گئیں۔ ہر آنے والے حملہ آور نے ملک کی سالمیت کا شیرازہ بکھیرنے کی کوشش کی اور اس بدنصیب ملک کو اپنی تہذیبی روایات برقرار رکھنے کے لیے بے انتہا جدوجہد کرنی پڑی۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ سنگریزوں کی طرح بکھرے ہوئے ہندوستانیوں کی آنکھیں اجنبی چمک دمک سے خیرہ ہو گئیں۔ اور وہ اس طرف بغیر سوچے سمجھے لپک پڑے یا پھر سرحد وطن میں داخل ہونے والے ان تہذیبی قزاقوں کے بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ کر وہ اپنی قدیم روایات کے سرمایہ کے تحفظ کی خاطر ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ نتیجتاً وہ ایک تہذیبی تصادم کا شکار ہو گئے ایسا ہی ایک زبردست تصادم اس وقت پیش آیا جب مسلمان ہندوستان میں آئے۔ یہ تصادم گذشتہ تمام تصادموں سے زیادہ خطرناک لیکن حسین ثابت ہوا۔ خطرناک اس لیے کہ اب کی دفعہ حریف ذرا زیادہ ہی مضبوط اور قوی تھا اور پھر

ہندوستانیوں اور آنے والوں کی تہذیب وتمدن میں کافی حد تک فرق تھا۔ دراوڑوں کو آریائی اقدار حیات قبول کرنے میں اتنی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ کیونکہ دونوں کے مذہبی نظریات کم وبیش یکساں تھے۔ دراوڑ دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے۔ اور آریوں کا مذہب بھی بڑا سادہ تھا۔ وہ قدرت کی مختلف طاقتوں مثلاً سورج' چاند' آسمان' ہوا' پانی آگ وغیرہ کو پوجتے تھے۔ بہر حال پرستش دونوں جگہ موجود تھی۔ لہٰذا ایک کے مذہبی عناصر دوسرے کی زندگی میں باسانی اور غیر ارادی طور پر داخل ہو گئے۔ لیکن ساتویں صدی میں آنے والے عرب مسلمان اپنے ساتھ مذہب کا ایک بالکل الگ تصور لے کر آئے تھے۔ ایک ایسا تصور جس میں پرستش اور خاص طور پر بت پرستی قطعاً حرام تھی۔ ان کا مذہب ان کا خدا اور ان کا قرآن پکار پکار کر ان سے کہہ رہا تھا۔ یہ زمین یہ آسمان یہ چاند، یہ سورج اور یہ ستارے ہم نے تمہارے لیے پیدا کئے ہیں اور تم ان کا صحیح استعمال سیکھو۔ اسلام فطری مذہب ہونے کے باوجود فطرت کی پرستش سے باز رکھتا ہے۔ ہندوؤں میں موسیقی مذہب کا ایک جذو تھی اور اسلام نے اسے حرام قرار دے رہا تھا۔ سب سے نمایاں فرق تو یہ تھا کہ مسلمان اپنے ساتھ جو زبان جو تہذیب لے کر آئے تھے۔ وہ قطعاً مختلف تھی ایسے مواقع پر فاتح اور مفتوح حاکم اور محکوم کا تصادم لازمی تھا۔ لیکن کسے امید تھی کہ یہ خطرناک تصادم ایک حسین اتصال کی شکل بھی اختیار کر سکتا ہے عربوں کی بلند اخلاقی اور ہندوستانیوں کی وسیع القلبی نے مل کر ایسا رنگ جمایا کہ دونوں قومیں شیر وشکر ہو گئیں۔ مسلمان اپنے ساتھ عالمی برادری کا تصور لائے تھے۔ جہاں محمود وایاز ایک صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور بندہ اور بندہ نواز کا فرق حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتا ہے۔ لہٰذا ان حاکموں نے ہندو رعایا پر اپنی مہر پروری کا سکہ ایسا بٹھایا کہ اسلامی تعلیمات اور خصوصیات خود بخود ہندوؤں پر اثر انداز ہونے لگیں۔ تہذیب نے اپنا بوسیدہ لبادہ اتارا اور ایک نیا لباس زیب تن کیا۔ کام ودہن نئے چٹخاروں سے محظوظ ہوئے زبان نے پرانے الفاظ کو نئی تراش خراش کا جامہ پہنایا اور مغلوں کے آتے آتے تو یہ حال ہو گیا کہ ہندو مسلمان

من تو شدم تو من شدی، من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

کی منزل سے بھی آگے نکل گئے۔ نتیجتاً جہاں دھوتی کے ساتھ ساتھ شیروانی نے رواج پایا وہیں

ٹوپیوں کی ساخت میں بھی تبدیلی آئی زرین و زرتار لباسوں نے مقبولیت حاصل کی سلیم شاہی جوتیاں پیروں کی زینت بنیں۔ لہنگوں اور ساڑیوں نے سمٹ کر غراروں اور شلواروں کی شکل اختیار کرلی۔ چنری دوپٹہ بن گئی اور لڈو اور پیڑوں کے ساتھ ساتھ قلاقند برفی، گلاب جامن بھی پلیٹوں میں سجنے لگے۔ ہندوستانی قابوں سے قورمے، زردے، بریانی تنجن اور پلاؤ کی خوشبوئیں اٹھنے لگیں۔ پکوڑوں اور پھلکیوں کے ساتھ ساتھ شامی کبابوں نے بھی اپنا مزہ دکھایا۔ ایران کے گلاب ہندوستان کے چمن کو معطر کرنے لگے۔ ایرانی صراحیاں ہندوستان کے جام سفالیں سے گلے ملنے لگیں۔ مہندی اور صندل کی خوشبو نے عطریات کو اپنا ہم سفر بنالیا۔ رانی کرناوتی۔ کی راکھی ہمایوں کی کلائی میں بندھی۔ بیربل کی بزلہ سنجی اکبر کی رواداری کے ترازو میں تلی۔ گوپال کی تان خسرو کے ''خیال'' میں ڈھل گئی اور ہندوستانی بانسری کی لے ایرانی سازوں میں سما گئی۔

ان سب پہلوؤں سے قطع نظر ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی یک جہتی اور میل جول کا بہترین ذریعہ وہ مراسمِ عزاداری تھے جو عرب اور ایران سے آنے والے سادات اور شیعہ سپاہی علماء اور صوفیائے کرام اپنے ساتھ ہندوستان لائے۔

یوں تو ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد ظہورِ اسلام کے فوراً بعد ہی شروع ہوگئی تھی کیونکہ عرب اقوام شروع ہی سے تاجر پیشہ رہی ہیں اور اسلام نے تو تجارت پر خاص طور پر زور دیا ہے لہٰذا عرب تاجر بحری راستوں کے ذریعے ہندوستان سے تجارت کیا کرتے تھے اور اکثر عرب جنوبی ساحلوں پر آیا کرتے تھے۔ اس دوران بہت سے مسلمانوں نے وہاں سکونت بھی اختیار کرلی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جنوبی ساحلوں پر اکثر ایسے بزرگان دین کی یادگاریں آج بھی باقی ہیں جو اپنے زمانے میں رشد و ہدایت کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ مثال کے طور پر ترچناپلی کے سید سلطان نظہر ولی جن کی بدولت (سرکاری گزیٹر کے مطابق) ترچناپلی کے اکثر مسلمان جنہیں Ravalton کہتے ہیں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اسی طرح تنجور میں سید عبدالقادر ولی ناگوری شیخ بیجاپور کے پیر معتبری' حیدرآباد میں صوفی سرمست اسدالاولیاء اور بابا شرف الدین عراقی، میسور میں حضرت حیات قلندر عرف بابا بدھن، گلبرگہ میں حضرت سید بندہ گیسو دراز، کوکن (ضلع تھانہ) میں شیخ بابا

مجب اور ماہم میں مخدوم شاہ ماہی وغیرہ نے اشاعت اسلام میں زبردست رول ادا کیا اور انہیں بزرگان دین کی وجہ سے جنوبی ہندوستان کے بہت سے لوگ مسلمان ہوگئے۔ (آب کوثر از شیخ محمد اکرم صفحات ۲۲۴۔۲۰۸۔۲۰۶۔۲۰۳) ساحلی علاقوں کو چھوڑ کر گجرات' سندھ پنجاب' کشمیر اور بنگال و بہار وغیرہ میں بھی مسلمانوں کی آبادی بہت قدیم زمانے سے موجود تھی۔ البتہ محمد بن قاسم اور محمود غزنوی کی فتوحات کے بعد مسلمانوں کے تسلط و اقتدار کے ساتھ ساتھ ان کی آبادی میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ عرب' ایران' ترکستان اور افغانستان کے بے شمار خاندان آباد ہوگئے۔ ان میں شیعہ بھی تھے اور سنی بھی۔ حکومتیں اگرچہ سنی تھیں لیکن انہوں نے قابل اور لائق شیعوں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کر رکھا تھا۔ جس سے شیعوں کا اثر و نفوذ حکومت اور عوامی زندگی دونوں پر غیر ارادی طور پر ہوتا گیا۔ اور ایک وقت وہ آیا کہ یہ بااقتدار شیعہ سردار اور امراء حکومت وقت کی نااہلی اور کمزوری سے فائدہ اٹھا کر خود مختار ہوتے چلے گئے۔ اور جب انہوں نے اپنی حکومتیں قائم کیں تو وہ مراسمِ عزاداری جو وہ اعلانیہ ادا نہیں کرسکتے تھے۔ اب باقاعدہ تزک و احتشام اور اہتمام کے ساتھ ادا کرنے لگے۔ ان میں بعض تو اس معاملے میں بے حد جذباتی اور انتہا پسند ثابت ہوئے اس لیے مراسمِ عزاداری ان کی حکومت کا ایک اہم جزو قرار پائے یوں ہندوستان میں اکثر علاقے شیعیت کا زبردست مرکز بن گئے جن میں دکن، اودھ، کشمیر، جونپور اور بنگال اور بہار کا ذکر خاص طور پر کیا جاسکتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان میں جنوب سے شمال تک اور مشرق سے لے کر مغرب تک مختلف علاقوں میں شیعیت اور عزاداری نے کس طرح رواج پایا۔

دکن : عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ دکن میں مسلمانوں کا پہلا قدم جلال الدین خلجی کے عہد میں پڑا۔ جب اس کے بھتیجے علاؤالدین خلجی نے ۱۳۰۳ء میں دیوگری پر حملہ کیا۔ اور اس طرح جنوبی ہندوستان مسلمانوں کی قلمرو میں شامل ہوگیا لیکن حقیقت یہ نہیں ہے ڈاکٹر اعجاز حسین لکھتے ہیں۔

''اس حملے سے بھی بہت پہلے مسلمان یہاں اپنا ذاتی و اخلاقی رسوخ قائم کرچکے تھے۔ قبل ظہور اسلام عرب تاجر اس خطہ میں آنے لگے تھے۔ ان میں

سے کافی یہاں آباد بھی تھے۔بعدِ ظہورِ اسلام جب سارا جزیرہ نما عرب مسلمان ہوگیا تو ہندوستان میں آباد ہو جانے والے عرب بھی مسلمان ہوگئے.........
اس طرح عرصۂ دراز سے جنوبی ہند میں مسلمانوں کی آمد و رفت، میل جول کا سلسلہ قائم تھا"۔(اردو شاعری کا سماجی پس منظر صفحہ ۸۶)

۱۳۲۷ء میں سلطان ہند محمد تغلق نے اپنے سیاسی تدبر کا استعمال کرتے ہوئے دہلی کے بجائے دیوگری کو اپنا پایۂ تخت بنانا چاہا تو تمام رعایائے دہلی معہ بادشاہ کے دہلی سے دیوگری منتقل ہوئی ان میں علماء' فضلاء' ماہرین فن' تجار وغیرہ سبھی شامل تھے۔لیکن بادشاہ کا یہ اقدام سیاسی حیثیت سے بالکل ناکام رہا۔اور محمد تغلق کے نام پر تاریخ میں ایک داغ چھوڑ گیا۔اس کے بعد حالانکہ فیروز شاہ تغلق جیسا بادشاہ تخت نشیں ہوا۔لیکن محمد تغلق کے زمانے ہی سے امرأ دکن نے بغاوت کا علم سنبھال لیا تھا۔ نتیجتاً شاہی لشکر کو شکست ہوئی اور ایرانی النسل سردار حسن گنگو نے ۱۳۴۷ء میں ظفر خان علاؤالدین بہمن شاہ کے نام سے دکن میں خود مختار حکومت کا اعلان کردیا۔ اور دیوگری یعنی دولت آباد کو پایۂ تخت قرار دیا۔ پھر کچھ دنوں بعد بہمنی سلطنت کا پایۂ تخت گلبرگہ منتقل ہوگیا۔یوں دکن میں بہمنی سلطنت کا آغاز ہوا۔

سلطنت بھمنی : اس خاندان نے تقریباً دو سو سال تک دکن پر حکومت کی۔اور تقریباً ۱۸/ بادشاہ ہوئے جن میں سے اکثر و بیشتر حکمراں نہ صرف علم دوست اور علم پرور تھے۔ بلکہ خود بھی ذی علم تھے یہی وجہ ہے کہ عرب و ایران کے اکثر بڑے بڑے علماء ان کے دور حکومت میں ہندوستان آئے جن میں سے بعض قابل ذکر نام یہ ہیں میر فیض اللہ، انجو، محمود گاوزوانی، حسن گیلانی، ملا عبدالغنی، مفتی نجم الدین، شیخ آذری، محمود گاواں سید العلما' سلامت اللہ واحدی، شمس الدین سامی، عبدالکریم ہمدانی، ملا نظیری وغیرہ (تاریخ فرشتہ)۔ ان میں سے زیادہ تر علماء شیعہ مسلک رکھتے تھے تاریخ دکن (حصہ اول) کے مرتب سید علی بلگرامی صفحہ ۱۶۲ پر لکھتے ہیں۔

"......حالانکہ ہندوستان کو کسی ایرانی نے فتح نہیں کیا تھا تب بھی ہندوستان کے مسلمانوں کی زبان فارسی تھی۔اور یہی وجہ تھی کہ سلاطین بہمنیہ کے یہاں بھی

ایرانی بکثرت تھے اور گو ان میں سے بہت سے شیعہ تھے مگر تقیہ رکھتے تھے۔"

ڈاکٹر رشید موسوی تحریر فرماتی ہیں

"ان علماء کی وجہ سے سلطنت میں شیعیت کا اثر بڑھنے لگا۔ بہمنیوں کی درباری و سرکاری زبان فارسی تھی۔اس لیے یہاں ان علماء کی بڑی قدر و منزلت کی جاتی تھی۔ اور انہیں دربار میں بڑا رسوخ حاصل ہو جاتا تھا۔ایران سے آنے والے علماء فضلاء عموماً اثنائے عشری مذہب کے پیرو ہوتے تھے۔اس لیے علم و فضل کے ساتھ ساتھ ان کے معتقدات کا اثر بھی دربار اہل دربار پر پڑنے لگا۔"(دکن میں مرثیہ اور عزاداری)

بہمنی سلطنت کے بانی علاؤالدین حسن بہمنی نے تقریباً گیارہ سال تک بڑی تنظیم کے ساتھ حکومت کی اور اپنی سلطنت کی حدود میں کئی گنا اضافہ کیا۔ یہاں تک کہ اس کی حکومت جنوب میں دریائے تنگ بھدرا اور مغرب میں ساحل گوا تک پھیل گئی۔حسن گنگو بقول جان ہالسٹر خود بھی ایران کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور اس نے اپنی سلطنت کے استحکام کے لیے جو فوج رکھی تھی۔اس میں بھی ایرانیوں کی تعداد کثرت سے تھی۔ جو زیادہ تر شیعہ تھے۔

علاؤالدین حسن بہمنی شاہ کے بعد اس کا بیٹا محمد شاہ اوّل تخت نشین ہوا۔ جو بذات خود ایک قابل حکمراں تھا۔اس کے عہد میں غزنین' کابل' ترکستان' عراق' ایران' عرب سبھی ملکوں کے باشندے دکن کی طرف متوجہ ہوئے۔لیکن ان میں اکثریت ان شیعہ ایرانیوں کی تھی جو امور ملکی میں دخل رکھتے تھے۔ لہٰذا بادشاہ پر شیعیت کا کافی گہرا اثر تھا۔ بلکہ بعض واقعات سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ مذہب شیعہ کا پیرو تھا۔مثال کے طور پر جب رائے وجے نگر کی طرف سے اسے تخت فیروزہ نذر کیا گیا تو اس پر سب سے پہلے بادشاہ نے ۲۱/ مارچ ۱۳۶۳ء کو اس وقت قدم رکھا جب آفتاب برج حوت سے نکل کر برج حمل میں داخل ہو رہا تھا۔(ابوالقاسم فرشتہ جلد سوم صفحہ ۴۷ اردو ترجمہ طالب)(اردو مرثیے کا ارتقاء)

اسی طرح سید علی بلگرامی رقم طراز ہیں کہ

"(بادشاہ نے) کربلائے معلیٰ کو آدمی بھیجے اور وہاں بھی خیرات کرائی"(تاریخ

دکن صفحہ ۱۰۵)

محمد شاہ اوّل کے بعد دوسرا قابل ذکر بہمنی فرمانروا محمد شاہ ثانی ہے۔ جو بڑا علم دوست تھا چنانچہ اس کے دربار میں بھی ایرانی شعراء وادباء کی خاصی اہمیت تھی ہی جن میں میر فضل اللہ انجو کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ فیروز شاہ بہمنی انہیں کا شاگرد تھا اور انہیں کی مدد سے اس نے حصول تخت میں کامیابی حاصل کی تھی۔ لہٰذا تخت نشیں ہونے کے بعد اس نے اپنا وکیل سلطنت مقرر کیا۔ (دبستانِ عشق کی مرثیہ گوئی از ڈاکٹر جعفر رضا۔۲۲) اسے مذہب سے خاص لگاؤ تھا اور تحقیق سے دلچسپی تھی۔ اسی شوق میں اس نے میر فضل اللہ انجو کی علمی اور مذہبی قابلیت سے متاثر ہوکر اثنا عشری عقائد قبول کیے۔ پروفیسر ہارون خان شروانی حالانکہ فیروز شاہ کو سنّی بتاتے ہیں۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کرتے کہ "کربلا" نجف اور مدینے کے سیدوں کی طرف بادشاہ کا جھکاؤ بہت واضح تھا۔ یہاں تک کہ بہمن شاہ کا پرانا چاندی کا تخت جسے تلنگانہ سے تخت فیروزہ کے ملنے کے پہلے تک شاہی نشست کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اس نے گلوا ڈالا۔ اور اسے مستحق سیدوں میں تقسیم کرنے کے لیے سمندر پار بھجوا دیا۔" (اردو مرثیہ کا ارتقاء۔۲۳)

سیّد علی بلگرامی بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے فیروز شاہ کے متعلق لکھتے ہیں "سنیوں سے زیادہ سیّدوں کی خاطر اسے منظور تھی۔ وہ پہلا بادشاہ ہے جس نے اپنی بیٹیاں سیّدوں کو دیں۔ اور ان کی بیٹیاں اپنے بیٹوں کے لیے لیں۔ میر فضل اللہ انجو کی دختر کا نکاح اپنے بیٹے شہزادہ حسن خان سے کیا۔ اور اپنی بیٹی جو سلطان محمود شاہ کی دختر کے بطن سے تھی صدر جہاں کے بیٹے میر شمس الدین انجو کو کر دی۔" (تاریخ دکن صفحہ۔۱۲۹)

اس کے جانشین احمد شاہ (اوّل) کے زمانہ میں تو ایرانی بلحاظ تعداد واقتدار اتنا بڑھ گئے کہ خود بادشاہ کی سرپرستی میں عزاداری ہونے لگی۔ جس کے نتیجے میں اس کا اثر عوام پر بھی پڑا تخت نشینی کے فوراً بعد ہی اس نے ۲۱/مارچ کو جشن نوروز منانے کی رسم جاری کردی۔ (بہمنی سلطنت از عبدالمجید صدیقی)

احمد شاہ شروع ہی سے اہل بیت کا معتقد ومحب تھا۔ اور زمانہ شہزادگی ہی سے سیدوں کا مداح تھا۔ سید علی بلگرامی نے اس زمانے کا ایک واقعہ قلم بند کیا ہے کہ جب احمد شاہ جان کے خوف

سے بیدر سے فرار ہوا تھا۔ اور خلف حسن خاں کے ساتھ (جو خود شیعہ عقائد رکھتا تھا) خاناں پور نامی قصبہ میں قیام پذیر ہوا تھا۔ اس وقت اس نے منّت کی تھی کہ بادشاہ ہو جاؤں گا تو اس گاؤں کا نام رسول آباد رکھوں گا۔ اور سادات مدینہ منورہ اور کربلائے معلیٰ ونجف اشرف کے نام سے وقف کردوں گا۔ (جان ہالسٹر۔ شیعاز آف انڈیا صفحہ ۸۶)

یہی نہیں بلکہ وہ سیّدوں کی اتنی عزت کرتا تھا کہ ان کی شان میں کوئی گستاخی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ چنانچہ سید ناصر الدین کی ہتک کرنے پر اس نے شیر ملک کو ہاتھی کے پاؤں کے نیچے کچلوا دیا (تاریخ فرشتہ جلد سوم صفحہ ۱۳۸ اردو ترجمہ طالب) سر ولزلی ہیگ نے (Sir Wellesly Haig) تو احمد شاہ کے مذہب شیعہ کی طرف راغب ہونے کا سہرا سید گیسو دراز اور ان کے خاندان کے سر باندھا ہے۔ جو ہیگ کے مطابق شیعہ مسلک کے پیرو تھے۔

شیعی اعتقادات واثرات اس کی زندگی میں تو رچ بس گئے ہی تھے۔ لیکن موت کے بعد بھی اس بات کا ثبوت اس کا مقبرہ دے رہا ہے۔ جو شیعی وایرانی طرز تعمیر پر بنایا گیا ہے محکمۂ آثار قدیم حیدر آباد کی رپورٹ (صفحہ۴) کے مطابق احمد شاہ کے مقبرے کی اندورنی بناوٹ کچھ یوں تھی۔

"اندر سے یہ عمارت گلبرگہ کی عمارت سے کہیں زیادہ الگ طرز کی ہے۔ اس میں صوفی یا شیعہ اثرات اپنے کمال پر موجود ہیں۔ اس عمارت کی اندرونی سجاوٹ مشہور خطاط مغیث شیرازی کی نگرانی میں ہوئی۔ جو غالباً خود بھی شیعہ تھا۔ اس میں رسول اسلام اور چوتھے خلیفہ علی کا نام سینکڑوں طرح کے خطوط اور طغروں میں لکھا ہے۔ اور جابجا شیعوں کے طرز کا درود بھی لکھا ہوا ہے مقبرے کا یہ اندرونی حصہ خطاطی کے اعتبار سے ازمنہ وسطیٰ کی خطاطی کا شاہکار قرار دیا جاسکتا ہے۔" (ہارون خان شیروانی صفحہ۔۹۱ بحوالہ اُردو مرثیے کی روایت صفحہ ۱۵)

جان ہالسٹر کے بیان کے مطابق احمد شاہ نے بیدر میں اپنا مقبرہ اپنی زندگی ہی میں تعمیر کروالیا تھا۔ اور اس کا نقشہ شکر اللہ قزوینی کا بنایا ہوا تھا۔ جس میں بارہ اماموں کے نام کندہ کیے گئے تھے۔ جبکہ ابتدائی تین خلیفہ کے نام نہیں ہیں (Haig Opcit JRAS 1924 p.g.78)

بعض تاریخی حقائق سے یہ پتہ صاف چلتا ہے کہ عزاداری احمد شاہ بہمنی کے زمانے

سے باقاعدہ طور پر ہونے لگی تھی۔ جو ایرانی لاکھوں کی تعداد میں یہاں پہنچے تھے۔ وہ عزاداری بھی اپنے ساتھ لائے تھے۔ اور باقاعدہ محرم میں مجالس عزا منعقد کرتے رہتے تھے۔ جس میں ذکر شہادت حسینؑ کے ساتھ ساتھ مرثیہ خوانی کا بھی رواج عام تھا۔ چنانچہ دکن میں مرثیہ گوئی کا سب سے پہلا تحریری ثبوت آذری کے یہاں ملتا ہے۔ جو ایران کا مشہور شاعر تھا۔ اور احمد شاہ بہمنی کے دربار میں ملازم تھا۔ اس کی مرثیہ گوئی کا ذکر ہفت اقلیم، خزانہ عامرہ اور دوسرے تذکروں میں موجود ہے۔

احمد شاہ ثانی کے زمانہ میں تو ایرانی سیدوں کے ساتھ رشتہ داریاں بھی قائم ہوئیں۔ بادشاہ کی ایک بہن سید جلال بخاری کے پوتے جلال خان کو اور دو بہنیں خلیل اللہ کرمانی کے بیٹوں شاہ نور اللہ اور شاہ حبیب اللہ سے منسوب تھیں۔" (پروفیسر ہارون خاں صفحہ ۲۲۴)

یہ وہی شاہ خلیل اللہ کرمانی ہیں۔ جن کے مقبرے کی رپورٹ حیدرآباد کے محکمۂ آثار قدیمہ نے یوں لکھی ہے۔

"اس مقبرے کی سب سے امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس پر کوئی گنبد نہیں۔ اس میں مغیث شیرازی کی لکھی ہوئی خط ثلث میں بہت خوبصورت تحریریں ہیں۔ ایرانی اثرات ہلکے سے نکلے ہوئے بارجوں ہی سے ظاہر نہیں ہوتے۔ جن کا تناسب اور سنگ موسیٰ میں ترشی ہوئی بیلیں پھول پتیاں اور رسی کی وضع کی بہت ہی دلفریب ہیں بلکہ چوتھے خلیفہ کے منقش نام سے بھی آشکار ہیں۔ جو خدا اور اس کے رسول کے نام کے ساتھ ساتھ جگہ جگہ درج ہے۔ ایک جگہ بہت ہی خوبصورت پچی کاری کی ہے۔ جس میں برج اور علیؑ کے الفاظ کا بڑا فنکارانہ طغریٰ بنا ہے" (ہارون خان شروانی صفحہ ۲۲۶)

پروفیسر یزدانی بہمنی عہد میں شیعی اثرات کے متعلق ایک جگہ رقم طراز ہیں۔

"ایک اور امتیازی عمارت جو غالباً اسی عہد میں تعمیر کی گئی۔ تخت کرمانی کے نام سے مشہور ہے .... اس عمارت کے اندرونی حصہ میں ایک بڑا ہال ہے۔ جسے ستونوں کے ذریعہ تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے بیچ والے حصہ

میں لکڑی کا ایک منبر رکھا ہوا ہے جسے محرم میں بعض شیعہ رسوم کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔" Bider monuments its history and

(pg.100 Oxford.1948 by Prof.Yazdan)

پروفیسر مسیح الزماں اس کے تعلق سے فرماتے ہیں۔

"اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ تخت کرمانی جس عمارت کا نام ہے وہ امام باڑہ ہے اس کے ایک طرف شہ نشیں ہوگی۔ اس عمارت کی تعمیر کا مقصد مجالس عزا کے انعقاد کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ احمد شاہ ثانی کے عہد میں بڑے پیمانے پر عزاداری ہونے لگی تھی۔ باقاعدہ مجلس عزا برپا ہوتی تھی۔ جس میں بیان شہادت کیا جاتا تھا۔"

(اردو مرثیے کا ارتقاء صفحہ ۔ ۳۰)

علاؤالدین بہمنی کے عہد میں شیعیت کے فروغ کا پتہ ہرات کے بادشاہ (شاہ رخ) کے سفیر عبدالرزاق کے سفرنامے سے چلتا ہے۔ جو ۸۴۶ھ کے آخر میں دکن آیا۔ جب واپس جانے لگا تو اس کا جہاز سمندر میں پھنس گیا۔ یہاں تک کہ ۸۴۸ھ شروع ہو گیا۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے عبدالرزاق لکھتا ہے۔

"ہم نے محرم کا چاند دریا میں دیکھا۔ ہماری کشتی چند روز دریا ہی میں لنگر انداز رہی وہیں رسم عزا اور مرثیہ خوانی سید الشہدا ادا ہوئی۔ پھر ہم مسقط پہنچے۔"

اسی بادشاہ کے عہد میں محمود گاواں نے امیر سلطنت کی حیثیت سے امور مملکت میں اقتدار حاصل کیا اور اسی کے تدبر و تعاون سے محمود شاہ نو سال کی عمر میں تخت نشین سلطنت ہوا۔ محمود گاواں امیر سلطنت ہوا محمود گاواں شیعہ مسلک رکھتا تھا۔ اور شروانی نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ وجاہت حسین اسے سنی بتاتے ہیں جان ہالسٹر بھی شروانی کا ہم خیال ہے۔

پروفیسر مسیح الزماں بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ عزاداری اس کے عقائد کا ایک اہم جزو تھی۔ اور عبدالمجید صدیقی (بہمنی سلطنت صفحہ ۔ ۱۵۷) بھی اس کا اقرار کرتے ہیں کہ محمود گاواں خراسان اور عراق کے اکثر علماء کو امداد بھی بھیجتا تھا۔ اور اسی کی وجہ سے ایرانی امیر مثلاً یوسف عادل

خاں، سلطان قلی وغیرہ کا اقتدار دکن میں بڑھا۔ جان ہالسٹر تو اس کی شیعیت کے بہت سے ثبوت پیش کرتا ہے۔ مثلاً یہ کہ محمود گاواں اپنے مکتوب کو شیعوں کے طریقے پر ختم کرتا تھا۔ دوسرے یہ کہ خواجہ کے ورثاء جواب تک حیدر آباد میں مقیم ہیں۔ شیعہ مسلک رکھتے ہیں۔ نیز یہ کہ اس کے ہندوستان آنے کا مقصد بھی سلطان حسین اور سید کاظمی کی ایماء پر شیعیت کی تبلیغ تھا۔ اس کے علاوہ یوسف عادل خاں جس کو اس نے گود لیا تھا۔ شیعہ تھا (Shias of India)

پروفیسر شروانی بیدر کے مشہور مدرسہ محمود گاواں میں سکھائی جانے والی تعلیم سے اس کی شیعیت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ انہوں نے اس مدرسہ کی بعض تعلیمی علامتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مثلاً

تعلیم نور خاں	علامت شیر
تعلیم صدیق خاں	علامت شیر یزداں
تعلیم مینار	علامت شیر شیرزہ

''بقول شروانی یہ سب علامتیں شیر خدا کے متعلق معلوم ہوتی ہیں جو چوتھے خلیفہ علیؑ کا لقب تھا۔'' (صفحہ۔ ۲۰۸)

سلاطین بہمینہ کے دور حکومت کا ایک سرسری جائزہ لینے سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ دکن میں عزاداری شمالی ہند سے بہت قبل ہونے لگی تھی۔ اور حکومت خود اس کی سرپرستی کرتی تھی۔ بادشاہ وقت خود اس میں دل چسپی لیتا تھا۔ لیکن محمود خان محمود مصنف تاریخ جنوبی ہند (صفحہ ۴۷۳) دکن میں عزاداری کی وجہ مرہٹی اثر کو بتاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے۔

''جنوبی ہند میں محرم جس صورت میں منایا جاتا ہے اس کا آغاز اس زمانے میں ہوا جبکہ دکن کی اسلامی سلطنتوں پر مغلوں نے حملہ کرنا شروع کیا تھا۔ مغلوں سے بچاؤ کے لیے ان سلطنتوں نے مناسب سمجھا کہ سلطنتوں میں مرہٹواڑی کے قرب وجوار میں رہنے کی وجہ سے مرہٹی اثر بہت زیادہ اثر کر چکا تھا۔ اور یہاں کے مسلمان بہت سے مرہٹی رسوم اختیار کر بیٹھے''۔

(دکن میں مرثیہ اور عزاداری صفحہ۔ ۵۷)

محمود خان کا یہ خیال قابل تسلیم نہیں۔ سب سے پہلے تو یہ بیان ہی غلط ہے کہ جنوبی ہند میں محرم مغلوں کے حملوں کے زمانے سے منایا جانے لگا۔ اس لیے کہ تاریخی تحقیقات سے ثابت ہو گیا ہے کہ عزاداری بہت پہلے سے یہاں موجود تھی۔ دکن میں مغلوں کا پہلا حملہ اکبر کے زمانے میں (عادل شاہی اور نظام شاہی عہد) ہوا۔ جبکہ بہمنی حکمراں خود عزاداری کی طرف راغب تھے۔ رہی یہ بات کہ انہوں نے مغلوں سے بچاؤ کی خاطر یہ مناسب سمجھا کہ مرہٹوں اور ہندوؤں کو جو اکثریت میں تھے۔ اپنے ساتھ ملا لیا جائے۔ تو اس کے لیے محرم کے علاوہ کوئی اور صورت بھی ہو سکتی تھی۔ مثلاً مذہبی رواداری' مرہٹوں کو زیادہ سے زیادہ مراعات اور اعلیٰ عہدے وغیرہ جیسی پالیسی اکبر نے شمالی ہند کے ہندوؤں اور راجپوتوں کے حق میں اپنائی تھی۔ لیکن اکبر چونکہ خود دین اسلام کا اتنا زبردست پیرو نہ تھا۔ لہٰذا اسے ایک نئے مذہب کی ایجاد کرنی پڑی۔ برخلاف اس کے دکن کے حکمراں شیعیت اسلام کی طرف بے انتہا مائل تھے۔ بلکہ عزاداری بھی کرتے تھے۔ لہٰذا انہیں قومی یکجہتی کے سلسلہ میں الگ سے کوئی اقدام نہیں اٹھانا پڑا۔ اور نہ ہی کوئی ایسی مخصوص مذہبی پالیسی مرتب کرنا پڑی۔ عزاداری بذات خود ہی یک جہتی کا ذریعہ بن گئی۔ جو دکن کے سلاطین ہی کے لیے نہیں۔ بلکہ اودھ کے حکمرانوں کے حق میں بھی بہتر ثابت ہوا۔ اور یہی نہیں ان سنّی بادشاہوں کے عہد میں بھی جو عزاداری کے مخالف نہ تھے۔ اس لیے یہ کہنا غلط ہے کہ دکن کی اسلامی سلطنتوں نے دانستاً عزاداری کے ذریعہ مرہٹوں اور ہندوؤں کو اپنے ساتھ ملایا۔ اب رہا یہ خیال کہ عزاداری مرہٹی رسوم کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ قطعی غلط ہے۔ یہ غلط فہمی مسلمانوں میں عام طور پر پھیلی ہوئی ہے لیکن یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ہندوؤں اور مرہٹوں میں نہ علم سے ملتی جلتی کوئی چیز ہے نہ گہوارہ۔ نہ تعزیہ، نہ شبیہ وغیرہ اگر گنپتی کی صورت میں ہے تو یہ بہت بعد کی پیداوار ہے یعنی بیسویں صدی میں لوکمانیہ تلک نے اس رسم کو جاری کیا۔ دوسرے یہ کہ گنپتی شبیہ نہیں بلکہ بت ہے۔ جو شیعیت تو شیعیت اسلام ہی میں حرام ہے۔ دکن کے مسلمانوں کی زبان و تہذیب پر مرہٹی اثر ہوا ہو تو ہوا ہو۔ لیکن عزاداری اس سے مستثنیٰ ہے۔ بلکہ مرہٹوں پر شیعوں کا اثر ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اور وہ بھی تہہ دل سے عزاداری کرنے لگے۔ اور کوئی تعجب خیز امر نہیں کہ لوکمانیہ تلک نے اپنی قوم کے عزاداری کی طرف دلی جھکاؤ کو دیکھتے ہوئے ہی گنپتی کی رسم شروع کی ہو۔ تاکہ انہیں

اسلامی اثرات سے محفوظ رکھا جاسکے اور ہندو مذہب کا تحفظ کیا جاسکے۔ کیونکہ عزاداری کی تاریخ تو خود بتاتی ہے کہ یہ تیمور کے زمانہ کی چیز ہے جس کا مرہٹی اثرات سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ اس عزاداری میں جو غیر شیعہ مسلمان یا غیر مسلم اقوام نے حصہ لینا شروع کیا تو انہوں نے ہولی کی طرح سوانگ وغیرہ قسم کی چیزوں کو رواج دیا۔ لیکن یہ شیعی عزاداری کا جزو نہیں ہے۔ اور نہ ہی شیعہ اسے پسند کرتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ دکن میں عزاداری مرہٹی اثرات کا نہیں بلکہ ایرانی اثرات کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر جعفر رضا ہمارے اس خیال کی تائید میں فرماتے ہیں۔

"ہندوستان میں عزاداری کا رواج ایرانی اثرات کے تحت ہوا۔ اور چونکہ شمالی ہند کے مقابلے میں دکن میں ایرانی تہذیب کا اثر پہلے نمایاں ہوا۔ اس لیے فطری طور پر وہیں عزاداری و مرثیہ گوئی کا رواج ہوا۔"

(اردو مرثیہ کی روایت۔ ۱۵)

پروفیسر مسیح الزماں کا خیال ہے کہ ایرانی دکن پہنچے تھے۔ وہ اپنے ساتھ اپنی تہذیبی روایتیں، رسم و رواج، معتقدات و خیالات لے کر آئے تھے۔ اس لیے ناممکن ہے کہ ان کے آنے کے بعد جلد ہی عزاداری نہ شروع ہوگئی ہو۔

جان ہالسٹر اور ڈاکٹر رشید موسوی بھی اس خیال کے حامی ہیں کہ

"(اثنا عشری) علماء کے علم و فضل کے ساتھ ساتھ ان کے معتقدات کا اثر بھی دربار اور اہلِ دربار پر پڑنے لگا۔ قدیم زمانہ کی سماجی زندگی کی یہ خصوصیت تھی کہ حکمران عوام کے لیے نمونہ ہوتے تھے۔ اس لیے ان کے معتقدات کا اثر بھی لازمی طور پر عوام پر پڑتا تھا۔"

(مجلہ عثمانیہ دکنی ادب ۱۱۱)

چنانچہ یہ اثرات اتنے گہرے پڑے کہ جب محمود گاواں کے قتل کے بعد بہمنی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے اور پانچ خود مختار سلطنتیں (نظام شاہی، عادل شاہی، قطب شاہی، برید شاہی اور عماد شاہی) قائم ہوئیں۔ تو ان سلطنتوں نے شیعی عقائد کی تشریح اور عزاداری کی ترویج و ترقی میں ایسے ہی حصہ لیا جیسے ان کے پیشرو بہمنی حکومت نے لیا تھا۔

عادل شاہی: ان خود مختار ریاستوں میں سب سے بڑی ریاست بیجاپور کی تھی۔ جہاں

ابتداء ہی سے مجالس عزا کا انعقاد ہونے لگا تھا۔ کیونکہ اس خاندان کے نو بادشاہوں میں جنہوں نے تقریباً دو سو سال تک حکومت کی۔ ابراہیم عادل شاہ کو چھوڑ کر تمام شیعہ عقائد کے پیرو تھے۔ اس سلطنت کے بانی یوسف عادل شاہ نے ۱۴۹۰ء میں خود مختاری کا اعلان کیا تھا۔ یوسف عادل شاہ کے متعلق جان ہالسٹر لکھتا ہے کہ وہ جارجیا سے ایک غلام کی حیثیت سے محمود گاواں کی خدمت میں لایا گیا تھا۔ بعد میں محمود گاواں نے اسے اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا۔ (Shias of India pg.112)۔ یہ محمود گاواں کی تربیت و سرپرستی ہی کا نتیجہ تھا کہ یوسف عادل شاہ شروع ہی سے شیعیت کی طرف راغب تھا۔ اور اپنے مسلک سے اسے اس قدر محبت تھی کہ اس نے تخت نشینی کے فوراً بعد ہی مذہب شیعہ کو حکومت کا مذہب قرار دیا۔ نیز یہ اعلان بھی کر دیا کہ اس کی حکومت میں اذان کے ساتھ حضرت علیؑ کے خلیفہ بلافصل ہونے کا کلمہ بھی شامل کر دیا جائے۔ اور منبر پر چار خلیفہ کے بجائے ۱۲ اماموں کے نام پڑھے جایا کریں۔ (دکن میں مرثیہ اور عزاداری۔ ۵۳)

چنانچہ فرشتہ لکھتا ہے۔

"داو نخستیں کیست در ہندوستان خطبۂ اثنی عشری علیہم الصلوٰۃ والسلام خواندہ و مذہب شیعہ رواج داد"۔ (تاریخ فرشتہ جلد ۲ صفحہ ۱۱)

بادشاہ کے اس مذہبی انہماک سے صاف ظاہر ہے کہ اس دور میں عزاداری حکومت کی سرپرستی میں ہوتی تھی۔ اس کا ایک ثبوت نعلِ مبارک کا جلوس ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ آنحضرت ﷺ کا خود مبارک جو معرکۂ کربلا میں حضرت سید الشہداؑ کے فرق منور پر تھا۔ اس کی بنی کا ایک ٹکڑا جو میدان کارزار میں گر پڑا تھا۔ وہ کسی زائر کے ہاتھ لگا۔ اور اقتدارِ زمانہ کے ہاتھ دست بدست ہوتا ہوا بادشاہ بیجاپور عادل شاہ کے پاس پہنچا۔ بادشاہ نے اس کو ایک نقرئی تعویذ میں بند کرا کے اوپر سے صندل چڑھا کر لفظ اللہ کی صورت کا علم بنوایا۔ اور عشرۂ محرم میں دار السلطنت بیجاپور میں ایستادہ کیا جانے لگا۔ جب وہ سلطنت مغلوں کے قبضے میں آئی تو یہ علم حیدرآباد لایا گیا۔ اور شب عاشورہ نعل صاحب کی سواری کے نام سے اس کا جلوس نہایت تزک و احتشام سے نکلتا رہا۔ (واقعات مملکت بیجاپور جلد سوم صفحہ ۵۴۵)

علی عادل شاہ اوّل کے متعلق بھی جو واقعات ملتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ

عزاداری کی طرف کافی رغبت رکھتا تھا۔اور چونکہ اسے فن تعمیر کا شوق بھی تھا لہٰذا اس کے عہد کی عمارتوں میں ایک عمارت باغ دوازدہ امام (۱۵۶۲ء) کا ذکر بھی ملتا ہے اس عمارت کی تفصیل جو واقعات مملکت بیجاپور جلد اول صفحہ ۱۵۴ کے حوالے سے نصیر الدین ہاشمی نے دی ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے یہ عمارت عزاداری کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔(دکن میں اردو صفحہ ۔۲۸۷)

ڈاکٹر اعجاز حسین نے بھی علی عادل شاہ کے عہد کی ایک مسجد کا ذکر کیا ہے جو دو نہروں کے درمیان بنائے ہوئے ایک باغ میں تعمیر کی گئی تھی۔اس کا نام علیؑ ابن ابی طالب 'اسد اللہ الغالب' کے نام پر مسجد غالب رکھا گیا تھا۔اس مسجد میں شیعی عقائد کا اثر یوں نمایاں تھا کہ اس میں ایک ہزار تینتیس ۱۰۳۳ چراغ دان تھے۔ یہ تعداد بھی بہ لحاظ ابجد لفظ غالب کے اعداد پر مبنی تھے۔(اُردو شاعری کا سماجی پس منظر۔۹۴)

ایک اور عادل شاہی حکمران ابراہیم عادل شاہ ثانی تو سفر ہو یا حضر' میدان جنگ ہو بادشاہی محل' عزاداری کا خاص طور پر خیال رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ جب ابراہیم نظام شاہ کے ساتھ اس کی جنگ ہوئی۔تب بھی اس کے دربار کا مورخ ابوالقاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ

"چونکہ ماہ ذی الحجہ (۱۰۰۴ھ) کی بیسویں تاریخ ہوگئی۔عدالت پناہ حضرت شہید کربلا کی عزاداری میں مشغول ہوئے۔" (تاریخ فرشتہ جلد چہارم اردو ترجمہ صفحہ ۱۵۰)

یہی نہیں بلکہ وہ تعزیہ بھی رکھتا تھا۔جس کا ثبوت فرشتہ کی اس تحریر سے ملتا ہے۔

"غرۂ محرم (۱۰۰۵ھ) کو معلوم ہوا کہ میر محمد صالح ہمدانی بیجاپور تشریف لائے ہیں عدالت پناہ نے میر محمد صالح کو پیغام دیا کہ میں نے آپ کے جدّ بزرگوار کا تعزیہ رکھا ہے اگر جناب خود بھی تشریف لائیں تو بعید از احسان و عقیدت مندی نہ ہوگا۔" (تاریخ فرشتہ ۱۵۱)

اس کا جانشین محمد عادل شاہ نہ صرف علم پرور تھا بلکہ مذہبی شوق و شغف بھی رکھتا تھا۔وہ ہر روز گھنٹوں علماء اور شعراء سے علمی و مذہبی بحثیں کرتا تھا۔

علی عادل شاہ ثانی نہ صرف عزاداری کرتا تھا۔بلکہ خود بھی مرثیہ کہتا تھا۔اسی لیے اس کے زمانہ میں مرثیہ کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔اور بڑے بڑے مشہور شاعروں نے مرثیے کہے۔علی

عادل شاہ نے بہت سے محل تعمیر کرائے تھے۔جن میں ایک حسینی محل بھی تھا۔(بحوالہ عبدالقادر سروری اردو کی ادبی تاریخ صفحہ ۹۱)

اس کے علاوہ رائچور کے علاقے میں پرانگٹور کے قلعہ کے باہر دریائے کشنا کے کنارے ایک عاشورہ خانہ تھا۔جو حسینی علم کے نام سے مشہور تھا(واقعات مملکت بیجاپور صفحہ ۱۶۵) بیان قلعۂ بیجاپور صفحہ ۳۱۳ پر مرقوم ہے۔

"آثار شریف کے پاس عاشورہ خانہ کی پختہ قدیم عمارت ہے جس میں عادل شاہوں کے وقت کے علم موجود ہیں۔"

مشہور شاعر نصرتی کے "علی نامہ" سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نامور محل میں عاشورہ میں علم ایستادہ کئے جاتے تھے۔اور ہر علم پر ایسی زرق برق پوشاک ہوتی تھی۔ جسے دیکھ کر آنکھیں چندھیاتی تھیں۔ان پر سہرے باندھے جاتے تھے۔جب بادشاہ بزم عزا میں شریک ہوتا تھا تو خاص و عام پر اس کی بخشش اور داد و دہش کے دروازے کھل جاتے تھے خوبصورت پیالیوں میں شربت اور تھالوں میں نقل سجائے جاتے تھے۔مرثیہ خوان ایسے موثر انداز میں مرثیے پڑھتے تھے کہ لوگ اپنے ہوش و حواس گم کر دیتے تھے۔اور سارے ماحول پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔نو دن اور نو راتیں اسی طرح عزاداری کی رونق برقرار رہتی تھی۔اور شب عاشورہ بادشاہ کے حکم سے علم شہر میں گشت کے لیے نکالے جاتے تھے۔بادشاہ بھی اس ماتمی جلوس میں شامل ہوتا تھا۔اس جلوس میں بے شمار چراغ بھی ساتھ ساتھ ہوتے تھے جن کے گرد خوبصورت جالیاں لگی ہوتی تھیں۔ان علموں کے ساتھ فوج بھی ہوتی تھی۔ شدّوں کے اوپر جو چھتریاں لگائی جاتی تھیں۔ان پر رنگا رنگ پھول ہوتے تھے۔علموں پر بھی بے حساب پھول باندھے جاتے تھے۔لوہے کے بڑے بڑے الاؤ بھی دہکتے رہتے تھے جب تک علم گشت کرتے تھے۔روشنی میں اضافہ ہوتا رہتا تھا۔یہاں تک کہ ماتمی جلوس اپنے مقام پر پہنچ جاتا تھا۔

چونکہ دکنی ریاستوں میں عادل شاہی حکومت سب سے زیادہ طاقتور اور منظم تھی۔اور بادشاہ خود عزاداری کے محرک اور سرپرست تھے۔لہٰذا امراء و فقراء سے لے کر عوام تک بھی عزاداری میں حصہ لیتے تھے۔اور یہی حال دوسری سلطنتوں کا بھی تھا۔نظام شاہی اور قطب شاہی

حکومتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نظام شاھی : نظام شاہی کی حکومت کی بنیاد احمد نظام شاہ نے ڈالی جس نے ۱۴۹۰ء میں خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ یہ حکومت ۱۶۳۳ء تک باقی رہی۔ یوں تو اس سلطنت میں تقریباً بارہ بادشاہ گذرے۔ جنہوں نے شیعی عقائد کی تشریح اور ترویج و ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ نیز اپنی قلمرو میں عزاداری کو رواج دیا۔ لیکن اس سلسلے میں سب سے نمایاں نام برہان نظام شاہ کا ہے۔

برہان نظام شاہ کے مذہب شیعہ کو اختیار کرنے اور پھر اس کے فروغ کی کوشش کے سلسلے میں فرشتہ نے برہان شاہ کا ایک خواب بیان کیا ہے جس کی دیگر مورخوں نے بھی تصدیق کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ برہان نظام شاہ کا بیٹا شہزادہ عبدالقادر بادشاہ کا سب سے چھوٹا لڑکا تھا۔ اور بادشاہ اسے بے حد چاہتا تھا۔ اتفاق سے وہ تپ محرقہ میں گرفتار ہوا اور اس قدر علیل ہوا کہ علاج سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اور مرض بڑھتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ بادشاہ نے شہزادے کی صحت کے لیے مندروں اور بت خانوں میں بھی نذریں مانیں۔ صدقے بھیجے۔ لیکن پھر بھی افاقہ نہ ہوا۔ اس موقعہ پر شیعوں کے عالم شاہ طاہر جو تقیہ میں بسر کرتے تھے۔ وہاں موجود تھے۔ انہوں نے بادشاہ سے اپنی جاں بخشی کے ساتھ ساتھ عہد لیا کہ اگر شہزادہ عبدالقادر کو خدا آج کی رات شفا بخشے تو ائمہ معصومین کی راہ میں مال و دولت خیرات کریں گے۔ نیز ان کی اولاد یعنی سادات کی نذر کریں گے۔ بادشاہ نے یہ عہد کر لیا۔ اس رات بادشاہ نے خواب میں دیکھا کہ ایک بہت ہی نورانی صورت بزرگ تشریف لاتے ہیں اور ان کی داہنی جانب بھی چھ بزرگ ہیں اور بائیں جانب بھی چھ بزرگ۔ یہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اور ائمہ اثنا عشری تھے۔ حضور ﷺ نے بادشاہ سے فرمایا۔

''اے برہان شاہ! سنو خدائے تعالیٰ نے علیؑ اور ان کے فرزندوں کی برکت سے تمہارے فرزند عبدالقادر کو شفا بخشی۔ اب تم کو چاہیے کہ میرے فرزند شاہ طاہر کے حکم سے باہر نہ ہونا جو کچھ انہوں نے کہا ہے اور جو آئندہ کہیں اسی پر عمل کرنا۔''

صبح شہزادہ واقعی صحت یاب ہو گیا۔ برہان شاہ نے شکر خدا بجا لایا۔ اور مُلا طاہر کے ہاتھوں پر مذہب امامیہ اثنا عشر قبول کر لیا۔ پھر ملا طاہر کے مشورے پر دیگر علمائے دین سے مناظرے رکھے گئے۔ اور آخرکار شاہ طاہر کی تبلیغ سے اکثر علمائے اہل سنت ارکان دولت نیز ہندی'

ترکی وحشی غلاموں' امیروں' منصب داروں' فوجیوں (جن کی تعداد تقریباً تین ہزار تھی) نے مذہب شیعہ اختیار کر لیا۔ چنانچہ فرشتہ لکھتا ہے

''در سنہ اربع واربعین وتسعمانہ برہان شاہ بہ دلالت وارشد شاہ طاہر' محبت اہلِ بیت اختیار کردہ۔ نام خلفائے ثلثہ از خطبہ بینداخت و چوں نشانِ دوازدہ امام علیہم السلام سبز بود و فرادی قیامت نیز علم حضرت رسالت پناہ سبز خواہد بود ہر آئینہ براہ نمونی' شاہ طاہر چتر و روایاتِ خود سبز گردانید۔''

برہان نظام شاہ کے اس خواب نے اتنی شہرت حاصل کی کہ مذہب شیعہ کو غیر معمولی ترقی ہونے لگی۔ بڑے بڑے علمائے و محققینِ اہل سنت سے اس کے متعلق استفسار کیا گیا۔ لیکن کوئی اس کی حقیقت سے انکار نہ کر سکا۔ البتہ برہان نظام شاہ سے خواب میں حضور ﷺ نے کچھ فرمایا تھا اس کی مختلف تاویلیں پیش کی گئیں۔ (دکن میں مرثیہ اور عزاداری۔ ۵۶)

ان تاویلوں کا جواب مولوی سید علی حیدر نے بڑی تفصیل سے اپنی کتاب حضرت ابوبکر میں صفحہ ۳۹۱۔۳۸۶ کے حاشیوں میں دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر رشید موسوی نے شاہ طاہر کو اسماعیلیہ خاندان کا ایک فرد بتایا ہے۔ لیکن عقائد کے اعتبار سے وہ شیعہ امامیہ اثنا عشری تھے۔ جیسا کہ فرشتہ کے مندرجہ بالا بیان اور برہان شاہ کے خواب سے ظاہر ہے۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ شاہ طاہر کی وجہ سے دکن میں اور خاص طور پر نظام شاہی سلطنت میں شیعیت کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ کیونکہ شاہ طاہر نے نظام شاہی دربار میں رسوخ و اقتدار پاتے ہی گرد و نواح سے شیعوں کو بلانا شروع کیا۔ اور عراق' خراسان' فارس' گجرات آگرہ وغیرہ سے شیعہ عالموں کو شاہی رقومات دے کر مدعو کیا۔ چنانچہ اسماعیل صفوی' خواجہ معین الدین صاعدی' شاہ حسن انجو' شاہ جعفر (برادر شاہ طاہر) مُلا شاہ محمد نیشاپوری، ملا علی گل استر آبادی، ملا رستم جرجانی' ملا علی ماژندرانی' ایوب ابوالبرکہ' ملا عزیز اللہ گیلانی' ملا محمد امامی استرا آبادی وغیرہ برہان شاہ کے دربار میں جمع ہو گئے۔ اس زمانہ میں احمد نگر دوسرا ایران ہو گیا۔

اس کے علاوہ برہان شاہ نے اپنی بیٹی کی شادی سید حسن مولا سے کر دی جو شیعہ مدنی تھا۔ اور کربلا اور نجف کو بہت سا روپیہ بھیجا۔ وہاں کے زائرین کے لیے وظائف مقرر کیے۔ خود

برہان نظام شاہ کا انتقال (۱۵۵۳ء) میں ہوا تو اس کی میت کربلا میں بھیج دی گئی۔

غرضیکہ یہ تمام بادشاہ شیعیت کی طرف ایسے راغب تھے کہ جنگ کے موقع پر بھی اپنے عقیدے کو فراموش نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ جب وجے نگر کی ہندو سلطنت سے جنگ ہوئی تو مسلمان بارہ بارہ صفوں میں اور بارہ بارہ کی تعداد میں جاتے تھے۔

قطب شاهی : ۹۱۶ھ میں سلطان قلی نے خودمختاری کا اعلان کیا۔ اور گولکنڈہ کو اپنا پایہ تخت قرار دیا۔ اس خاندان میں آٹھ بادشاہ گزرے۔ جنہوں نے تقریباً دوسو سال تک حکومت کی۔ یہ تمام بادشاہ شیعہ عقائد کے پیرو تھے۔ لہٰذا ان کے دور حکومت میں مراسم عزاداری کو کافی فروغ اور شیعیت کو بے حد تقویت حاصل ہوئی حالانکہ قطب شاہی حکومت سے پہلے محرم دکن میں منایا جاتا تھا۔ مگر قطب شاہی دور میں چند ایسی روایات بھی شامل ہوگئیں۔ جنہوں نے دکن کی ایک مخصوص تہذیب کو جنم دیا۔ اور سب سے اہم بات یہ ہوئی کہ اس عہد میں عزاداری' قومی یک جہتی اور مختلف المذاہب اقوام کے باہمی میل جول کا ایک زبردست ذریعہ بن گئی۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ نے تو اسے ایک تاریخی اہمیت دے دی۔ چونکہ یہ بادشاہ مذہبی ہونے کے ساتھ ساتھ علم پرور اور ادب پسند بھی تھے۔ لہٰذا ایران کے بہت سے شیعہ علماء ہندوستان آئے۔ جن میں میر محمد مومن استر آبادی بھی شامل ہیں۔ جو سلطان محمد قلی قطب شاہ کے وکیل السلطنت تھے۔ اور تقریباً ۲۵/سال تک اس عہدے پر فائز رہے۔ اسی طرح میر نظام الدین احمد بن معصوم الحسینی شیرازی (جو ایک عالی نسب سید تھے) کی شادی عبداللہ قطب شاہ کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ (رودِ کوثر صفحہ ۶۰)

ان دونوں بادشاہوں نے عاشورہ خانے بھی تعمیر کروائے۔ خصوصاً محمد قلی قطب شاہ نے شاہی محل کے عاشور خانے کے علاوہ ایک اور عاشور خانہ ۱۰۰۳ھ میں تعمیر کرایا تھا۔ جس پر ساٹھ ہزار روپے خرچ ہوئے تھے۔ (مقدمہ کلیات قلی قطب شاہ از ڈاکٹر زور صفحہ ۱۰۷)

اس کے علاوہ حیدرآباد کے محلہ دبیر پورے کے اندر ایک قدیم عزاخانے میں پسران حضرت مسلم کا تابوت رکھا ہوا ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ حسینیہ مبارک قطب شاہی عہد کا تعمیر شدہ ہے۔ حکومت کی طرف سے عزاداری کے لیے دو اور عمارتیں مخصوص تھیں۔ ایک محل کے اندر اور دوسری

بازار میں۔ ان دونوں عزاخانوں کے وسیع و عریض صحن میں سیاہ اور سبز اونی قالینوں کا فرش تھا۔ اور زرد رنگ کے مخمل کی چھت گیریاں لگی ہوئی تھیں۔ دیواروں پر کاشی کا کام بنوایا ہوا تھا۔ جس میں نقش و نگار کے ساتھ بڑی صناعی سے بارہ اماموں سے منقول دعائیں رقم تھیں۔ اور ان دونوں عزاخانوں میں چودہ چودہ علم اور چودہ معصوموں کے نام لگائے گئے تھے۔ یہ علم فولاد کے بنے ہوئے تھے۔ اور انہیں سونے چاندی سے مرصع کیا گیا تھا۔ ان علموں کے پٹکے چودہ چودہ ہاتھ کے لمبے زربفت کے ہوتے تھے۔ جن پر دعائیں اور شعراء کے اشعار جو مدح اہل بیت میں ہوتے تھے لکھوائے گئے تھے۔ ان دونوں امام باڑوں کی دیواروں میں چھوٹے چھوٹے طاقوں کی دس قطاریں تھیں۔ اور ہر طاق میں چراغ رکھنے کی جگہ بنائی گئی تھی۔ دوسری محرم کو پہلی اور دوسری صف کے چراغ روشن ہوتے تھے۔ تیسری محرم کو تیسری قطار کا اضافہ کر دیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ دس محرم کو دس قطاریں ہو جاتی تھیں۔ ان تمام چراغوں کی تعداد دس ہزار سے زیادہ تھی۔ اس کے علاوہ بعض جھاڑ نما چراغ بھی ہوتے۔ جن میں ایک سو بیس شمعیں روشن تھیں۔ اور یہ بڑے شمع دان اور کافوری شمعیں ایوان کے برابر رکھی جاتی تھیں۔ یہاں ہر لمحہ عزاداروں کا مجمع لگا رہتا تھا۔

مرزا نظام الدین احمد شیرازی نے عبداللہ قطب شاہ کے دور کے مراسم عزاداری کا بیان بڑی تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب "تاریخ حدیقۃ السلاطین" میں کیا ہے۔ مرزا کے بیان کے مطابق قطب شاہی عہد میں عزاداری کا یہ حال تھا کہ ادھر ماہ محرم کا غم انگیز چاند آسمان پر نمودار ہوتا۔ ادھر بادشاہ اور تمام رعایا مکمل عزادار اور سوگوار ہو جاتے تھے۔ بادشاہ تخت سلطنت سے نیچے اتر آتا تھا۔ اور پورے دس دن سر پر تاج نہیں رکھتا تھا۔ بلکہ برہنہ سر رہتا تھا۔ عیش و عشرت کی محفلیں موقوف کردی جاتی تھیں۔ اور خود بادشاہ اپنا شاہی لباس اتار کر سوگواروں کا سا لباس پہن لیتا تھا۔ تمام قلمرو میں یہ حکم دے دیا جاتا تھا کہ سامان عیش و نشاط ختم کر دیئے جائیں۔ بزم آرائیاں بند ہوں۔ عشرہ بھر کے لیے گانا بجانا، گوشت اور پان کا استعمال وغیرہ قانونی طور پر ممنوع قرار دیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ نائیوں کو بھی حکم ہوتا تھا کہ وہ دس دن تک کسی کی اصلاح نہ کریں۔ نہ بال کاٹیں۔ نشہ آور چیزیں خصوصاً قطعی طور پر ممنوع قرار دی جاتی تھیں۔ آلات موسیقی پر غلاف چڑھا دیئے جاتے تھے۔ ہر قسم کی جائز و ناجائز لذتوں اور آسائشوں کو بادشاہ خود بھی ترک کر دیتا تھا۔ شاہی جامداء

خانے سے کالے اور نیلے رنگ کے کئی ہزار جوڑے امراء، وزراء نیز درباریوں' ملازموں' ذاکروں اور مرثیہ خوانوں کو تقسیم کیے جاتے تھے۔

عصر کے وقت بادشاہ خود سوگوارانہ لباس میں قصر شاہی سے شاہی امام باڑے کی طرف گھوڑے پر یا سیاہ اطلس کے سنگھاسن پر سوار ہوتا۔ اس کے ساتھ تمام مصاحب درباری' امراء اور وزراء وغیرہ سبھی سیاہ لباس میں ہوتے۔ راستہ بھر دو خوش آواز مرثیہ خوان بادشاہ کے تصنیف کردہ مرثیے پڑھتے ہوئے چلتے۔ اور جب بادشاہ کی سواری امام باڑہ تک پہنچتی تھی تو وہ پا برہنہ اور پیادہ ہو جاتا تھا۔ اور بڑے احترام اور ادب سے امام باڑہ کے اندر داخل ہوتا تھا اور علموں پر پھولوں کے ہار چڑھاتا۔ عزاخانہ کے سامنے والی کافوری شمعیں اور چراغ اپنے ہاتھ سے روشن کرتا۔ اس وقت فصیح و بلیغ ذاکر فضائل آئمہ پڑھنے میں مشغول ہو جاتے۔ اور فاتحہ پڑھنے کے بعد بادشاہ کی درازی عمر اور استحکام حکومت کی دعا مانگتے۔ پھر بادشاہ تعظیمی سجدہ کر کے محل سرا واپس چلا جاتا تھا اور تمام امراء و وزراء وہیں بیٹھ جاتے تھے۔ اور ذکر اہل بیت کرتے تھے۔ مجلس کے اختتام پر حاضرین کو کھانا پیش کیا جاتا تھا۔ اور اس کے بعد کیوڑہ اور گلاب پڑا ہوا شربت پلایا جاتا تھا۔ اس کے بعد طشتری میں گوٹا پیش کیا جاتا۔ جو پان کی جگہ پر کھایا جاتا تھا۔ عزاداری کا یہ سلسلہ نصف شب تک یونہی چلتا تھا۔

محرم کی چھٹی شب کو دولت خانہ شاہی کے باہر والے امام باڑے کے علم جس کا انتظام کوتوال شہر کے ہاتھوں میں ہوتا تھا محل کے سامنے والے وسیع میدان میں نکالے جاتے تھے راستوں اور بازاروں میں چراغاں کیا جاتا تھا۔ ان علموں کے ساتھ تابوت اور ضریحیں بھی نکالی جاتی تھیں۔ اس جلوس میں ہر قوم و ملت کے افراد شرکت کرتے تھے۔ اور ہر ایک کے ہاتھ میں کافوری شمع ہوتی تھی۔ جب یہ جلوس داد محل کے قریب پہنچتا تھا تو پورا مجمع علموں کے گرد حلقہ بنا کر سینہ زنی کرتا تھا۔ اس موقعہ پر خود بادشاہ بھی سینہ زنی میں شریک ہوتا تھا۔ یہیں پر یہ جلوس بعد فاتحہ ختم ہو جاتا تھا۔

ساتویں شب کا جلوس خصوصی حیثیت رکھتا تھا۔ اس شب کو علم حیات آباد (حیات بخشی بیگم والدہ عبداللہ قطب شاہ کے مکان) سے اٹھتے تھے۔ ان کے ساتھ بے شمار

چراغ فانوس اور مشعلیں ہوتی تھیں۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ اس میں شرکت کرتے تھے۔ یہ جلوس جب شاہی قصر تک پہنچتا تھا۔ تو بادشاہ بہ نفس نفیس بلندی سے کھڑے ہو کر ماتم داروں کو دیکھتا تھا۔ اور پھر ان کے لیے گوئے کے خوان بھیجتا تھا۔ اس جلوس میں شریک تمام ماتم دار سیاہ لباس میں ملبوس ہوتے تھے۔

ساتویں محرم کی صبح کو بادشاہ ندی محل میں جاتا۔ اور اس محل کی شہ نشیں پر کھڑا ہو جاتا۔ ایران اور ہندوستان کے تمام سفراء مدعو کیے جاتے۔ تمام اہل دربار و ملازمین سیاہ پوش ہوتے۔ بادشاہ مختلف امام باڑوں کے علموں کو دروازۂ دوازدہ امام سے اندر طلب کرتا۔ جلوس علم کے تمام شرکاء کو اذن عام ہوتا۔ بادشاہ تمام محلوں کے علموں کی ترتیب وار زیارت کرتا۔ اس وقت شیون و گریہ بپا رہتا۔ بادشاہ خود بھی مصائب اہل بیت پر گریہ کناں ہوتا۔ اور پھر ہر علم پر ایک ریشمی پھریرا چڑھا کر اس کے خادموں کو روپے کی ایک تھیلی پیش کرتا۔ پھر یہ تمام علم ظہر کے وقت واپس چلے جاتے۔

محرم کی آٹھویں شب کو بھی بادشاہ اسی طرح داد محل سے شاہی امام باڑے کی طرف جاتا۔ علموں پر پھول چڑھاتا۔ شمعیں روشن کرتا اور مجلس عزا میں شرکت کرتا۔

نویں شب کو بادشاہ شاہی امام باڑے کے علم آراستہ کرنے کے بعد اپنے ہاتھ سے کافوری شمعیں درباریوں' مقربوں' حاجیوں اور سپاہیوں کو تقسیم کرتا۔ اس کے بعد علم اٹھتے تھے۔ اور جلوس اس ترتیب سے روانہ ہوتا تھا کہ آگے سرخیل شاہی بادشاہ کی خاص تلوار لیے ہوئے اور پیچھے تمام اہل دربار اعیانِ دولت اور اکابرین سلطنت شمعیں ہاتھوں میں لیے ہوئے ہوتے تھے۔ یہ تمام شمعیں اور چراغ اس طرح روشن کیے جاتے تھے کہ روشنی کے طاق' محراب' درخت اور جانور وغیرہ بن جاتے تھے۔ یہ جلوس دربار والے میدان تک جاتا تھا۔ بادشاہ اس چوڑی دیوار پر جس کے قریب سے علم جاتے تھے۔ تقریباً پانچ سو قدم علموں کے ساتھ چل کر ان چار بلند محرابوں میں سے ایک پر پہنچ جاتا تھا۔ پھر اسی طرح دیوار دیوار علموں کے ساتھ واپس ہو جاتا تھا۔

صبح عاشورہ علم اٹھتے اور شاہی امام باڑے کو جاتے تھے۔ بادشاہ ان علموں کے ساتھ سیاہ لباس زیب تن کیے سر و پا برہنہ اعیان سلطنت کے ہمراہ پا پیادہ چلتا تھا تمام وزراء' امراء' ملازمین' اہل

دربار اور عوام سیاہ لباس میں ہوتے تھے۔ اور سب بادشاہ ہی کی طرح ننگے سر ننگے پاؤں ہوتے تھے۔ اس جلوس میں ملازموں کی ایک جماعت نوحہ خوانی کرتی تھی۔ اور ذاکروں اور مداح خوانوں کا ایک گروہ علموں کے آگے آگے ہوتا تھا۔ تقریباً تین ہزار قدم کا فاصلہ پیدل طے کر کے بادشاہ اس مسجد میں قدم رکھتا تھا۔ جو شاہی امام باڑے کے قریب تھی۔ وہاں مجلس عزا برپا ہوتی تھی۔ ختم جلوس کے بعد پورا دن بادشاہ اسی مسجد میں عبادت و زیارت عاشورہ اور نمازوں میں مشغول ہو جاتا تھا اور شاہی حکم کے مطابق دو سو یتیم و بیسر سید زادوں کو بادشاہ کی طرف سے ایک نفیس پوشاک اور کچھ نقد دیا جاتا تھا۔

محرم میں ایک اور یادگار رسم لنگر کی تھی۔ جسے حیات بخشی بیگم نے جاری کیا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ سلطان عبداللہ قطب شاہ زمانۂ شہزادگی میں ایک مرتبہ تیرھویں ذی الحجہ کو من مورت نامی ہاتھی پر سوار ہو کر نکلا۔ یکا یک ہاتھی مست ہو گیا۔ اور جنگل کی طرف بھاگ نکلا۔ ملکہ حیات بخشی بیگم بہت پریشان ہوئی۔ جنگل کے درختوں میں کھانے کے توشے اور پانی کی صراحیاں بندھوا دیں۔ تاکہ شہزادے کا ہاتھی ادھر سے گذرے تو شہزادہ کھا پی سکے۔ اور منت بھی مانی کہ اگر شہزادہ سلامتی کے ساتھ واپس آ جائے گا تو سونے کا لنگر ہاتھی کے لنگر کے ہم وزن بنا کر حسینی علم پر چڑھاؤں گی اور غرباء میں تقسیم کرونگی۔ ایک ماہ تین دن کے بعد سولھویں محرم کو ہاتھی کی مستی کم ہوئی۔ شہزادہ صحیح سلامت گھر واپس آیا۔ حیات بخشی بیگم نے منت کے مطابق بارہ سیر سونے کا لنگر شہزادے کی کمر سے باندھ کر جلوس کے ساتھ حسینی علم کو لے جا کر غرباء میں تقسیم کر دیا۔ اس واقعہ کی یادگار میں محرم میں لنگر نکالا جاتا تھا۔ (رشید الدین خانی صفحہ ۳۱۳)

تمام سلطنت میں ہر شہر اور ہر قصبہ میں اسی طرح عزاداری ہوتی تھی۔ ایام عاشورہ کے لیے شاہی دفتر میں عزاداری کے حساب کر کے کل رقم عہدہ داروں اور عاملوں سے مُجرا کر لی جاتی تھی۔ یہی حال عوام کا تھا۔ گھر گھر عزاداری ہوتی تھی۔ لوگ نہا دھو کر علم اٹھاتے تھے۔ نذر و نیاز کرتے تھے۔ تعزیہ داری عام تھی۔ مجالس عزا گھر گھر منعقد ہوتی تھیں۔ جس میں ہندو مسلمان، شیعہ سنی بلا تخصیص مذہب و ملت حصہ لیتے تھے۔

عہد مغلیہ : ابھی عہد قطب شاہی میں عزاداری کی یہ بہار اپنے عروج پر تھی کہ زوال کا نقیب

پکارا۔ اور نتیجتاً ۱۶۸۶ء میں بیجاپور اور ۱۶۸۷ء میں گولکنڈہ پر اورنگ زیب کا قبضہ ہو گیا۔ دکن کی ان شیعہ حکومتوں کے خاتمہ کے باوجود بھی عزاداری کا خاتمہ نہیں ہو سکا۔ کیونکہ وہ عوام کی رگ رگ میں بس چکی تھی۔ اور مغلیہ سپاہی اگر چاہتے بھی تو اس کو ختم نہیں کر سکتے تھے۔ اسی لیے تو اورنگ زیب نے کہا تھا۔

"خشت خشت حیدر آباد رافضی ہست" لہٰذا صرف اتنا ہوا کہ عوام عزاداری کے معاملہ میں حکومت کی سرپرستی سے محروم ہو گئے۔ کیونکہ بہت سے مراسم عزاداری جو خاص شاہی سرپرستی میں ادا کئے جاتے تھے۔ بند ہو گئے۔ مجلسوں اور علموں کے جلوس میں بادشاہ شریک نہیں ہوتا تھا۔ شاہی ذاکر اور مرثیہ خواں بھی موقوف ہو گئے۔ حکومت کی طرف سے مجاوروں کو جو امداد دی جاتی تھی۔ وہ بند ہو گئی۔ گوشت کی فروخت بھی ایام محرم میں بحال کر دی گئی۔ پان اور دوسرے لوازمات پر بھی پابندی نہ رہی۔ البتہ عوام اب بھی باقاعدہ عزاداری کرتے تھے۔ جلوس نکالتے تھے۔ علم ایستادہ کرتے تھے۔ اور مجالس عزا منعقد کرتے تھے۔ اور وہ علاقے جو مغلوں کے اثر سے محفوظ تھے۔ مثلاً ارکاٹ، سدھوٹ، ویلور وغیرہ میں قطب شاہی انداز کی عزاداری باقی رہی۔ (اُردو مرثیے کی روایت ۲۳)

آصف جاہی عہد: ہر کمالے را زوالے کے مصداق مغلیہ اثر و اقتدار بھی دکن میں زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکا۔ اور اورنگ زیب کے انتقال کے بعد مغلیہ گرفت ڈھیلی ہونا شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ محمد شاہ کے عہد اور نادری حملے نے مغلیہ سلطنت کو انتہائی کمزور اور کھوکھلا کر دیا۔ اس موقع پر نظام الملک آصف جاہ جو فرخ سیر کے زمانہ میں دکن کے صوبیدار تھے۔ لیکن بعد میں عہد محمد شاہی میں مراد آباد اور پھر مالوہ کی صوبیداری پر منتقل کئے گئے تھے۔ بادشاہ کی غلط فہمی اور سرد مہری سے افسردہ خاطر ہو کر ۱۱۳۶ء میں واپس دکن آئے۔ جہاں دکن کے صوبیدار عماد الملک مبارز خان کی فوج سے شکر کھیرہ کے مقام پر انہیں مقابلہ کرنا پڑا اور بالآخر فتح پا کر ۱۱۳۶ھ میں اورنگ آباد کو مرکز قرار دے کر سلطنت آصفیہ کی بنیاد ڈالی۔ اس سلطنت کے ساتھ ہی دکن سے مغلیہ اثر و اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ اور پھر سے عزاداری کو فروغ حاصل ہوا۔ مزید یہ کہ اس دوران اردو کو پھر

پنپنے اور پھولنے پھلنے کا موقعہ ملا۔ اوراس کے ساتھ ہی مرثیہ خوانی کو بھی ترقی ہوئی اور بہت سے مراسم عزاداری جو قطب شاہی عہد میں رائج تھے۔ اور عہد مغلیہ میں دم توڑ چکے تھے۔ دوبارہ زندہ ہوئے یا کئے گئے لنگر کی رسم پھر سے جاری ہوگئی۔ شاہی امام باڑوں اور عزاخانوں کا انتظام پھر حکومت کی سرپرستی میں ہونے لگا۔ مجاوروں کے وظیفے پھر سے جاری ہو گئے نیز کچھ نئی رسومات کا بھی اضافہ ہوا۔ یہ نئی رسومات سُنّی مسلمانوں میں زیادہ مقبول ہوئیں۔ مثلاً سوانگ رچنا یا محرم کے خاص پکوان جیسے روٹ، چونگے وغیرہ۔

نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے زمانے میں ایرانی نسل شیعہ سردار ارسطو جاہ دیوان مقرر ہوئے۔ وہ ایک باذوق اور مذہبی شخص تھے۔ لہٰذا شیعہ عقائد کے ساتھ ساتھ مرثیہ نگاری کو بھی تقویت پہنچی۔

ارسطو جاہ کے بعد میر عالم حیدرآباد کے صدرالمہام قرار پائے۔ یہ بھی شیعہ عقائد کے پیرو تھے۔ اور سید تھے۔ لہٰذا مراسم عزاداری کی اور زیادہ توسیع و تشہیر ہوئی۔

نواب ناصرالدولہ آصف جاہ رابع کے زمانے میں محرم کے جلوس کو اور وسعت ملی محلہ دبیر پورہ کے حسینیہ سے جو پسران حضرت مسلم کا تابوت رکھا ہوا ہے۔ یہ ضریح مقدس جلوس کے ساتھ چادر گھاٹ تک لے جائی جاتی تھی۔ اور نواب ناصرالدولہ پرانی حویلی سے زیارت فرماتے تھے۔ اس تابوت کے متعلق مشہور ہے کہ حاجت مند مٹی کا کوئی کوزہ یا کلیا لے کر وہاں جاتے تھے اور ضریح کے نیچے سے ایک کنکری اٹھا کر اس میں ڈال دیتے تھے۔ اور سال بھر اپنے پاس حفاظت سے رکھتے تھے۔ پھر مراد بر آنے پر شیر کا کونڈا یا پنچ میل مٹھائی، کچھ نقدی رکھ کے نذر کرتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ گویا شہید کربلا کے قاصد اور اس کے مظلوم بچوں کا فیض تھا۔ اس عہد کے شاعر عقلان کی ایک نظم سے اس زمانے کے مراسم عزاداری کا پتہ چلتا ہے جس میں محرم کے جلوس میں نکلنے والے فقیروں کے گروہوں کی تفصیل درج ہے (مخطوطہ ۱۸۷۲ء ادارہ ادبیات اردو) یہ جلوس شہر کے مختلف راستوں سے گزرتا ہوا قطب شاہی دور کے عاشورہ خانہ حسینی علم کے سامنے جا کر فاتحہ پڑھتا اور منتشر ہو جاتا۔ (دکن میں مرثیہ اور عزاداری ۱۰۹)

مہاراجہ چندو لعل بھی اپنی خودنوشت سوانح ''عشرت کدۂ آفاق'' میں اس زمانہ کے محرم

کا حال اس طرح لکھتے ہیں کہ ''عشرہ محرم میں لوگ خلوص اور عقیدت سے لنگر نکالتے ہیں اور ''حسینی علم''، ''مغل مبارک'' اور ''الاوہ بی بی میں نیازی چڑھاتے اکثر مقامات میں تابوت و علم بھی استاد کئے جاتے اور روشنی کی جاتی ہے۔ خود اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ عقیدت سے آبدار خانہ اور ٹٹی میں قسم قسم کی روشنی کرتے۔ بلوریں جھاڑ اور قندیلیوں کے علاوہ چالیس زجاجی چراغ رنگا رنگ آویزاں کرتے۔ نعل مبارک کی سواری کے ساتھ ساتھ ایک عظیم الشان جلوس میں کئی لاکھ آدمی ہاتھوں میں مشعلیں اور تلواریں لیے شامل رہتے۔ روز عاشورہ موسیٰ ندی کے کنارے لاکھوں کی تعداد میں لوگ جمع ہوتے۔ دوکاندار اپنی دکانیں آراستہ کرتے تھے۔ غرض ہر جگہ ہر گھر میں روضہ خوانی اور تعزیہ داری کا اہتمام ہوتا تھا۔ (ایضاً)

اسی طرح محبوب علی خان آصف جاہ سابع کے زمانہ میں عزاداری میں اور اضافہ ہوا۔ فوجوں میں تعزیئے تیار ہوتے اور دسویں رات کو فوجی جلوس کے ساتھ یہ تعزیئے شہر میں گشت کرتے۔ اور مہاراجہ کی دیوڑھی تک نعرے لگائے جاتے۔ اس کے علاوہ مجالس عزا کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔

سب سے زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اسی زمانہ میں میر انیس (۱۸۷۱ء) میں حیدرآباد کے مشہور شیعہ امیر نواب تہور جنگ کی دعوت پر حیدرآباد آئے۔ اور اس کے ساتھ ہی شمالی ہند سے مرثیہ گو شاعروں کی آمد کا سلسلہ ۱۹۳۵ء تک یونہی جاری رہا۔ جن میں پیارے صاحب رشید، دولہا عروج، مہذب لکھنوی، مودب لکھنوی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح مشہور سوز خوان، عابد علی، نادر صاحب، مجھو صاحب، ولی حیدر، بندہ حسن اور اچھے صاحب وغیرہ نے حیدرآباد میں اپنے اسی زمانہ میں ایک گروہ حیدری ''مچھلی بندر کا ماتمی گروہ'' کے نام سے سینہ زنی کرتا تھا۔ ان کے لیے نظام کے ہاں سے مشاہرہ مقرر کر دیا گیا تھا۔

میر عثمان علی خاں آصف جاہ سادس خود بھی ایک اچھے شاعر اور عالم تھے۔ اور شاعروں کے سرپرست بھی۔ محمد ﷺ و آل محمد ﷺ سے انہیں بے پناہ عقیدت تھی۔ لہٰذا انہوں نے بھی مراسم عزاداری کو رونق بخشنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

اس دور کے مشہور شاعر مرزا جعفر علی، جعفر عیدالاضحیٰ کے بعد سے روزانہ شب کو ''مجلس

ربط'' منعقد کر کے محلے کے نوجوانوں کو جمع کرتے اور سینہ زنی کی مشق کراتے تھے۔ خود نوحہ بھی پڑھتے اور ماتم میں بھی شریک رہتے تھے۔ مجلس کے بعد بالعموم چاء تقسیم ہوتی تھی۔ اور محرم تک یہ مشق جاری رہتی تھی۔ یہ ماتم جسے ''ایرانی گلی'' سے خصوصیت حاصل تھی۔ ''حلقہ کا ماتم'' کہلاتا تھا۔ اور ایامِ عزا کے عشرۂ اول میں محلّے کے اکثر گھروں میں روزانہ صبح و شام بعد مجلس ہوا کرتا تھا۔ اور بلا تفریق مذہب و ملت، دولت و مال سب اس میں شریک ہوتے تھے۔ (دکن میں اُردو۔ ۲۳۹)

۱۹۴۸ء کی پولس کاروائی کے بعد محرم کی تقریبات کے بارے میں ڈاکٹر رشید موسوی لکھتی ہیں۔

> '' محرم کی قدیم روایات میں جو سالہا سال سے چلی آرہی تھیں بہت کچھ تبدیلی ہوگئی۔ چنانچہ علموں کے جلوس اور تعزیئے وغیرہ موقوف کردیئے گئے۔ صرف بی بی کے علم کی سواری کا جلوس جو دسویں محرم کو نکلتا ہے۔ وہ اب تک جاری ہے اس کے علاوہ محرم کی دسویں رات کو نعل صاحب کی سواری کا جلوس نکلتا ہے اور دس محرم کی صبح کو حضرت عباس کے علم اٹھائے جاتے ہیں۔ سالار جنگ کی دیوڑھی کے احاطے میں جو پتھر گٹھی پر واقع ہے ان کی گشت ہوتی ہے۔ اور پھر یہ علم قاعدے کے مطابق عاشورہ خانہ میں بارہ محرم تک لٹائے رکھتے ہیں۔ اس کے بعد صندوقوں میں مقفل کر کے رکھ دیئے جاتے ہیں۔'' (دکن میں مرثیہ اور عزاداری۔ ۲۱۶)

اس کے علاوہ قطب شاہی عہد کا ''بی بی کا علم'' دن میں دو بجے ہاتھی پر عاشور خانے سے نکلتا ہے۔ اور مقرر راستوں سے گذر کر پرانی حویلی میں آتا ہے۔ جہاں نظام کی طرف سے مجلس ہوتی ہے۔ ماتم کیا جاتا ہے۔ اور پھر نذر چڑھائی جاتی ہے۔ آگے بڑھنے کے بعد مجلس بلدیہ حیدر آباد کی عمارت پر میئر بلدیہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ علم کا استقبال کر کے ڈھٹی چڑھاتے ہیں۔ اس کے بعد علم کی سواری عزا خانہ، زہرہ پر ٹھہرتی ہے۔ جہاں ماتمی گروہ ماتم کرتے ہیں۔ اور حضور نظام کی طرف سے نذر چڑھائی جاتی ہے۔ پھر یہ جلوس دار الشفاء کے راستے سے چادر گھاٹ کے پل کے پاس پہنچتا ہے۔ اور علم پر کنویں کا پانی چھڑکا جاتا ہے۔ جسے اصطلاح میں علم کا ٹھنڈا ہونا کہا جاتا

ہے اس کے بعد علم کو کپڑے میں لپیٹ کر مجاور اپنے سر پر رکھ کر واپس عاشور خانے لے جاتے ہیں۔ (ایضاً)

موجودہ دور میں جبکہ نہ وہ سلطنتیں رہیں نہ وہ شاہیاں اور نوابیاں حیدر آباد کی عزاداری اب بھی برقرار ہے۔ حالانکہ اب لوگوں کے نظریات میں فرق آتا جارہا ہے۔ لیکن شیعہ خاندان اب بھی اسی جوش و خروش اور تزک و احتشام کے ساتھ عزاداری کرتے ہیں۔ بعض عقیدت مند سُنّی حضرات بھی اس میں برابر کے شریک ہیں۔

۲۔ دھلی اور عہدِ مغلیہ : شمالی ہندوستان میں مسلمان یوں تو محمد بن قاسم کے حملے کے بعد ہی سکونت پذیر ہونا شروع ہوگئے تھے۔ لیکن سیّدوں کی آمد کا پتہ محمود غزنوی کے عہد سے چلتا ہے۔ دسویں صدی عیسوی میں سلطان محمود غزنوی کے ہمراہ سیدوں کے بہت سے گھرانے ہندوستان آئے۔ اور یہیں آباد ہوگئے۔ اس دوران ایران سے جو صوفیائے کرام تشریف لائے۔ ان میں بھی اکثریت سیدوں کی تھی۔ مثلاً حضرت داتا گنج بخش، سید علی ہجویری، سلطان الہند حضرت خواجہ غریب نواز سید معین الدین چشتی، حضرت محبوب سلطانی، سید نظام الدین اولیاء، سلطان دکن حضرت سید محمد گیسو دراز حضرت سید سالار مسعود غازی، حضرت سید شاہ عالم وغیرہ۔ اسی لیے حضرت امام حسینؑ کے فضائل و مصائب سے انہیں خصوصی دلچسپی تھی۔ جس کا اظہار وہ ہمیشہ کرتے رہے۔ ان میں سے اکثر صوفیائے کرام محرم میں عزاداری کرتے اور سوگوار رہتے۔ لیکن چونکہ ان بزرگان دین کا مقصد بلا امتیاز فرقہ و مسلک اسلام کی تبلیغ کرنا تھا۔ لہٰذا وہ اپنے عقائد کا کھل کر اظہار کم ہی کرتے تھے اور با مسلمان اللہ اللہ با برہمن رام رام کرے اپنا شیوۂ زندگی بنائے رکھا۔ ان بزرگان دین کے علاوہ جو شیعہ ہندوستان آئے وہ یا تو سپاہی کی حیثیت سے آئے یا رکن سلطنت کی حیثیت سے سُنّی سلاطین کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہوئے۔ ان حالات میں دہلی میں شیعوں کی انفرادی حیثیت نہ بن سکی۔ اور وہ عام مسلمانوں کے ہمراہ زندگی گذارتے رہے۔ حکومت کی جانب سے جو علماء عہدے پاتے تھے۔ مثلاً مفتی، قاضی صدر، اور صدر الصدور وغیرہ ان میں بعض جگہ شیعہ بھی فائز کئے جاتے تھے۔ لیکن وہ جو فیصلہ کرتے تھے۔ وہ سب سُنّی فقہ کی رو سے

ہوتے تھے۔ شیعوں کو باقاعدہ مذہبی آزادی حاصل نہ تھی۔ کچھ خوف جان سے، کچھ بادشاہ کی خوشنودی کی خاطر اخفائے مذہب پر عمل پیرا رہے۔ البتہ دہلی میں مغل سلطنت کے قیام کے بعد شیعی اثرات نمایاں اور اقتدار پذیر ہونے لگے۔

ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا بانی ظہیر الدین بابر پانچویں پشت میں تیمور لنگ سے نسبی تعلق رکھتا تھا۔ اور ساری دنیا جانتی ہے کہ تیمور ہی وہ شیعہ حکمراں ہے جس نے ہندوستان میں عزاداری اور تعزیہ داری کو رائج کیا۔ لہٰذا بابر کے عہد میں شیعی عناصر کے وجود پر تعجب کرنا محل حماقت ہوگا۔ بابر نے اپنی سلطنت کے قیام و استحکام کے لیے شاہ اسماعیل صفوی سے مدد لی تھی۔ جس خاندانِ ایران میں شیعیت کے فروغ کے لیے تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی لیے بابر، شاہ اسماعیل کے دربار میں حاضر ہوا تو شیعوں کا مخصوص لباس اور کلاہ پہنی۔ اس ٹوپی میں بارہ گوشے تھے۔ جو شیعوں کے عقیدۂ اثنا عشری کی طرف اشارہ کناں تھے۔ اس نے اپنے تمام سپاہیوں کو اسی قسم کی ٹوپی پہننے کا حکم جاری کیا تھا۔ (Shias of India pg. 12)

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی بابر کے شیعیت کی طرف جھکاؤ کو "سیاسی مصالح" کا نام دیتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

"......ازبکوں کے مقابلے میں شاہ اسماعیل صفوی نے بابر کو گرانقدر مدد دی تھی اور اس کے نتیجے میں بھی مغلوں اور صفویوں کے تعلقات بہت مضبوط ہوگئے تھے۔ بابر یہ بھی جانتا تھا کہ عثمانی ترک ازبکوں کے حلیف ہیں۔ اس لیے وہ ترکی اور ہندوستان کے درمیان میں ایک طاقتور شیعی ایران کو قائم رکھنا چاہتا تھا۔ تاکہ ترک ہمیشہ ایرانیوں سے الجھے رہیں۔ اور ازبکوں اور ترکوں کا اتحاد مغلوں کے لیے خطرہ نہ بن سکے۔" (دبستان دبیر۔ ۱۱۷)

فتح حاصل کرنے کے بعد اس نے ایک سیاسی چال یہ چلی کہ اس زمانہ کے عام حکمرانوں کے برخلاف جو اپنے آپ کو سلطان یا امیر کہلاتے تھے اور خلافت اسلامی کے نائب تصور کئے جاتے تھے۔ بادشاہ کا لقب اختیار کرلیا۔ اور اس طرح شیعوں کو اپنا طرفدار بنالیا۔ اور شروع ہی سے اپنے حکومت میں شیعہ سنّی اتحاد کو تقویت پہنچانے کی کوشش کی۔ اس کا اندازہ اس کے اس

وصیت نامہ سے بھی ہوتا ہے۔ جو اس نے اپنے جانشین ہمایوں کے لیے تحریر کیا تھا۔ لکھتا ہے۔

(۱) "تم مذہبی تعصب کو اپنے دل میں ہرگز جگہ نہ دینا۔ اور لوگوں کے مذہبی جذبات و رسوم کا خیال رکھتے ہوئے بغیر رو رعایت سب قوموں کے ساتھ پورا انصاف کرنا۔

(۲) شیعہ سنّی اختلافات کو ہمیشہ نظر انداز کرتے رہو۔ کیونکہ اس سے اسلام کمزور ہو جائے گا"۔ (اردو مرثیہ اور شاہ سرپرستی از ذاکر حسین فاروقی مشمولہ سرفراز محرم نمبر ۱۳۸۴ھ۔ ۶۰)

ہمایوں کو بھی جب شیر شاہ سوری سے مقابلہ کے لیے مدد کی ضرورت ہوئی وہ ایران ہی کی طرف متوجہ ہوا۔ اور اب کی دفعہ مغلیہ سلطنت کو بچانے والا شاہ طہماسپ صفوی تھا۔ خود ہمایوں کی بیوی حمیدہ بانو بھی شیعہ تھی۔ اور ہمایوں کو افغانستان و ہندوستان پر جو تسلط حاصل ہوا تھا۔ وہ بھی شیعوں کی سپاہیانہ شجاعت کا نتیجہ تھا۔ لہٰذا دہلی میں شیعہ اقتدار کی وجہ بیان کرتے ہوئے شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں۔

"جب وہ (ہمایوں) ہندوستان واپس آیا تو شیعہ عمال کا زیادہ عمل دخل ہوگیا۔ اور انہیں اپنے مذہبی معاملات میں زیادہ آزادی مل گئی۔ ہمایوں کا وزیر باتدبیر بیرم خاں خود شیعہ تھا۔ حضرت علیؑ کرم اللہ وجہہ کی تعریف میں بیرم خاں کا ایک پرجوش عقیدہ ماثر رحیمی میں نقل ہوا ہے۔ جس کا ایک مطلع ہے۔

شہی کہ بگذرد از نہ سپر افسر او
اگر غلام علیؑ نیست خاک بر سر او (رودِ کوثر۔ ۳۱)

شیخ محمد اکرام دہلی میں عہد ہمایوں میں شیعی اثرات کی ایک وجہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ ہمایوں کے بعد شیعہ حضرات کی ایک کثیر تعداد ایران سے اس زمانہ میں آئی جب وہاں ۱۵۷۶ء میں شاہ اسماعیل ثانی نے اہل سنت والجماعت کا طریقہ اختیار کیا۔ اور سنی عقائد کے عارضی فروغ کے دوران میں برگزیدہ شیعہ علماء اور اکابر پر سختی شروع ہوئی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ اور وسیع ہوگیا۔ اور شمالی ہند میں بھی شیعوں کی معقول تعداد ہوگئی۔

خود ہمایوں کے متعلق یہ مشہور ہے کہ اس نے شیعہ مذہب اختیار کرلیا تھا۔ اور مندرجہ ذیل رباعی جو حضرت علیؑ کی شان میں ہے۔ ہمایوں سے منسوب کی جاتی ہے۔

مستتم زجاں بندۂ اولاد علی — مستیم ہمیشہ شاد با یاد علی

چوں سرّ ولایت زعلی ظاہر شد — کردیم مدام ورد خود ناد علی

شاید اس لیے بھی ہمایوں کے عہد میں شیعوں کو مراعات حاصل ہیں۔ اور تعجب نہیں عہد بابر اور ہمایوں ہی میں شیعہ امراء و معززین کھل کر عزاداری کرنے لگے ہوں۔ نواب نصیر حسین خیال نے تو ''مغل اور اردو'' میں اس کا انکشاف بھی کیا ہے۔ وہ دہلی میں مجالس عزا کا آغاز ہمایوں کے دور ہی سے مانتے ہیں۔ اس دور کے بعض آثار سے بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایرانی عزاداری کرتے تھے۔ پروفیسر مسیح الزماں عبدالقادر بدایونی کے حوالے سے عہد ہمایوں کے ایک مشہور شاعر حیدر توتیائی کا ذکر کرتے ہیں۔ جس کے بارے میں بدایونی نے لکھا ہے

''وایں مطلع او را کہ تعزیہ حضرت امام شہید مقبول و مقتول خلدۂ کہد رسول مقبول علیہ السلام نقش بستہ در ایام عاشورہ در معارک می خوانند۔ (اردو مرثیے کا ارتقاء۔ ۸۶)

ماہ محرم آمد و شد گریہ بہ یہ فرض عین — گریہم خوں بہ یاد لب تشنۂ حسینؑ

ہمایوں کا جانشین اکبر تاریخ میں اپنی مذہبی رواداری کے لیے مشہور ہے لہذا اس عہد میں شیعوں پر کوئی پابندی نظر نہیں آتی۔ اسی لیے ان کا اقتدار اور بڑھتا گیا۔ اور دربار اکبری میں بے شمار شیعہ اکابر موجود تھے۔ جن میں حکیم ابوالفتح گیلانی ملا فتح اللہ شیرازی، ابوالفضل علامی، فیضی اور عبدالرحیم خان خاناں وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اکبر کا صدر الصدور شیخ گدائی اور پنجاب کے قاضی سید نور اللہ شوستری بھی شیعہ تھے۔ اس کے علاوہ بیرم خاں، شیخ مبارک، فیضی، ابوالفضل، نور جہاں اور آصف خاں وغیرہ بھی شیعہ مسلک رکھتے تھے۔ اسی لیے پروفیسر مسیح الزماں کا خیال ہے کہ عزاداری عہد اکبری میں زور وشور سے ہوتی ہوگی۔ لکھتے ہیں۔

''محرم کے زمانے میں عزاداری کرنا نہ صرف ایرانیوں کے عقیدے میں شامل ہے بلکہ ان کی تہذیبی زندگی کا بھی اہم جز ہے اس بناء پر جہاں بیرم خاں، شیخ مبارک فیضی، ابوالفضل، نور جہاں، آصف خاں جیسے مقتدر ایرانی جگہ جگہ جمع ہو کر علوم وفنون کی مختلف شاخوں میں دخیل ہوں اور جن کے اثر سے عام لوگوں کا کیا ذکر، امراء، اور شاہی خاندان کے افراد تک عقائد میں بھی ان کے ہمنوا

ہو گئے ہوں''۔

(یہی نہیں بلکہ آگے لکھتے ہیں) ''عہد اکبر اور عہد جہانگیر میں جونپور کے ملا محمد یزدی ایسے مجتہد اور آگرہ کے نور اللہ شوستری ایسے قاضی تھے جن کے عقائد اور ضمیر کی آواز کو موت کی سزا بھی دبا نہ سکی۔ تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس عہد میں عزاداری ہوتی ہی نہیں تھی۔'' (اردو مرثیے کا ارتقاء ۹۲۔۹۰)

عہد اکبری میں شیعہ امراء واکابرین کے اقتدار کے سبب اکبر کے تورانی اور افغان امراء میں ایک بے چینی سی پیدا ہونے لگی تھی۔ حالانکہ اکبر نے اس بے چینی کو ختم کرنے کی خاطر بیرم خان کو قتل بھی کروادیا۔ لیکن پھر بھی شیعہ امراء کا اقتدار باقی رہا۔ جہانگیر کے تخت نشین ہوتے ہوتے سُنیوں میں اور زیادہ برافروختگی پیدا ہو چکی تھی۔ کیونکہ بیرم خاں کے قتل کی تلافی اکبر نے اس طرح کی کہ اکثر سُنّی علماء کو حج کے بہانے دارالحکومت سے دور کردیا۔ اور بعضوں کو قتل بھی کروادیا۔ دہلی کی جگہ آگرہ کو پایہ تخت بنایا۔ جس سے سُنّی علماء کا اثر سلطنت پر سے ختم ہو گیا۔ جہانگیر نے سُنّی دنیا کی بڑھتی ہوئی برافروختگی کو ختم کرنے کی خاطر حضرت مجدد الف ثانی کی مریدی اختیار کرلی۔ جو ہندوستان میں شیعی اثرات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ یہی نہیں بلکہ سُنیوں کی خوشنودی کی خاطر اس نے شیعہ عالم قاضی نور اللہ شوستری کو قتل کروادیا۔ لیکن دربار جہانگیر میں شیعی رسوخ پھر بھی باقی رہا۔ ملکہ نور جہاں خود شیعہ تھی۔ جس کی وجہ سے ایرانی عمل دخل اور بھی بڑھ گیا۔ اور شعر وسخن اور علم وفن کے میدان میں تو شیعوں ہی کا اقتدار تھا۔

شاہجہاں کا عہد بھی شیعوں سے خالی نظر نہیں آتا۔ امراء کا کیا ذکر خود شاہی خاندان کے کئی افراد عقائد کے اعتبار سے شیعہ تھے۔ ملکہ ارجمند بانو (ممتاز محل) شیعہ تھی اس کے بیٹوں میں شجاع کٹر شیعہ تھا۔ دارا شکوہ بھی شیعہ عقائد رکھتا تھا۔ اور یہ شیعی عقائد کے غلبہ کا ہی نتیجہ تھا کہ جب حصول حکومت کا سوال اٹھا تو ہر مدعی تخت اپنی شیعیت کا اظہار کرتا نظر آرہا تھا۔ ایسے موقع پر اورنگ زیب نے سیاست سے کام لیتے ہوئے سُنیوں کا ساتھ دیا۔ اور تخت نشینی ہوتے ہی اپنی سلطنت سے شیعہ اثرات کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اورنگ زیب جو تاریخ میں اپنی شیعہ دشمنی کے لیے خاص طور پر بدنام ہوا۔ خود شیعی اثرات سے یکسر بری نہیں تھا۔ اس کی بیوی دلرس بانو شیعہ

تھی۔اس کا معتمد خاص نعمت خان عالی شیعہ تھا۔ اس کا سپہ سالار میر جملہ شیعہ تھا۔امرائے عالمگیری میں اکثریت شیعہ امراء کی تھی۔ اورنگ زیب کے وزیر اعظم اسد خاں اور سپہ سالار ذوالفقار خاں کے متعلق بھی شبہ ہے۔(رودِکوثر صفحہ ۶۰۱) وزیر عماد الملک صفدر جنگ، امیر الامراء نجف خاں تو یقیناً شیعہ خیالات کے تھے۔اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء کا اتالیق ملا محمد سعید اشرف ماژندرانی بھی ایک ممتاز شیعہ عالم تھا۔اکثر ممتاز شعراء و علماء کا مذہب یہی تھا۔(رودِکوثر صفحہ ۶۰۲۔۶۰۱)

علامہ شبلی کو تو شکایت تھی کہ عہد عالم گیر کے برگزیدہ مورخ شیعہ تھے۔(رودِکوثر صفحہ ۶۰۲)

بہر حال اس کے باوجود بھی اورنگ زیب شیعوں کی بہادری، ذہانت علمیت اور قابلیت کا معترف رہا۔ایرانی سپاہی جن میں اکثریت شیعوں کی تھی ان سے بہتر اسے اور کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ "از اہل ایران بہتر معتمدی نیست کہ از عہد عرش آشیانی احدے از محاربات نگردانیدہ" یہاں تک کہ سادات بارہہ کی تمام تر فتنہ سامانیوں کے باوجود بھی اس کے دل میں بہ سبب ان کے سید ہونے کے ان دونوں کا احترام باقی تھا۔اور اسی لیے اس نے انہیں "چوب مسجد" کہہ کے درگذر کر دیا۔(سرفراز محرم نمبر ۱۳۸۴ھ صفحہ۔۶۳)

"اس عاصی غرق معاصی را تلخیف و تفریش تربت مطہرہ مقدسہ حسینہ علیہ السلام نمایندجہ مغرقان بحار عصیاں را بغیر از التجا بہ آں درگاہ مرحمت و غفراں پناہ نیست و مصالح ایں سعادت عظمٰی نزد فرزند ارجمند بادشاہ زادہ عالی جاہ محمد معظم است بگیرید۔" (ذاکر حسین فاروقی۔ ایضاً)

یہی وجہ ہے کہ اورنگ زیب کے عہد میں باقاعدہ عزاداری ہوتی تھی۔اور خود امرائے سلطنت بھی اس میں حصہ لیتے تھے۔متعدد واقعات اس بات کے گواہ ہیں کہ اورنگ زیب نے کبھی اس پر اعتراض نہیں کیا۔ بلکہ خود بھی اسے اپنایا۔ چنانچہ پروفیسر سیل چند نے اپنی کتاب "تاریخ عالمگیری) میں لکھا ہے کہ "روز عاشورہ اورنگ زیب نے ایک ضعیفہ کو دیکھا کہ سر پر تعزیہ رکھے قلعہ کی طرف جا رہی ہے۔دیکھنے کے ساتھ ہی بادشاہ پر جذب و استغراق کی کیفیت جو گشت و مشاہدہ سے حاصل ہوتی ہے۔طاری ہوگئی جس سے وہ سروپا برہنہ اس ضعیفہ کی طرف پیچھے پیچھے دوڑا۔ یہاں تک کہ تعزیہ اس سے لے کر اپنے سر پر رکھ لیا۔اور قلعہ میں داخل ہوا۔اور اسی وقت سے

عزاداری کرنے لگا۔واضح ہو کہ عہد عالمگیری کے اسباب عزاداری ابھی تک آگرے کے قلعہ میں محفوظ تھے۔جن کی حفاظت گورنمنٹ خود کرتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ آگرہ کے قلعہ میں گورنمنٹ کی طرف سے مجالس عزا بھی برپا ہوتی تھیں۔"

(حالانکہ شبلی کو اس بات پر برانگیختہ ہونے کی ضرورت نہیں چونکہ خود شمالی ہندوستان کی سب سے بڑی شیعہ سلطنت اودھ کی تاریخ ایک کٹر سُنی مورخ (نجم الغنی) نے تحریر کی ہے اور یہی نہیں بلکہ اودھ کے اکثر تاریخ نویس عماد السعادت تاریخ فرح بخش چہار گلزار شجاعی، گذشتہ لکھنؤ، وقائع دل پذیر تاجدار اودھ شباب لکھنؤ وغیرہ کے مصنفین وغیرہ سُنّی تھے۔)

اورنگ زیب کی موافقت عزاداری کے سلسلے میں اور ایک واقعہ مشہور و معروف مورخ خافی خاں اپنی تاریخ میں لکھتا ہے۔

"برہان پور میں تعزیہ داروں کا یہ دستور تھا کہ مجلس کے بعد تعزیہ اٹھایا کرتے تھے۔جس پر وہاں کے متعصب سنیوں نے اعتراض کیا۔ یہاں تک کہ اورنگ زیب کی عدالت تک معاملہ پہنچا۔لیکن منصف و متشرع بادشاہ نے فیصلہ تعزیہ داروں کے موافق کیا۔اور تعزیہ اٹھانے کی اجازت دیدی"۔

(سرفراز محرم نمبر ۱۹۶۴ء۔۱۴۸۔۱۴۷)

مولانا عبدالواحد فرنگی محل سے بھی جب ایک مرتبہ جواز تعزیہ داری کے سلسلے میں فتوی مانگا گیا تو انہوں نے سلاطین مغلیہ اور خاص طور پر اورنگ زیب کی روایات ہی کے ذریعہ استدلال قرار دیا۔اور لکھا۔

"........مراسم تعزیہ داری صدہا سال سے جاری و مروج ہیں۔ متشرع شاہان اسلام کے زمانہ میں بھی مثل جلال الدین اکبر، جہانگیر و شاجہاں اور عالمگیر اورنگ زیب کے زمانہ حکومت میں تعزیہ داری ہوتی تھی۔ یہ وہ سلاطین تھے۔جو تمام مملکت ہند میں قبول یافتہ تھے۔اور ان کے احکام جاری تھے۔اس زمانہ میں تعزیہ داری کے رسوم اچھے طریقے سے ادا کئے جاتے تھے۔"

(فارسی سے ترجمہ:۔ازالۃ الاوہام)"

پروفیسر مسیح الزماں "اردو مرثیہ کی روایت" میں رقم طراز ہیں۔

"اورنگ زیب کے متعدد امراء کے ہاں بالا علان تعزیہ داری ہوتی تھی (صفحہ ۹۶)

اردو مرثیہ کے ارتقاء" میں بھی پروفیسر موصوف اسی بات کی وضاحت کرتے ہیں۔

"اورنگ زیب کی مذہبی سخت گیری مشہور ہے لیکن اس وقت میں ایرانیوں کا اثر اتنا بڑھ چکا تھا کہ نہ صرف اس کے بہت سے درباری امراء اپنے محلوں میں عزاداری کرتے تھے بلکہ محرم کے ایسے جلوس بھی نکالتے تھے۔ جن میں ایک خلقت شریک ہوتی تھی۔" (صفحہ ۹۲)

اکثر باثر امراء کے گھروں پر مجالس عزا بھی منعقد ہوتی تھیں۔ جس کا ثبوت پروفیسر سید مسعود حسین رضوی کے ذخیرۂ کتب میں رکھی ہوئی ایک قلمی بیاض سے ملتا ہے جس کے مطابق صلاح کو اس عہد کا نمائندہ شاعر کہا جا سکتا ہے۔ اس میں صلاح کے یہ اشعار موجود ہیں جو مجلس و نوحہ و ماتم کو ظاہر کرتے ہیں۔

زاری کرو اے مومناں شاہ جہاں کا کوچ ہے
شور است در کون و مکاں صاحب قراں کا کوچ ہے
جب اقربا سارے گئے جب شاہ دیں مارے گئے
چندا گرا تارے گئے عرش آشیاں کا کوچ ہے

ڈاکٹر جعفر رضا بھی عہد عالمگیری میں عزاداری کے رواج کو تسلیم کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

"نصیر حسین خیال نے تو بابر اور ہمایوں کے وقت سے ہی عزاداری کا قیاساً ذکر کیا ہے لیکن انہوں نے اپنے خیال کی تائید میں کوئی واضح ثبوت نہیں پیش کیا۔ مگر اورنگ زیب کے زمانہ میں دہلی میں مجالس عزا اور محرم کے جلوس کا رواج ہو گیا تھا۔" (دبستان عشق کی مرثیہ گوئی۔ ۲۷)

بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ عزاداری کا رواج اورنگ زیب کی فتح دکن کے بعد جنوبی ہند سے آیا۔" (دکن میں مرثیہ اور عزاداری۔ ۹۱)

اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس کا جانشین شاہ عالم بہادر شاہ اوّل کے نام سے تخت

نشین ہوا۔ اس کے دور میں تشیع کا زور بے انتہا بڑھ گیا۔ چونکہ وہ خود زبردست شیعہ عقائد رکھتا تھا۔ اس کی زوجہ شہر بانو بھی شیعہ تھی۔ اس کے عہد میں سادات بارہہ کے دو سید بھائیوں (عبداللہ' حسین) کا اقتدار امور سلطنت میں بے حد بڑھ گیا۔ اور یہ دونوں بھائی شیعہ تھے۔ اس عہد کا سب سے مشہور واقعہ یہ ہے کہ بہادر شاہ اوّل سے عادل شاہی سلاطین کی طرح شمالی ہندوستان میں اپنی مملکت میں تمام مساجد میں اذان اور خطبہ میں تبدیلی کا فرمان جاری کیا۔ اور اذان میں حضرت علیؑ کے نام کے اضافے کا حکم صادر فرمایا۔ پروفیسر مسیح الزماں لکھتے ہیں۔

"دہلی میں تو اس حکم کے خلاف کوئی نمایاں آواز بلند نہیں ہوئی۔ لیکن آگرہ اور احمد آباد کے سنّی مسلمانوں نے احتجاج کیا اور لاہور میں ایک بڑے طبقے نے حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ بادشاہ فوج لے کر لاہور پہنچے۔ اور حنفی علماء سے مباحثہ و مناظرہ کیا۔ اور بالآخر اپنا حکم منوانے کے لیے شاہی توپ خانے کے افسر کو حکم دیا کہ توپیں چڑھا کر سرکشوں کو سزا دی جائے۔ ادھر شاہی قہر و غضب سے ٹکر لینے کے لیے شاہی مسجد پر ہزاروں آدمی ٹوٹ گئے...... قریب تھا۔ کہ گولہ باری شروع ہو جائے لیکن بعض ایرانی مدبّر جو بادشاہ کے مزاج میں دخیل تھے سمجھا بجھا کر اسے اعتدال پر لائے۔ اور حکم عام منسوخ کر دیا گیا۔ تاریخ کے اتنے اہم واقع نے اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ خود بادشاہ کا ذہنی رجحان کیا تھا۔ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد دہلی کی فضا کیسی تھی۔ ان حالات میں اگر باقاعدہ تعزیہ داری ہوتی ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔"

بہادر شاہ اوّل خود قلعہ معلیٰ میں محرم کے مراسم پورے زور و شور سے انجام دیتا تھا۔ منت کا جوڑا پہنتا تھا۔ سقّہ بنتا تھا۔ شربت اور تبرک تقسیم کرتا تھا اور خاص محل میں مجالس منعقد ہوتی تھیں۔ (فاروقی، سرفراز محرم نمبر ۱۳۸۴ھ صفحہ ۶۳)

عزاداری کا یہ سلسلہ فرخ سیر کے عہد تک یونہی جاری رہا۔ محمد شاہ کے زمانے میں سید برادران کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ لیکن اس کے اکثر عمائدین سلطنت شیعہ تھے۔ مثلاً سعادت خاں' برہان الملک' عمدہ الملک' امیر خاں' موتمن الدولہ' نواب اسحاق خاں نواب سعادت خاں ذوالفقار جنگ' شاہنواز خاں' ناظم پنجاب اور علی وردی خاں' ناظم بنگلہ' لہٰذا اس کے دور میں عزاداری کو فروغ حاصل ہوا۔

ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں۔

''محمد شاہ کے زمانے میں جب ایرانی اور تورانی امراء کی کشمکش شروع ہوئی تو ایرانی گروہ کے زیر اثر عزاداری اور تعزیہ داری کا رواج اور بھی بڑھ گیا......... اور وہ صورت جس کا ذکر فضلی نے ''دہ مجلس'' کا سبب تصنیف بیان کرتے ہوئے لکھی ہے عام ہوگئی یعنی جس طرح مجالس میں عورتیں فارسی نہ جاننے کی وجہ سے ''ہندی قریب الفہم عامۂ مومنین و مومنات'' میں ذکر شہادت کربلا سننے کی فرمائش کرنے لگی تھیں۔ اسی طرح آہستہ آہستہ عوام الناس کی فارسی سے بڑھتی ہوئی اجنبیت کے پیش نظر اور ریختہ کی مقبولیت کی بنا پر اردو میں مرثیے اور نوحے لکھے جانے لگے۔''

(اُردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر۔ ۶۷)

فضلی کی کربل کتھا (دہ مجلس) محمد شاہی عہد ہی کی تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ مرقع دہلی (سفر نامہ درگاہ قلی خاں) میں محمد شاہی دور کے گیارہ مرثیہ خوانوں کا ذکر بھی موجود ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت گھر گھر مرثیہ خوانی ہوتی تھی۔ اور مرثیے' سلام اور نوحے زبان ریختہ میں کہے جانے لگے تھے۔ کیونکہ اس دور کے چند تذکرے اس بات کا ثبوت ہیں۔ یہی وہ دور ہے جب اردو نظم و نثر کو مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ اور کوئی تعجب خیز امر نہیں کہ اردو کی عوامی مقبولیت میں شیعیت اور عزاداری کا زبردست ہاتھ ہو۔ جس کی وجہ سے مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کی جانے لگی تھی۔

درگاہ قلی خان سالار جنگ جو ۱۷۳۸ء کے قریب دہلی پہنچے۔ اور ۱۱۵۴ھ تک وہیں مقیم رہے ان کے سفرنامے (مرقع دہلی) کے بہت سے صفحات اس بات کا مظہر ہیں کہ اس وقت دہلی میں متعدد عاشور خانے تھے۔ جن میں مجلسیں ہوتی تھیں۔ اچھے اچھے مرثیہ خوان اور مرثیہ گو موجود تھے۔ اور بڑے زور و شور سے عزاداری ہوتی تھی۔ عوام اس میں دل کھول کر حصہ لیتے تھے۔ اسی ضمن میں درگاہ قلی خاں نے میر عبداللہ مرثیہ خوان کا تذکرہ کیا ہے جو ندیم اور حزین کے مرثیے پڑھتے تھے۔

ڈاکٹر محمد عمر لکھتے ہیں کہ

''اٹھارہویں صدی میں ہندوستان میں شیعی فرقے کا غلبہ بڑھ گیا تھا۔ اور تعزیہ داری کا عام رواج تھا۔ اسی وجہ سے ایام عاشورہ میں شہدائے کربلا کے منظوم حالات مجلسوں میں پڑھے جاتے تھے۔''

(اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی معاشرت۔ ۱۶۹)

درگاہ قلی خاں کے سفرنامے سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بعض عمارتیں' عزاخانوں اور امام باڑوں کا کام انجام دیتی تھیں۔ جس میں قدم گاہ امیر المومنین کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے۔ درگاہ قلی خاں اس کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''محرم کی بارھویں حضرت خامس آل عبا کی زیارت کا دن ہے ارباب عزا محزوں دل اور اشک بار آنکھوں سے اس مکان میں جمع ہوتے ہیں اور زیارت کی شرطیں پوری کرتے ہیں۔ کوئی متنفس ایسا نہیں ہوتا جو اس دن اس سعادت سے مشرف نہ ہو۔ سواریوں کی کثرت اور ضریح شریف کی بھیڑ سے راستے چشم مور کی طرح تنگ ہو جاتے ہیں۔ اہل حرفہ اپنی دوکانیں سجاتے ہیں اور منافع کماتے ہیں۔ چوکی خانے میں جو ارباب ایماں کا معین مکان ہے۔ منقبت خواں بلند آہنگ سے قصائد عزا پڑھتے ہیں۔ اور آنجناب سے نجات کا پروانہ حاصل کرتے ہیں۔''

(مجمع الاخبار۔ ۴۷۶ ہدایت المومنین صفحہ۔ ۲۰)

شاہ عالم اور اکبر شاہ ثانی کے زمانہ میں بھی دہلی میں عزاداری ہوتی تھی۔ مجالس عزا منعقد کی جاتی تھیں۔ دس دن تک امام باڑوں میں عزاداروں اور ماتم داروں کا مجمع لگا رہتا تھا۔ شہدائے کربلا کے ذکر میں حدیثیں اور مرثیے پڑھے جاتے تھے۔ تعزیوں کے سامنے، شربت، ریوڑی، الائچی دانے اور ملیدہ رکھ کر فاتحہ دی جاتی تھی۔ شب عاشورہ کونڈوں میں حلوا بھر کر علموں کے سامنے رکھا جاتا تھا۔ اور دوسری صبح کو وہ حلوا غریبوں اور مستحقین میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔

(واقعات شاہ عالم صفحہ۔ ۱۴)

مجالس عزا میں بادشاہ خود بھی دلچسپی لیتے تھے۔ اکبر شاہ ثانی نے شاہ مرداں کے مزار کے قریب دہلی میں ایک امام باڑہ تعمیر کروایا تھا۔ جہاں ہر سال ماہ محرم میں مسلمان جمع ہوتے اور مرثیہ خوانی کرتے تھے۔ (مفتاح التواریخ صفحہ ۲۷۶)

آج بھی شیعہ وہاں مجالس عزا منعقد کرتے ہیں۔ ان امام باڑوں کے علاوہ دہلی کے بازاروں میں کچھ مخصوص مقام تھے۔ جہاں منبروں پر کھڑے ہو کر مناقب شہدائے کربلا بیان کئے جاتے تھے۔ درگاہ قلی خاں نے چوک سعد اللہ خاں کی مجلسوں کا منظر یوں پیش کیا ہے۔

"راویان معتبر مثل ارباب عمائم چندین جا کرسی ہای چوبین از قبیل منابر نصب کردہ مناسب ہر ماہ و ہر روز مثلاً در ماہ رمضان المبارک فضائل صوم و در ذی الحجہ الحرام حج و عمرہ و در ماہ محرم مقدمات روضۃ الشہدا بہ ادائی فصیح کردہ ذہن نشین عوام می کنند و این جماعت را بہ رقت می آرند و مبلغ بہ این تقریب تحصیل می نمایند"۔ (اردو مرثیے کی روایت صفحہ ۲۲۴)

امام حسینؑ کی زیارت کے دن (۱۳ محرم کو) تمام سڑکوں پر عزاداروں کا مجمع لگا رہتا تھا یہ تمام لوگ سر برہنہ و پا پیادہ راستوں پر نکلتے تھے۔ قدم گاہ حضرت علیؑ میں کافی رونق ہوتی تھی۔ دکاندار اپنی دکانوں کو سجاتے تھے۔ اور قدم گاہ کے متصل ایک چوکی خانہ تھا جہاں عزادار جمع ہوتے تھے۔ اور بآواز بلند ذکر شہدائے کربلا کرتے تھے۔ اور مرثیہ خوانی کرتے تھے۔ (مرقع دہلی اردو ترجمہ)

آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے بارے میں بھی یہی مشہور ہے کہ اس نے شیعہ مسلک اختیار کر لیا تھا۔ اکثر مورخین اور تذکرہ نگاروں نے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے۔ چنانچہ شیخ محمد اکرام رود کوثر کے صفحہ ۶۰۰ اور ۶۰۱ کے حاشیوں میں تحریر کرتے ہیں۔

"آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ثانی ظفر کی نسبت ایک زمانہ میں لکھنؤ میں مشہور ہو گیا تھا کہ اس نے شیعہ مذہب اختیار کر لیا ہے۔ لیکن جب سنی علماء و اکابر نے اس پر مواخذہ کیا تو بادشاہ نے اس افواہ کی تردید کی۔ اور مرزا غالب سے ایک فارسی مثنوی لکھوا کر عوام و خواص کو اپنے سنی ہونے کا یقین دلایا۔"

بہادر شاہ ظفر کے شیعی مسلک اختیار کرنے کے متعلق یہ واقعہ بتایا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ

بادشاہ سخت بیمار پڑ گیا۔ اور طرح طرح کے علاج معالج کئے جانے کے باوجود افاقہ نہ ہوا۔ اتفاق سے اس زمانہ میں بادشاہ کا بھتیجہ (مرزا حیدر شکوہ) لکھنو نے نذر مانی تھی کہ اگر بادشاہ صحت پا گئے تو وہ حضرت عباس کی درگاہ پر علم چڑھائے گا۔ چنانچہ لکھنو پہنچ کر اس نے بادشاہ کی خدمت میں عرضداشت بھیجی کہ اس کا اتنا مقدور نہیں کہ نذر پوری کر سکے۔ لہٰذا حضور مدد فرمائیں۔ بہادر شاہ ظفر نے کچھ روپے بھیجے اور مرزا حیدر شکوہ نے بڑی دھوم دھام سے علم چڑھایا۔ جس میں اودھ کے تمام شاہی خاندان کے افراد، امراء، علماء اور دوسرے معزز حضرات بھی شریک ہوئے۔ اور مجتہد العصر (سلطان العلماء) کے ہاتھ سے علم چڑھایا گیا۔ (آب کوثر)

یہ بات قابل قبول نظر نہیں آتی کہ مرزا حیدر شکوہ نے منت مانی تھی اور وہ اسے پوری نہ کر سکا۔ لہٰذا بادشاہ کو لکھا۔ اول تو شیعی عقائد رکھنے والا ہر شخص خود ہی منت اپنی حیثیت اور استطاعت کے مطابق ہی مانگتا ہے۔ دوّم یہ کہ جو شخص منت مانتا ہے۔ وہ منت اسے ہی پوری کرنی پڑتی ہے۔ نہ کہ کوئی دوسرا اسے پوری کرتا ہے لہٰذا اس موقع پر بہادر شاہ ظفر کو مرزا حیدر شکوہ کا اس قسم کا خط لکھنا قطعی بے معنی نظر آتا ہے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ اپنی علالت سے گھبرا کر بادشاہ نے خود ہی منت مانی ہوگی۔ کیونکہ یہ انسانی نفسیات ہے کہ جب موت سامنے نظر آتی ہے تو وہ زندگی کو بچانے کی خاطر ہر ممکن کوشش کرتا ہے اور خاص طور پر مذہب کا سہارا رغبت رکھتا تھا۔ اس علالت سے شفا پانے کے بعد اس کا عقیدہ اس مسلک پر راسخ ہو گیا۔ مگر باقاعدہ اعلان کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ کیونکہ اسے اپنے ہم نام پیشترو (بہادر شاہ اوّل) کا انجام معلوم تھا۔ بہر حال یہ سوال اٹھتا ہے کہ وہ شیعہ کیسے ہوا۔ اور کب باقاعدہ اعلان کرنے پر تیار ہوا؟ اس راز پر سے پردہ اٹھاتے ہوئے سید سبط احمد جائسی لکھتے ہیں۔

"سلطان العلماء مولانا سید محمد صاحب طاب ثراہ (جائسی النصیر آبادی) نے آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کو شیعہ کیا تھا۔ چنانچہ بہادر شاہ ظفر نے ایک علالت کے سلسلے میں امام باڑے کی تعمیر کی اور درگاہ حضرت عباس میں ایک علم مبارک کے چڑھاوے سے اپنے شیعہ ہونے کے اعلان کا وعدہ کیا بعد صحت بہادر شاہ ظفر نے سلطان العلماء مولانا سید محمد صاحب قبلہ کو یہ خط لکھا۔

'' افضل الفضلاء، الافقہ الفقہا، سید سادات، مقتدائے مومنین و مومنات مجتہد العصر والزماں، سلطان العلماء دامت برکاتہ بحمد اللہ والمنہ محبت ولای اہل بیت علیہم السلام اختیار کردہ ام۔ واز اعدائی علی ابن ابی طالبؑ قطعی تبرا نمودم وتعمیر امام باڑا شروع گردیدہ است۔ بعد تمامش مجالس تعزیت جناب سید الشہداء امام حسین علیہ السلام مقرر خواہد شد، اسعی منی اولا تمام من اللہ مفصل مدارج دیہیہ کہ برآں راسخ ام زبانی برخوردار کام گار والا تبار سعادت اطوار مرزا محمد حیدر شکوہ بہادر کہ دریں خصوصی راز دارست۔ دریافت خواہد شد''۔ (رسالۂ علم حیدری صفحہ ۴۷۳) بحوالہ کاروانِ حیات سید سبط احمد جائسی کا مضمون ''قصبہ جائس میں عزاداری کی تاریخ)

سید سبط احمد لکھتے ہیں کہ اس خط کے بعد لکھنؤ میں شاہی علم آیا۔ جسے سلطان العماء نے بڑے شاہانہ اہتمام وجلوس کے ساتھ درگاہ حضرت عباسؑ میں لے جاکر نصب کیا۔ دہلی میں جو یہ خبر پہنچی تو آگ لگ گئی۔ اور وہی ہوا جو بہادر شاہ اوّل کے عہد میں ہوا تھا۔ بادشاہ کو تبدیل مذہب پر مجبور کیا گیا۔ اور بہادر شاہ کے لیے سوائے تردید واقعہ کے چارہ نہ تھا۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے ''غالب اور شاہانِ تیموریہ'' میں بہادر شاہ ظفر کی تبدیلئی مذہب کا اقرار کیا۔ جان ہالسٹر بھی لکھتا ہے۔

"The influence of Shism continued among the Mogahls even untill 1853 when Bahadur Shah II secretly declared his allegiance to Persia and himself as a Shia." (Titus Op. Cit. [g 88)

اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس وقت دہلی میں سنی اقتدار اتنا قوی ہو چکا تھا کہ بادشاہ تک شیعیت کا اعلان کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ اور اگر کرتا تھا تو اسے بہادر شاہ اوّل کی طرح زبردست عوامی احتجاج کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ عوام کے ہاتھوں بادشاہ کے اس مذہبی استحصال کو دیکھتے ہوئے سوچا جاسکتا ہے کہ جہاں بادشاہ کے شیعہ ہو جانے پر یہ حال ہو وہاں بادشاہ کے سُنّی اور بعض مرتبہ کٹر سُنّی ہونے پر شیعہ عوام پر کیا کچھ نہ گذرتی ہوگی۔ اور دہلی کے شیعوں کو بسا اوقات کیسی کیسی صبر آزما منزلوں سے گزرنا نہ پڑتا ہوگا۔ ایسے موقع پر اگر عقائد محفوظ رہ جائیں تو غنیمت ہے۔ عزاداری کا اعلانیہ اظہار تو دور کی بات ہے۔ دلّی میں غالباً اسی لیے شیعہ فرقے کی وہ

پر جوش عزاداری کا اظہار نہیں ملتا جو دیگر ریاستوں یا حکومتوں میں نظر آتا ہے جہاں کے حکمراں شیعہ تھے۔ یا شیعوں کے مذہبی آزادی اور رواداری کے قائل۔ اس پر بھی مراسم عزاداری کا دہلی میں ہر دور میں زندہ رہنا اس بات کا ثبوت ہے کہ شیعیت ہر دور میں دہلی والوں پر اثر انداز ہوتی رہی ہے۔ اور بہادر شاہ ظفر تو اس طرف ایسا راغب تھا کہ خود محرم میں مراسم عزاداری بڑے انہماک سے مناتا تھا۔

رئیس احمد جعفری ندوی نے اپنی تالیف ''بہادر شاہ ظفر'' اور ان کا عہد مطبوعہ ۱۹۵۵ء میں جابجا مختلف حوالے دیئے ہیں۔ جن سے بادشاہ کے محرم کے منانے کا ثبوت ملتا ہے سرطامس مٹکاف کی ڈائری صفحہ ۱۰۹ پر بیان ہے۔

'' آج کے دن جہاں پناہ کے محلات میں حضرت علیؑ کے دسترخوان کی نیاز کے ستو بڑے بڑے خوانوں میں چوٹی تک بھر کے دسترخوانوں پر رکھ دیئے جاتے ہیں۔ اور پردہ گرایا جاتا ہے پھر باہر بیٹھ کر نیاز دی جاتی ہے۔ پھر پردے باندھ دیے جاتے ہیں۔ اور شمع کی روشنی میں ستوؤں کو دیکھا جاتا ہے۔ آج ایک خوان کے ستوؤں پر حضرت علیؑ کی تسبیح کے دانے کا ایک نشان نظر آیا۔ اور حضور جہاں پناہ نے اس خوان کے ستوؤں کو خود بطور تبرک نوش فرمایا۔ پھر اپنے دستِ مبارک سے وہ ستو شہزادوں اور بیگمات کو تقسیم کیے۔ اور اس کے بعد سب نے بارگاہ جہاں پناہ میں نذریں پیش کیں۔ کہا جاتا ہے کہ اگر خوانوں یا کھانوں پر کوئی خاص نشان نظر آجاتا تھا تو سمجھتے تھے کہ حضرت علیؑ نے یہ نیاز قبول فرمائی اور اس پر اپنی انگلی کا نشان ثبت کر دیا ہے۔ دسترخوان پر قسم قسم کے کھانے ہوتے اور جو کے ستو بھی۔ حضرت علیؑ کے تسبیح کا نشان صرف جو کے ستوؤں پر ظاہر ہوتا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ان ستوؤں کو اس طرح چوٹی دار بھرا جاتا تھا کہ کئی چھوٹے بڑے نشان کی گنجائش نہیں رہتی تھی۔ مگر جب تسبیح کا نشان اس میں نظر آیا تو سب کو بے حد خوشی ہوئی کہ حضرت علیؑ نے اس ستو کو قبول فرمایا۔'' (بحوالہ سرفراز محرم نمبر ۱۹۶۴ء صفحہ ۱۴۳)

منشی فیاض علی ''بزم آخر'' میں لکھتے ہیں۔

'' محرم میں بادشاہ فقیر بنتے، سبز کپڑے پہنتے اور گلے میں سبز جھولی ڈالتے تھے۔ چھٹی تاریخ کو تھوڑی دیر کے لیے شدے ہاتھ میں لے کر اور چاندی کی

زنجیر کمر میں ڈال کر گشت کرتے تھے۔ ساتویں کی مہندی بڑی دھوم دھام سے اٹھتی تھی اور بادشاہ بہ نفس نفیس اس کی مشایعت کرتے تھے۔ آٹھویں میں حضرت سقائے حرم کی یادگار میں لال کھاروے کی لنگی باندھ کر بہشتی بنتے اور شربت کی بھری پری مشک کو کندھے پر رکھ کر معصوموں کو شربت پلاتے تھے۔ دسویں تاریخ کو موتی مسجد میں عاشورے کی نماز پڑھ کر ظہر کے وقت حاضری کے دستر خوان پر نیاز دیتے تھے۔ دستر خوان پر شیر مالیں چنی ہوتی تھیں۔ شیر مال کے اوپر کباب، پنیر، پودینہ اور ادرک مولیاں کتر کے رکھی جاتی تھیں۔"

عاشورہ کے دن بادشاہ درگاہ شریف کے آثار کی زیارت کو تشریف لے جاتے تھے مرزا جہاں دار شاہ متولی کو خلعت قبائے خاص سر رقم جواہر دستار سر بستہ گوشوارہ مرصع اور حافظ قطب الدین کو خلعت پارچہ معہ رقم اوران کے لڑکے کو سر پارچہ اور دو رقم جواہر اور سادات عالی درجات کو پہننے کو کپڑے اور زر نقد اور فقراء اور مساکین کو نیاز کو کھانا مرحمت فرمایا۔" (۲۳ر جنوری ۱۸۴۷ء بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ۔ سرفراز محرم نمبر ۱۹۶۴ء صفحہ ۱۴۲)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ انگریزی اقتدار سے پہلے دلی میں محرم کافی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ اور بادشاہ کے علاوہ عوام بشمول شیعہ و سنی اور ہندو بھی اس میں شرکت کرتے تھے۔ حالانکہ مجالس عزا صرف شیعہ برپا کرتے تھے۔ لیکن تعزیہ بنانے کا کام سنیوں نے لے رکھا تھا۔ اور تعزیوں کے جلوس میں ہندو بھی شریک ہوتے تھے۔ ملا واحدی اس زمانہ کے محرم کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"محرم کا چاند دکھائی دیا۔ اور ماتمی باجوں کی آوازیں اٹھنے لگیں۔ خوشی کی تقریبیں بند ہو گئیں۔ مستورات نے پر تکلف لباس پہننا ترک کر دیا۔ طوائفیں تک سوگ مناتی تھیں۔ کوئی عورت بناؤ سنگھار کر لیتی تو دوسری عورتیں نام دھرتیں۔ اور کہتیں "بوا محرم ہے محرم" شیعہ پان نہیں کھاتے تھے۔ گلی کوچوں سے لے کر بڑے بڑے بازاروں تک تخت اور چوکیاں، سبیلیں لگانے کے واسطے بچھائی جاتی تھیں۔ اور ہر شخص اس کوشش میں لگا رہتا تھا کہ میری سبیل

سب سبیلوں سے بازی لے جائے۔ سبیلوں کو سجایا جاتا تھا۔ اور روشنی اتنی کی جاتی تھی کہ سوئی گرے تو اٹھا لو۔ بیسوں جھاڑ، فانوس، ہنڈیاں، اکے، دوشاخے روشن کر کے رات کو دن بنایا جاتا تھا۔ دودھ کا شربت اور سادہ شربت بنایا جا رہا ہے۔ اور آواز الگ لگ رہی ہے۔

پانی پیو تو یاد کرو پیاس امام کی
پیاسو! سبیل ہے یہ شہیدوں کے نام کی

شیعہ حضرات کے ہاں مجالس عزا برپا ہیں۔ میر انیس اور مرزا دبیر کے مرثیے پڑھے جا رہے ہیں۔ صف ماتم بچھی ہوئی ہے۔۔ خاتمہ مجلس پر کہیں الا ئچی دانے اور چنے بٹ رہے ہیں۔ خمیری روٹیاں اور چنے کی دال کا بھرتہ، کہیں شیر مال اور فرنی کے پیالے۔" (کاروان حیات۔ ۶۲ دلی کا محرم از ملا واحدی)

سید حسن نے دور آخر کی دلی کے محرم کی تصویر یوں کھینچی ہے۔

"محرم کی پہلی کو قلعہ میں بادشاہ اور عوام و خواص کے گھروں میں بچے حضرت حسنؑ حسینؑ کے فقیر بنتے، سبز کپڑے پہنے جاتے اور گلے میں سبز کفنی اور جھولی ڈالی جاتی۔ جھولی میں الا ئچی دانے سونف اور خشخاش بھری جاتی۔ اس کے بعد یہ فقیر درگاہ میں جا کر سلام کرتے اور نیاز دلائی جاتی۔ کھاتے پیتے گھروں میں دس دن صبح کو کھانا اور شام کو شربت فقیروں کو تقسیم ہوتا تھا۔ چھٹی کو بادشاہ کے ہاتھ میں دو مرصع ڈنڈے دیئے جاتے تھے۔ اور کمر میں سیمیں زنجیر ڈالی جاتی۔ دو سید زادے اسی سے پکڑ کر بادشاہ کو کھینچتے تھے۔ دو چار قدم چلنے کے بعد زنجیر بادشاہ کے گلے میں ڈال دی جاتی تھی۔ محرم کی ساتویں کو شاہی جلوس امام باڑہ جاتا تھا۔ آگے آگے لال کاغذ سے منڈھی ہوئی بانس کی کھپچیاں اور ابرق کے کنول میں روشن شمعیں۔ مہندی اور مالیدے کے خوان درگاہ میں چڑھائے جاتے تھے۔ محرم کی آٹھویں کو بادشاہ حضرت عباس کے سقے بنتے، سب بچوں کو شربت پلاتے تھے۔ اس کے بعد ملیدے پر نیاز دی جاتی تھی۔ محرم کی دسویں کو کوزوں میں شربت بھرا جاتا تھا۔ تازہ حلوہ کونڈوں میں بھرا جاتا۔ ظہر کے بعد بادشاہ موتی مسجد میں عاشورہ کی نماز پڑھتے تھے۔ اس کے بعد کھانے پر نیاز دی جاتی تھی۔ بادشاہ چکھ کر اسے تقسیم کرا دیتا تھا۔ اس کے بعد تبرکات کہ

جس میں حضرت محمد ﷺ کا جبہ اور نعلین' حضرت علیؑ کا قرآن' حضرت حسنؑ حسینؑ کی خاک ہوتی تھی۔ تعظیم وتکریم کرتا تھا۔ محل سرا کی خواتین بھی اس میں شریک ہوتی تھیں۔ اس کے بعد یہ ڈلیاں' الائچیاں' کتری ہوئی چھالیہ خربوز کے بیج' کترا ہوا کھوپرا اور دھنیا تقسیم ہوتا تھا۔ شہر میں بھی دس دن کچھ ایسی ہی دھوم رہتی تھی۔ دسویں کے روز تعزیے اٹھتے' سبیلیں رکھی جاتیں، ڈھول اور تاشے پیٹے جاتے' مرثیہ خوانی ہوتی، بڑی دھوم دھام سے علم اٹھتے اور اکھاڑے جمتے تھے۔ ہندوؤں کی اچھی خاصی تعداد دسویں کے روز تعزیوں کے جلوس میں شریک ہوتی۔ جن محلوں سے تعزیے گذرتے وہاں کے ہندو سبیل رکھتے تھے۔ (دہلی کالج میگزین۔ دلی نمبر ۱۹۵۹ء مضمون دور آخر کی دلی از سید حسین صفحہ۔ ۹۴)

سُنّیوں کے ہاں شہادت نامے پڑھے جاتے تھے۔ خود شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے ہاں مجلس ہوتی تھی۔ اور شاہ صاحب ہی شہادت نامہ پڑھتے تھے۔ شاہ عبدالحق محدث دہلوی ''اخبار الاخبار'' میں رقم طراز ہیں۔

> ''ہمارے دیار (دہلی واطراف دہلی) میں یہ قدیم دستور ہے کہ عورتیں بروز عاشورہ مجتمع ہو کر گھروں میں گریہ وزاری کرتی ہیں۔'' (بحوالہ سرفراز محرم نمبر ۱۹۶۴ء صفحہ۔ ۱۵۲)

انگریزی حکومت نے تعزیوں پر پابندیاں عائد کردیں۔ اور ان کے گذرنے کے راستے مخصوص کردیئے گئے۔ گشت کی اجازت بھی گنے چنے تعزیوں کو ملتی تھی۔ کوئی نیا تعزیہ نکالنے کے لیے پولس سے اجازت لینا ضروری تھی۔ ان بندشوں کی وجہ سے محرم کے جلوس میں کچھ کمی آگئی۔ تاہم ۱۹۴۷ء تک محرم کی نویں تاریخ کو بارہ پندرہ تعزیے گشت کے لیے نکلتے تھے۔ اور بہت سے ایسے تعزیے جنہیں گشت کی اجازت نہیں ملتی تھی۔ روز عاشورہ ٹھنڈا کرنے کی غرض سے انہیں بھی نکالا جاتا تھا۔ اور کربلا شاہ مردان میں لے جایا جاتا تھا۔

شب عاشور شہر کے دور دراز علاقوں سے تعزیے نکل نکل کر جامع مسجد کے نیچے اکھٹے ہوجاتے تھے۔ ان تعزیوں کے مختلف نام تھے۔ مثلاً نوگزہ، اونٹنی والا تعزیہ وغیرہ تعزیوں کی آمد کی خبر وہ کم عمر لڑکے دیتے تھے۔ جو پیک بنا کرتے تھے۔ تعزیوں کے سامنے مرثیہ خوانی ہوتی تھی۔ اور

غیر مسلم خواتین بچوں کو عقیدتاً تعزیوں کے نیچے سے نکالتی تھیں۔ ملا واحدی نے دو تعزیوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ جو دلی کے شہزادے نکالتے تھے۔ ایک سبز کاغذ کا اور دوسرا سفید کاغذ کا۔ یہ تعزیے دسویں محرم ہی کو باہر آتے تھے۔ شہزادے ہی ان کے سامنے مرثیے پڑھتے تھے۔ ملا واحدی مہندی کے جلوس کا بھی ذکر کرتے ہیں اور حویلی اعظم خاں کے براق کا بھی' جسے دیکھنے کے لیے لوگ دور دور سے آتے تھے۔ (کاروانِ حیات۔ صفحہ۔ ۶۲ ملا واحدی کا مضمون)

اس کے بعد متعدد مذہبی تحریکوں اور بدلتے ہوئے سیاسی حالات کی بناء پر دہلی کے محرم کا نقشہ ہی بدل گیا۔ عزاداری آج بھی ہوتی ہے لیکن اس میں وہ شان نہیں جو آزادی سے پہلے تھی۔ صرف شیعہ حضرات عزاداری پر اب بھی عمل پیرا ہیں۔ ورنہ سُنیوں میں نظریات کی تبدیلی کے باعث تقریباً معدوم ہو کر رہ گئی ہے۔

۳۔ اودھ اور نوابین کا دور: شمالی ہند میں شیعیت کا سب سے بڑا مرکز اودھ کو سمجھا جاتا ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ نوابانِ اودھ ہی کے زمانے سے اور انہیں کی کوششوں کی وجہ سے شمالی ہندوستان میں عزاداری کو فروغ حاصل ہوا۔ اور شیعیت کی تبلیغ ہوئی۔ لیکن یہ خیال بھی صحیح نظر نہیں آتا۔ اس لیے کہ شیعہ' جیسا کہ گذشتہ صفحات میں کہا گیا ہے سپاہی کی حیثیت سے اکثر سنی سلاطین کے ساتھ ہندوستان آتے رہے تھے۔ خصوصاً ایرانی سپاہی جو شمالی سرخیل رہے اور ان کی فتوحات کا باعث بھی، خلجیوں اور سلاطین شرقی (جون پور) کے عہد سے شمالی ہند کے مختلف قصبوں میں آباد ہوگئے تھے۔ جن میں جونپور' بلگرام' زید پور مصطفیٰ آباد اور جائس وغیرہ کی بستیاں خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں۔ کیونکہ ان بستیوں میں آباد ہونے والے مسلمانوں میں صوفیائے کرام' علمائے عظام اور ادباء وشعراء بھی موجود تھے جو اپنے اپنے میدان میں اپنی کوششوں کو برقرار رکھے ہوئے تھے۔ اور اس طرح شمالی ہند میں ان سیدوں کی باقاعدہ بستیاں بسی ہوئی تھیں۔ یہ سید کافی شجاع، بہادر اور مذہب پرست ہوتے تھے۔ لہٰذا اپنے اطراف واکناف کے علاقوں میں ان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی اور آس پاس کی ہندو ریاستیں ان سے خطرہ بھی محسوس کرتی تھیں۔ اور ان پر حملہ کرنے کے بہانے بھی ڈھونڈتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب سعادت خان برہان الملک نے

اودھ کی صوبیداری سنبھالی تو موہن سنگھ راجہ تلوئی نے اس کی سرداری تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اس کا اظہار مصطفیٰ آباد کے سیدوں پر حملہ کر کے کیا۔ (اردو مرثیے کا ارتقاء صفحہ۔۱۳۱)

نواب برہان الملک نے لکھنؤ کے قریب ہندوستان کے قدیم مقدس شہر اجودھیا سے کچھ فاصلے پر دریائے گھاگھرا کے کنارے ایک بلند ٹیلے پر اپنا خیمہ نصب کروایا۔ اور رہنے لگے۔ برسات میں ایک چھپر بنوالیا۔ پھر اس کے گرد کچی دیوار کا احاطہ کر لیا۔ اور چاروں کونوں پر چار برج بنوالیے۔ (تاریخ فرح بخش از منشی محمد فیض بخش) اس طرح فیض آباد آباد ہوا۔ (گذشتہ لکھنؤ۔۴۲) چونکہ برہان الملک انتہائی سادگی پسند انسان تھے۔ اور ان کا زیادہ وقت مہمات میں گذرا۔ اس لیے مذہبی ہونے کے باوجود کچھ نمایاں کارنامے انجام نہیں دے سکے۔ اس کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سعادت خان کی وجہ سے اودھ کی سرزمین شیعیت کے زیر اثر آگئی۔ اور بہت سے سنّی مسلمانوں نے مذہب شیعہ اختیار کر لیا۔ (اٹھارھویں صدی میں ہندوستانی معاشرت۔۲۶۰ از ڈاکٹر محمد عمر)

مثلاً مدارالدولہ، میر یوسف، کے آباء واجداد سنّی عقائد کے پیرو کار تھے۔ لیکن ہندوستان آنے پر برہان الملک کی صحبت میں مذہب اثنا عشری اختیار کیا اور اعلانیہ تعزیہ داری کرنے لگا۔ برہان الملک کے جانشین نواب صفدر جنگ نے بھی شیعہ علماء کی سرپرستی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اور انہیں اعزاز بھی دیئے۔ خود صفدر جنگ کی زوجہ صدر النساء بیگم نے فیض آباد میں ایک امام باڑہ موتی باغ کے عقب میں بنوایا تھا۔ (تاریخ فرح بخش جلد ا صفحہ ۲۵۰) اور تقریباً اسی عہد میں داراب علی خاں نے جواہر علی خاں کے قدیم لکڑی کے امام باڑے کو پختہ کروایا تھا۔ (تاریخ فرح بخش صفحہ ۵۲۶)

شجاع الدولہ نے اپنی سکونت کے لیے لکھنؤ کا انتخاب کیا۔ جس کی وجہ سے لکھنؤ کی مرکزی حیثیت بڑھ گئی۔ اور وہ مخصوص تہذیب و تمدن کا نمائندہ بن گیا۔ شجاع الدولہ کی مذہب پسندی نے لکھنؤ کو شیعیت اور عزاداری کا مرکز بھی بنا دیا۔ شجاع الدولہ کے بارے میں ہرچرنداس مصنف چہار گلزار شجاعی جس نے حسین علی خاں کے امام باڑے میں ۴۵ برس تک کھانا تقسیم کرنے کی خدمت انجام دی تھی۔ لکھتا ہے کہ "نواب بغیر متعہ یا نکاح کے کسی عورت پر نظر نہ کرتا تھا۔ اور

شراب اور دیگر نشہ آور چیزوں سے دور رہتا تھا اگر کسی شراب فروش یا شرابی کو دیکھ لیتا تھا تو سخت سزا دیتا تھا۔ اس کے علاوہ سیدوں کی بہت عزت کرتا تھا۔ اور ان کے ساتھ بڑے احترام سے پیش آتا تھا۔ اور انہیں خوب نذرانے دیتا تھا۔ ہرچرنداس کا بیان ہے کہ "اکثر اوقات نواب شجاع الدولہ زری بطریق نیاز حضرات نیابر سادات بہ حکم معالج خاں پسر مقرب خاں حکیم می داد۔ می گفت کہ ایں زر را بہ سادات برساں۔" (چہار گلزار شجاعی ۔۲۰۲ بحوالہ اٹھارویں صدی میں ہندوستانی معاشرت)

ایام محرم میں نواب دکنی فرمانرواؤں کی طرح سیاہ پوش ہو جاتا تھا۔ اور مراسم عزاداری بڑی تفصیل سے مناتا تھا (عمادالسعادت ۸۳) ہرچرنداس کے بیان کے مطابق نواب تعزیہ داری میں اتنا اہتمام کرتا تھا کہ بسا اوقات بذات خود تابوت اپنے کاندھے پر اٹھا کر امام باڑے تک لے جاتا تھا۔ (چہار گلزار شجاعی۔ الف۔ صفحہ ۱۹۳) مولوی نجم الغنی (مصنف تاریخ اودھ) بھی اس کی تائید کرتے ہیں کہ بادشاہ سفر ہو کہ حضر' عزاداری بڑی پابندی سے ادا کرتا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب پانی پت کی تیسری جنگ ہوئی تو اس موقعہ پر میدان جنگ میں بھی نواب نے تعزیہ داری امام حسینؑ ادا کی (تاریخ اودھ جلد ۲ صفحہ ۵۶) عمادالسعادت میں اس واقعہ کا ذکر اس طرح کیا ہے)

"محرم کے زمانہ میں شجاع الدولہ سیاہ پوش ہوئے۔ اور سیہ جماعت کے ساتھ گذرے جن کے سر و پا برہنہ تھے۔ ماتم کرتے ہوئے احمد شاہ کی فرودگاہ کے سامنے سے گذرے ان لوگوں کے کندھوں پر علم تھے۔ اور سینہ کوبی کرتے تھے۔ اور علانیہ نوحہ کے الفاظ زبان سے نکالتے تھے۔ دُرانیوں کا ارادہ ہوا کہ ان پر حملہ کریں۔ مگر بادشاہ نے ان کو سمجھا دیا۔" (عمادالسعادت)

شجاع الدولہ کے عہد میں لکھنؤ میں عزاداری کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ متعدد امام باڑے تعمیر ہوئے اور شیعی عقائد کی ترویج ہوئی۔ یہاں تک کہ آصف الدولہ کا دور آتے آتے اودھ ہندوستان میں شیعیت کا ایک بڑا مرکز بن گیا۔ خصوصاً لکھنؤ جسے آصف الدولہ نے اپنا جائے سکونت بنایا۔ اپنے مخصوص شیعی رجحانات کی وجہ سے تاریخ میں ایک اہمیت حاصل کر گیا۔ آصف الدولہ کی والدہ بہو بیگم اور ان کی دادی صدر النساء بیگم تو فیض آباد میں عزاداری کو برقرار رکھے ہوئے تھیں ہی لکھنؤ پہنچتے ہی آصف الدولہ اور ان کے نائب سرفراز الدولہ مرزا حسن رضا نے

بھی عزاداری کو خوب خوب فروغ دیا اور بڑے امام باڑے کی تعمیر کا مشورہ دیا۔ بہو بیگم والدہ آصف الدولہ کے مدار المہام خواجہ سرا الماس علی خان کا خود بھی ایک امام باڑہ تھا۔ جہاں عزاداری ہوتی تھی۔ (تاریخ فرح بخش جلد سوم صفحہ ۵۳)

اسی سال اس زمانے کے مشہور مہندس کفایت اللہ کی نگرانی میں بڑے امام باڑے کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔ امام باڑہ آصفی کی تعمیر کے سلسلے میں مولانا عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں۔

"۱۲۱۳ھ محمدی ﷺ (۱۷۸۴ء) میں اودھ میں قحط پڑ گیا تھا۔ اور شرفائے شہر تک فاقہ کشی میں مبتلا تھے اس نازک موقعہ پر رعایا کی دستگیری کے لیے امام باڑے کی عمارت چھیڑ دی گئی۔ چونکہ شریف لوگ دن میں مزدوری کرنے میں اپنی بے عزتی خیال کرتے تھے اس لیے تعمیر کا کام رات کے اندھیرے میں بھی ہوتا اور دن کے اجالے میں بھی۔ رات کے اندھیرے میں غریب و فاقہ کش شرفاء شریک ہو جاتے اور مشعلوں کی روشنی میں کام کرتے۔ اس عمارت کو نواب نے جیسے خلوص و عقیدت اور جوشِ دینداری سے بنوایا تھا۔ ویسے ہی خالص اور سچے دل سے لوگوں نے تعمیر بھی کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایسی نفیس اور شاندار عمارت بن کے تیار ہو گئی جو اپنی نوعیت میں بے مثل اور نادر روزگار ہے۔"

(گذشتہ لکھنؤ صفحہ ۷۱ لکھنؤ گزیٹر ۲۰۲۔ ایچ۔ آر نیول)

یہ عمارت ۱۶۷ فٹ لمبی اور ۵۲ فٹ چوڑی ہے اور اینٹ اور اعلیٰ قسم کے چونے سے اس طرح بنائی گئی ہے کہ فرش سے چھت تک لکڑی کا نام نہیں ہے اس امام باڑے کی چھت اتنی وسیع و عریض ہے لیکن اس میں کہیں بھی ستون کا سہارا نہیں لیا گیا ہے اور اسی وجہ سے یہ دنیا کی اول درجے کی تعمیرات کا ایک نمونہ بن گئی ہے امام باڑے میں سامنے کی طرف دو بڑے بڑے وسیع صحن ہیں جن پر عمدہ تراشے ہوئے پتھروں کا فرش ہے اور اندرونی صحن سے چند فٹ بلند ہے اس امام باڑے کی وضع کو پادری ہیبر نے مشرقی گوتھک کی قطع کا قرار دیا ہے۔ اس عمارت میں اونچے نکیلے گنبد ہندوؤں کے مندوروں کے شوالوں کے قطع کے ہیں اور گنبد کے مینارے مسلمانوں کی مسجدوں کے ایسے بنے ہوئے ہیں۔ بحالت مجموعی یہ عمارت نہایت مرتفع، خوش نما، شاندار اور

متناسب ہے اس عمارت میں بیچ کا دالان طولاً ۱۵۰ فٹ اور عرضاً ۵۰ فٹ سے زائد ہے آصف الدولہ نے اس امام باڑے کو دس لاکھ پونڈ کے جھاڑ، فانوس اور آئینوں سے سجایا تھا۔

امام باڑے کی آرائش کے متعلق مرزا ابو طالب لندنی (متوفی ۱۸۰۵ء) اپنی کتاب (سال تصنیف ۱۷۹۶ء) میں لکھتے ہیں۔

"اس کے تعمیر ہونے کے وقت سے اب تک ہر سال چار پانچ لاکھ روپے امام باڑے کی آرائش پر صرف ہوتا ہے۔ سینکڑوں چھوٹے بڑے سونے اور چاندی کے تعزیئے بنائے گئے اور اس قدر کانچ کے جھاڑ، فانوس اور سونے کی، چاندی کی سادہ و رنگین قندیلیں خریدی گئیں کہ جن کا حساب شمار سے باہر ہے چنانچہ اس کشیدگی کے باوجود دالان چھت سے زمین تک بھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے باوجود نواب کا دل نہیں بھرا۔ جس وقت ڈاکٹر بلین ولایت (لندن) جا رہے تھے تو نواب نے کانچ کے دو تعزیوں کی فرمائش کی جو جھاڑ، فانوس اور دیگر لوازات کے ساتھ ایک سرخ اور ایک سبز رنگ کا ہو تعزیوں کی قیمت ایک لاکھ روپے مقرر ہوئی۔ ۱۷۹۶ء میں ایک تعزیہ موصول ہوا۔ اور دوسرا اگلے سال آنا طے ہوا۔ اتفاق سے اگلے سال ۱۷۹۷ء میں نواب موصوف کا انتقال ہو گیا۔ اور یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ دوسرا تعزیہ موصول ہوا تھا یا نہیں۔" (آصفی امام باڑہ از ڈاکٹر اکبر حیدری۔ ماہ نامہ آج کل، جولائی ۱۹۷۵ء صفحہ۔ ۸)

ایک اور مورخ مرتضیٰ حسین بلگرامی امام باڑے کے بارے میں لکھتے ہیں

"ہیچ ملک را از املاک ہفت اقلیم بالی آن و رفعت و متانت و وسعت پیدا نیست"۔ (حدیقۃ الاقالیم صفحہ ۱۵۵ مطبوعہ نول کشور) (ایضاً)

مشہور سیاح ہیبر اپنے سفرنامے میں امام باڑے کی تعمیری تنوع اور خوبصورتی کے بارے میں لکھتا ہے۔

" I have never seen an Archetectural view which pleased me more from the richness and variety as well proportions and general taste of its principal features "
(Narrativ of the Journey through upper provinces of India. Vol I, Page 386 by w.herber, London 1928)

عبداللطیف خاں شوستری (جس نے نواب آصف الدولہ کے عہد میں اپنی آنکھوں سے امام باڑوں کو دیکھا تھا) نے تو یہاں تک کہہ دیا۔۔۔۔ "درتمام ایں کشور عمارتی بآن بزرگی و وسعت وروح وفضا جائی دیگر نیست۔" (تحفۃ العالم صفہ ۵۳۳ سال تصنیف ۱۸۰۱ء)

نواب آصف الدولہ بہ نفس نفیس ایام عزا میں امام باڑے کی مجلسوں میں شرکت کرتے تھے۔ ہر جمعرات کو مجلس منعقد کی جاتی تھی۔ عشرہ محرم کو ملا محمد خطا مرثیہ پڑھتے تھے ہر چند اس لکھتا ہے کہ اپنے مذہبی جوش وعقیدت کی وجہ سے نواب آصف الدولہ بڑے شد و مد کے ساتھ تعزیہ داری کرتا تھا۔ اور بعض مرتبہ سینہ کوبی کی وجہ سے لہولہان ہو جاتا تھا۔" (چہار گلزار شجاعی صفحہ ۲۵۴)

آصف الدولہ کے مذہب شیعہ میں اس گہرے انہماک کو دیکھ کر دور دراز سے شیعہ علماء لکھنؤ آنے لگے اسی زمانہ میں مولوی سید دلدار علی جائسی لکھنؤ پہنچے۔ چونکہ وہ ایران وعراق سے سندِ اجتہاد لے کر آئے تھے۔ لہٰذا سرفراز الدولہ نے انہیں اپنے بیٹے کا اتالیق مقرر کیا۔ مولوی دلدار علی ہندوستان کے پہلے مجتہد تسلیم کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی تصنیف وتالیف کے کام اور اشاعت وتنظیم شیعیت کے لیے وقف کردی۔ (رود کوثر صفحہ ۴۱۹) وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ مثلاً مراۃ العقول (ملقب بہ عماد الاسلام پانچ جلدیں) اساس الاصول، تحفہ اثنا عشریہ کے مختلف ابواب وبیانات کی تردید میں چھ کتابیں اور رسالے 'شہاب ثاقب' رسالہ ذہبیہ وغیرہ وغیرہ (رود کوثر) صفحہ ۵۱۹) جب ۱۷۸۵ء میں امام باڑہ آصفیہ اور جامع مسجد کی تعمیر مکمل ہوگئی تو مولوی دلدار علی کو امام جمعہ وجماعت مقرر کیا گیا۔ اور باقاعدہ اہل تشیع کی نماز ہونے لگی۔ ہندوستانی شیعوں کا یہ پہلا موقع تھا۔ جب ان کے پیش نماز کے پیچھے انہوں نے نماز باجماعت پڑھی۔

مولوی عبدالحیٔ مولف گلِ رعنا کا بیان ہے۔

"شاہ علی اکبر چشتی مودودی کے مشورے اور ملا محمد علی فیض آبادی کی تحریک سے حسن رضا خاں (نواب کے نائب) نے جمعہ اور جماعت قائم کیں۔ سب سے پہلے مولوی سید دلدار علی نصیر آباد کی اقتداء میں ۱۳ رجب ۱۲۰۰ھ کو نماز ادا کی۔ یہ پہلا دن تھا کہ وسط ہند میں شیعوں نے اپنا جمعہ اور جماعت علیحدہ کرلی۔

نائب امام کی حیثیت سے مجتہدین کے ہاتھ میں زمام حکومت دے دی۔"

اسی طرح نواب ہر سال عزاداری میں کئی لاکھ روپے صرف کرتا تھا (تاریخ اودھ جلد ۳ صفحہ ا تفضیح الغافلین ۱۱۵) بہو بیگم (والدہ) سالانہ تعزیہ داری کی مجالس میں شرکت کرتیں اور فاتحہ پڑھتی تھیں۔ (تاریخ فرح بخش ا صفحہ ۲۹۳) نواب بذات خود مجلس عزا کا اہتمام کرتے تھے اور لوگوں کو شرکت کے لیے مدعو کرتے تھے۔ (اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی معاشرت ۲۲۶)

نواب آصف الدولہ کے اس اہتمام عزاداری کو دیکھ کر لکھنؤ کے بڑے بڑے امراء بھی بڑی شان وشوکت سے مجلس منعقد کرتے تھے۔ تعزیے رکھتے تھے۔ اور جلوس نکالتے تھے۔ امام باڑہ آصفیہ کے علاوہ اور بھی بہت سے امام باڑے تھے۔ خود مولوی دلدار علی نے ۱۷۹۵ء میں اپنا امام باڑہ بنوایا۔ سرفراز الدولہ حسن رضا خاں نے بڑے اہتمام سے ۱۷۷۹ء میں روضۂ حضرت عباس کے لیے ایک علم کربلائے معلیٰ بھیجا۔ اور اسی کی یادگار کے طور پر لکھنؤ میں روضۂ حضرت عباس کی ایک شبیہ بنوائی۔ جو درگاہ حضرت عباس کے نام سے مشہور ہوئی۔ (اردو مرثیے کا ارتقاء صفحہ۔ ۱۴۴)

ساتویں محرم کو حضرت عباس کی درگاہ میں علم چڑھائے جاتے تھے (غلام علی نقوی) اور ہر جمعرات خصوصاً نوچندی کو وہاں عورتوں کا مجمع ہونے لگا۔ ایام عزا میں بھی توسیع کی گئی اور پہلی محرم سے آٹھویں ربیع الاول کی تاریخیں عزاداری کے لیے مخصوص کردی گئیں۔ لیکن ان کے علاوہ سال بھر مجالس عزا کا سلسلہ رہتا۔ اور بعض مخصوص تاریخوں میں جلوس عزا بھی نکلتے۔ عزاداری اور تعزیہ داری امراء و روساء کے علاوہ سبھی عوام کی مذہبی زندگی کا جزو بن گئی۔ شیعہ سنی' ہندو سبھی مل کر عزاداری کرتے اور تعزیے اور دوسری شبیہیں نکالتے۔ (دبستانِ عشق کی مرثیہ گوئی صفحہ۔ ۴۹)

آصف الدولہ کے بعد نواب سعادت علی خان فرمانروائے اودھ تھے جنہوں نے وزیر علی خان کی معزولی کے بعد زمام حکومت سنبھالی ان کے بارے میں شرر لکھتے ہیں۔

"نواب سعادت علی خان اودھ کے تمام فرمانرواؤں سے زیادہ بیدار مغز و مدبر اور اس کے ساتھ نہایت ہی کفایت شعار' جزرس بلکہ بخیل کہے جاتے

ہیں۔ملک کا انتظام انہوں نے غیر معمولی ہوشیاری اور خوبی و شائستگی سے کیا۔اوراس میں ذرا شک نہیں کہ اگر ان کو آخری عہد تک پورا اطمینان نصیب ہو جاتا تو تمام گذشتہ بدنظمیاں اور خرابیاں دور ہو جاتیں۔اور وہ ملک کی پوری پوری اصلاح کر جاتے۔" (گذشتہ لکھنؤ صفحہ ۸۲)

مرزا قتیل کے الفاظ میں ان کے عہد میں اودھ اثنا عشریوں کی کثرت کی وجہ سے ("رشک شیراز و اصفہان") بنا ہوا تھا۔ اسی وجہ سے مرزا محمد حسین کربلائے معلیٰ سے یہاں تشریف لائے۔(اٹھارھویں صدی میں ہندوستانی معاشرت۔۲۶۶)

سعادت علی خان کو اہل بیت رسول سے بے انتہا محبت تھی۔اوران کی اس عقیدت کا احترام انگریز بھی کرتے تھے۔لہذا ان کی خوشنودی کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی نے عشرہ محرم میں کلکتے میں شراب کی فروخت ممنوع قرار دی تھی۔(بحوالہ اردو مرثیے کا ارتقاء۔۱۴۴ سید کمال الدین حیدر سوانحات سلاطین اودھ جلد اوّل ۱۵۰)

انہوں نے درگاہ حضرت عباس کی تعمیر بھی کروائی۔اور مرزا فقیر بیگ کا مکان جہاں ساتویں محرم کو شہر کے تمام علم جمع ہوتے تھے۔وہاں نواب سعادت علی خان نے ایک عالیشان عمارت تعمیر کروائی۔جس کا گنبد طلائی تھا۔اور وسیع صحن کو پختہ دیواروں سے گھیر دیا گیا تھا۔(عماد ۷۲ تاریخ اودھ ۱۳۰) تال کٹورے کی کربلا بھی اسی زمانہ میں بنی۔اس طرح نواب سعادت علی خان کے عہد میں بھی عزاداری کو فروغ حاصل ہوا۔اور اپنی کفایت شعاری اور جزرسی کے باوجود اہل فضل وکمال کی پرورش کا سلسلہ بھی جاری رہا اوران صفات میں ان کا مقام کسی پیش رو فرمانروائے اودھ سے فروتر نہیں۔(اٹھارھویں صدی میں ہندوستانی معاشرت صفحہ۔۲۶۸)

اودھ میں یوں تو عزاداری کا سلسلہ برہان الملک ہی سے شروع ہو گیا تھا۔آصف الدولہ کے یہاں اس کا رنگ ذرا اور گہرا ہو گیا۔لیکن بقول شرر غازی الدین حیدر وہ فرمانروا ہے جس کے زمانہ سلطنت میں شیعی عناصر نے نمود حاصل کی۔اس کے ساتھ ساتھ شرر اس بات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں کہ اگرچہ دہلی میں ایرانی امراء شروع ہی سے اہم حیثیت رکھتے تھے۔فارسی زبان سرکاری زبان تھی۔اور ایرانی ادب وتہذیب سکۂ رائج الوقت کی حیثیت رکھتے تھے۔لیکن خالص

مذہبی حدود میں وہ بے تکلفانہ آزادی حاصل نہیں تھی۔جو کسی خالص شیعہ حکومت میں ہو سکتی تھی۔ماوراء النہری رقابتیں بھی اپنا کام کرتی رہتی تھی۔اور آخر میں تو اس آویزش کے اثرات ذرا کھل کر نمایاں ہونے لگے تھے لیکن دربار لکھنؤ میں اور خاص طور سے غازی الدین حیدر کے زمانے سے وہ فضا بھی مل گئی جس میں عقیدوں کو پوری تفصیلات اور آب وتاب کے ساتھ پھولنے پھلنے کا موقع ملتا ہے۔(گذشتہ لکھنؤ۔صفحہ۔۱۱)

چنانچہ اب تک جہاں فرنگی محل کے علماء کو اہمیت حاصل تھی۔ وہاں خاندان اجتہاد (مولوی دلدار علی کا خاندان) عروج پانے لگا۔ یہاں تک کہ انہیں سلطنت کا اصلی مقنن قرار دیا گیا۔چونکہ بادشاہ اور بیگم دونوں ہی کو مذہبی معاملات میں بے حد شغف تھا اس لیے بادشاہ نے دریا کنارے اور موتی محل کے متصل نجف اشرف کی نقل لکھنؤ میں بنوائی۔اس کی روشنی اور خدمت کے لیے بادشاہ نے بہت سا روپیہ سرکار انگریزی کے حوالے کیا جس کی بدولت آج تک وہ بارونق اور آباد ہے عمارت اپنی عظمت وجبروت میں بے مثال ہے اب بھی یہاں باقاعدگی سے مجالس ہوتی ہیں۔ماہ محرم میں نظر فریب روشنی ہوتی ہے اور تبرک تقسیم ہوتا ہے جس کے مصارف بادشاہ اور ملکہ کے علیحدہ علیحدہ قائم کردہ ٹرسٹ سے کیے جاتے ہیں۔(قدیم لکھنؤ کی تعزیہ داری از جعفر حسین ماہ نامہ آج کل جنوری ۸۷ء صفحہ۔۴) روضۂ شاہ نجف کے علاوہ غازی الدین حیدر شاہ نے قدم رسول اوران کے وزیر معتمد الدولہ آغا میر نے کربلا کی تعمیر کی تھی۔

غازی الدین حیدر کے بعد نصیر الدین حیدر تخت نشین سلطنت ہوئے۔نصیر الدین حیدر کی عیش کوشی اور لہو ولعب کی داستانوں سے قطع نظر اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ لکھنؤ کا یہ بادشاہ اپنے مذہبی عقیدہ میں بڑا پختہ تھا اور بہت ہی کروفر کے ساتھ عزاداری کرتا تھا۔محبت اہل بیت اس کا مسلک تھی۔یہ اہل بیت سے اس کی محبت ہی کا اثر تھا کہ تخت نشین ہوتے ہی اس نے عزاداری کو فروغ دینا شروع کیا اور سلطنت کے ہر شعبہ میں مذہبی اثرات رونما ہوئے یہاں تک کہ وضع قطع پر بھی اس کا اثر پڑا۔اور ٹوپیوں کی ساخت بدل گئی۔ اس سلسلے میں مولوی عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں

"رد خلفائے اربعہ کی مخالفت اور پنج تن کی محبت میں لکھنؤ کی درباری معاشرت نے

چار کے عدد کو بُرا اور پانچ کے عدد کو محبوب بنا دیا تھا۔ جس کا اثر ٹوپی پر یہ پڑا کہ بر بنائی بعض مستند روایات خود جہاں پناہ کی ہدایت کے مطابق اس چوگوشیہ ٹوپی میں چار کے عوض پانچ پان کر دیئے گئے۔ اور نام بھی بہ جائے چوگوشیہ کے پنج گوشیہ قرار دیا گیا۔'' (گذشتہ لکھنؤ صفحہ ۳۰۶۔ یہاں مولوی صاحب سے چوک ہوگئی۔ شیعہ خلفائے رابعہ کے نہیں بلکہ خلفائے ثلاثہ کے شاکی ہیں۔ لہٰذا چوگوشیہ ٹوپی کی مخالفت نہیں ہوئی۔ کیونکہ خلفائے رابع تو خود حضرت علیؑ ہیں۔ اگر چوگوشیہ ٹوپی ہوتی تو یہ بات درست سمجھی جاسکتی تھی۔ البتہ پنج گوشہ ٹوپی کا رواج اس لیے پڑا کہ اس کے پیچھے پنج تن سے محبت کا جذبہ کارفرما ہے۔)

اس کے علاوہ دریا پار محلہ ارادت نگر میں ایک کربلا بنائی جو پار والی کربلا کے نام سے موسوم ہے بادشاہ کو بچپن ہی سے مراسم عزاداری سے دلچسپی تھی اس نے اپنی کم سنی ہی میں یہ منت مانی تھی کہ اگر اس کو تخت شاہی ملے گا تو معمولی عشرے کے بجائے اربعین تک سوگ منائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ تخت نشینی کے بعد نصیرالدین حیدر نے ایامِ عزا اربعین تک قرار دیئے۔ ''شباب لکھنؤ'' میں اس عزاداری کی تفصیل یوں درج ہے۔

''شراب نہیں پیتے تھے دعوتیں نہیں دیتے تھے۔ اور عیش و عشرت کے جن سامانوں کے بڑے دل دادہ تھے ان سب کو ترک کیے رہتے تھے اسی طرح انگریزی مذاق کی جتنی باتیں بالطبع ان کو مرغوب تھیں ان سب کو چھوڑ دیتے تھے۔'' (صفحہ ۱۴۸)

ایک جگہ مجالس عزا کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

''یہ عجیب سیر ہوتی تھی کہ بادشاہ سلامت ماتمی لباس پہنے اور سر پر مور کے پروں کا تاج رکھے ہوئے واقعہ خوان کے روبرو بیٹھے ہوئے ہیں ان کے پیچھے کثرت سے ہندوستانی ملازم بیٹھے ہیں کہ جو دو دو کی قطار باندھے' گردنیں جھکائے نظریں نیچی کیے اور غمگین صورت بنائے امام باڑے میں داخل ہوتے تھے۔ اس وقت جھاڑوں اور موی شمعوں کی تیز روشنی میں یہ سماں نہایت پرلطف اور اس وقت کا عالم سکوت قابل دید ہوتا تھا۔ اس سکوت کو واقعہ خوان پہلے اپنی دردناک آواز سے توڑ دیتا تھا اور سامعین بالکل خامشی کے ساتھ سراپا مغموم و حزیں بنے اور ہمہ تن گوش ہو کے سنتے تھے۔ اس وقت روشنی کی تاب و تابش میں بڑی بڑی پگڑیوں کی شان اور امام باڑے کے

ساز و سامان کی چمک دمک، زرنگار علموں کے پٹکوں کی تڑپ عجب لطف دکھاتی تھی۔'' (شباب لکھنؤ ۱۴۷۔ ایسے ہی منظر کو دیکھ کر میر حسن علی نے لکھا تھا ان چیزوں کو دیکھ کر طلسمی ایوانات بارہا میری آنکھوں کے نیچے پھر گئے۔ جو الف لیلیٰ کی داستان کو پڑھکر ذہن میں منقش ہو جاتے ہیں۔)

بیگمات شاہی کے امام باڑے محلات کے اندر علیحدہ علیحدہ تھے اور وہاں کے مجلسوں میں عورتیں حدیث خوانی اور مرثیہ خوانی کیا کرتی تھیں۔ ان عورتوں کا دستور تھا کہ تکلیف و مصیبت رنج و غم و حسرت کو ظاہر کرنے کی ایک صورت امام مظلوم کے غم میں ظاہر کرتی تھیں۔ چنانچہ جب مسز میر حسن علی نے ان عورتوں سے پوچھا کہ ''زمانہ محرم میں تم کبھی اپنے مردہ بچوں یا والدین کا خیال نہیں کرتیں۔ اور ان کی یاد کیونکر بالکل فراموش کر دیتی ہو'' تو اس کا جواب اُن کو یہ ملا کہ ''ہماری اشکباری اور گریہ و زاری تو صرف اہل بیت رسول ﷺ کے حصے میں پڑ چکی ہے اب بھلا اپنے ذاتی صدمات اور مصائب کی فکر کیونکر ہو سکتی ہے؟'' (شباب لکھنؤ۔ ۱۴۸)

بیگمات شاہی کے علاوہ عام عورتیں بھی بڑھ چڑھ کر تعزیہ داری کرتی تھیں ایک عقیدت مند عزادار خاتون کریمن کا ذکر تاریخوں میں ملتا ہے جو بڑی دھوم دھام سے تعزیہ داری کرتی تھی۔ اس کی رسائی تقریباً ہر محل میں تھی۔ اور رواج زمانہ کے مطابق مجلس میں ہر ادنیٰ و اعلیٰ جاسکتا تھا۔ لہٰذا وہ کل محلات کو مدعو کرتی تھی۔ اور تعزیہ بھی اٹھاتی تھی۔ اس سلسلے میں شیخ تصدق حسین لکھتے ہیں۔

''(اس نے) اپنا تعزیہ اٹھانے میں یہ جدّت کی کہ سوائے عورتوں کو اس میں دخل نہ تھا۔ یہ تعزیہ تیرھویں محرم کو شب کو رات گئے اس وقت اٹھایا گیا جب شاہراہوں پر بالکل سناٹا ہو گیا تھا۔ اس سبب سے تمام عورتیں جمع ہو گئی تھیں۔ تعزیہ مصری کی بنایا گیا تھا ہر سال اس کے تعزیہ میں دس بارہ عورتیں شریک ہوتی تھیں۔ تعزیہ کے ہمراہ شاہی گارڈ کے سپاہی بھی عورتوں کے آگے اور پیچھے تھوڑے فاصلے پر ہوتے تھے۔ تعزیہ کی جلوس بردار عورتیں ہی ہوا کرتی تھیں اس لیے جلوس زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ مگر عورتوں کی کثیر تعداد کی وجہ سے اس تعزیہ نے خوب شہرت پائی۔ کریمن اپنا تعزیہ عہد واجد علی شاہ تک اپنی زندگی بھر اٹھاتی رہی۔ اس کے بعد ایک دائی نے اٹھانا شروع کیا۔ ایک زمانہ تک عورتوں کے اس تعزیہ کا رواج رہا۔ انیس بیس صفر کی درمیانی شب میں رات گئے مفتی

گنج سے اٹھ کر یہ تعزیہ کربلائے میر خدا بخش کو جاتا تھا۔ تقریباً ڈھائی تین سو عورتیں تعزیہ کے ہمراہ ہوتی تھیں۔ اور صرف دو تین موی شمعیں روشن ہوتی تھیں۔ سب عورتیں برہنہ پا برہنہ سر ہوتی تھیں اور سب کے سر کے بال کھلے ہوئے شانوں پر بکھرے ہوتے تھے۔ یہ تعزیہ تاریکیٔ شب میں تخمیناً ساڑھے تین بجے کربلا پہنچ جاتا تھا۔ تعزیہ کے ساتھ عورتیں بھی نہایت خوش اسلوبی سے پر درد لہجے میں نوحہ خوانی کرتی تھیں۔ بعد میں تعزیہ تو بند ہو گیا۔ البتہ ۲۸/۲۹ صفر کو درمیانی شب میں احاطہ مرزا علی خان سے قریب ڈیڑھ بجے سیاہ پوش عورتیں نوحہ پڑھتی ہوئی تابوت لے جانے لگیں۔ یہ تابوت پہلے معصری کی بغیا جاتا تھا۔ پھر نجف واقع محلہ نواز گنج میں جانے لگا۔" (سرفراز محرم نمبر ۱۳۵۵ھ لکھنؤ میں اربعین تک عزاداری کا سلسلہ از شیخ تصدق حسین)

غرضیکہ یکم محرم سے تمام مومنین مع بادشاہ سلامت کے ایسے مغموم نظر آئے تھے۔ گویا تمام دنیا کے عیش و عشرت اور کاروباری زندگی سے دفعتاً محروم کر دیئے گئے ہوں۔ گلی کوچے سنسان ہو جاتے تھے۔ تمام لوگ صرف امام باڑوں یا مجالس عزا میں شریک نظر آتے تھے وہ معمولی چارپائیوں پر لیٹتے تھے۔ مزے دار کھانے پکنا موقوف ہو جاتے تھے۔ جو کی روٹی، ابالے ہوئے چاول وغیرہ پر دس دن بسر اوقات کی جاتی تھی۔ عورتیں اپنے زیور بڑھا دیتی تھیں۔ اور آرائش سے ہاتھ اٹھا لیتی تھیں۔ خود بادشاہ کا یہ عالم تھا کہ بقول رجب علی بیگ سرور

........"تا اربعین دن رات رونا۔ زمین پر سونا۔ لباس آبی و سیاہ، لب پر نالہ و آہ۔ بھولے سے نہ مسکرانا، ہزاروں روپیہ مرتبہ خواں اور سادات محتاجِ آب و نان کو دینا، حسنات لینا، دو ازدہ امام کی درگاہ، صاحب الامر کا غار بنوانا۔ لاکھوں روپے کا اسباب وہاں چڑھایا۔" (فسانہ عبرت بحوالہ شباب لکھنؤ۔ ۱۸۱)

دوسری محرم کو گلیوں میں پھر بھیڑ نظر آتی تھی۔ اور لوگ سیاہ ماتمی لباس پہنے تعزیوں کے جلوس کے ساتھ ساتھ چلتے پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ بادشاہ سلامت کا تعزیہ جو انگلستان سے بن کر آیا تھا سبز بلور کا ڈھلا ہوا تھا۔ اور اس پر سنہرا مینا کیا ہوا تھا۔ سب لوگ بڑے احترام سے اس کی زیارت کرتے تھے۔ تمام شاہی تعزیئے محرم کے زمانہ میں قبلہ رو رکھے جاتے تھے۔ شاہی تعزیئے کے اوپر ایک سبز مخمل کا کارچوبی شامیانہ تنا ہوتا تھا۔ سامنے کی طرف ایک منبر رکھا جاتا تھا۔ جہاں

مرثیہ خوان یا ذاکر ہوتا تھا جو اس پر بیٹھ کر واقعۂ شہادت بیان کرتا تھا۔ اس زمانے کے تعزیوں کے متعلق "شباب لکھنؤ" میں مرقوم ہے کہ تعزیئے کے نیچے اکثر نشانات شاہی ملک عرب کے جیسے زرتار، عمامہ و دستار آفتاب کا نقشہ اور جواہر نگار اسلحہ رکھے نظر آتے ہیں یہ گویا اس بات کی شہادتیں ہیں کہ آئمہ مظلوم کو مسلمانوں کے خلیفہ برحق ہونے کا جائز استحقاق تھا۔ (صفحہ ۱۴۶)

پانچویں محرم کو درگاہ حضرت عباس میں تمام لکھنؤ کے علم چڑھائے جاتے تھے۔ عشرہ محرم کو ایک شاندار جلوس نکلتا تھا۔ "اس جلوس میں سب سے آگے چھ سات ہاتھی ہوتے۔" جن پر مغرق جھولیں یا کھریں پڑی نقرئی۔ طلائی ہودے، عماریاں کسی اور گلے میں نقرئی گھنٹے اور ہیکلیں ہوتی تھیں۔ ہر ایک ہاتھی پر کچھ لوگ جواہر نگار علم ہاتھوں میں لیے سوار ہوتے تھے۔ اور ان کے ہمراہ سپاہیوں کا ایک گارڈ ہوتا تھا۔ ہاتھیوں کے پیچھے ایک شخص خاص طور پر سوگوار بنا ہوتا تھا۔ اس شخص کے ہاتھ میں بانس کی ایک چھڑ، سیاہ کپڑے سے منڈھی ہوتی تھی۔ اس چھڑ کے اوپر ایک بالٹی کمان میں دو ننگی تلواریں لٹکتی ہوتی تھیں۔ اس کے پیچھے خود بادشاہ سلامت ہوتے تھے۔ ان کے گرد و پیش خاندان شاہی کے لوگ اور مقرب علمائے مذہب ہوتے تھے۔ ان کے پیچھے ایک گھوڑا جسے دلدل کہتے ہیں ہوتا تھا اس گھوڑے کے پیچھے ملازمانِ شاہی کی ایک جماعت اور پھر فوج کے سواروں، پیدلوں کی اور تماشائی خلقت کا انبوہ کثیر ہوتا تھا۔ (شباب لکھنؤ صفحہ ۱۵۰۔۱۴۹)

مختصر یہ کہ مراسم عزاداری اس زیادتی سے کئے جانے لگے تھے کہ شہنشاہ شاہ عالم کے صاحبزادے مرشد زادے آفاق مرزا سلیمان شکوہ ۱۲۰۵ھ میں بیت السلام دلّی سے ہجرت کر کے لکھنؤ پہنچے تو انہوں نے بھی شاہی عقائد کو قبول کر لیا۔ اور اپنی شاہزادی کی شادی شاہ اودھ سے کر دی۔ چونکہ نصیر الدین حیدر الدولہ انتقال کر گئے۔ لہٰذا ان کے بعد نواب سعادت علی خاں کے بیٹے نصیر الدولہ محمد علی خاں تخت نشیں ہوئے۔ محمد علی بوڑھے اور تجربہ کار تھے۔ اس لیے اس عمر میں مذہبی رجحان کی شدت تعجب خیز امر نہیں۔ تخت نشینی کے دوسرے ہی برس انہوں نے چھوٹا امام باڑہ تعمیر کروایا۔ جو حسین آباد مبارک مشہور ہے۔ یہ امام باڑہ صنعت گری اور اپنے حسن و جمال کے لیے ممتاز حیثیت کا مالک ہے۔ اس کا رقبہ دوسرے امام باڑوں کے مقابلے میں کم ہے اس محرم میں گھٹی ہوئی روشنی بیحد جاذب نظر آتی ہے اس کے علاوہ یکم محرم کو یہاں کی موی ضریح کا جلوس ایام عزا کا

نقیب ہوتا ہے۔(آجکل جنوری ۷۸ء صفحہ ۴۴) حسین آباد کے پھاٹک سے رومی دروازے تک دریا کے کنارے کنارے ایک سڑک نکالی جو چوک کہلاتی تھی۔ اسی سڑک پر باوجود دو طرفہ عالیشان مکانوں کے ایک طرف رومی دروازہ آسف الدولہ کا امام باڑہ اور اس کی مسجد تھی تو دوسری طرف ست کھنڈا اور حسین آباد کا پھاٹک تھا۔ اس لیے امام باڑہ کی مختلف سر بفلک عمارتیں تھیں۔اور ان کے پہلو میں جامع مسجد واقع تھی ان سب عمارتوں نے مل کر دونوں جانب ایک ایسا خوش نما اور نظر فریب منظر پیدا کر دیا تھا۔ جو دنیا کے تمام مشہور و خوش سواد مناظر پر چشمک زنی کرتا تھا۔(گذشتہ لکھنؤ صفحہ ۹۴)

اس کے علاوہ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ علماء کی طرف سے جو بے توجہی نصیر الدین حیدر کے عہد میں پیدا ہو گئی تھی۔ اس کی تلافی بڑے اخلاص کے ساتھ محمد علی شاہ نے کی۔ عتبات عالیات کی طرف بھی توجہ ہوئی اور علماء کی طرف بھی۔ اسے اگر آصف الدولہ کی روایت کے احیاء کے نام سے یاد کیا جائے تو مطابق واقعہ ہوگا۔(امجد علی شاہ صفحہ ۷۶)

محمد علی شاہ نے اپنے ولی عہد امجد علی کو تعلیم دلانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔اور انہیں بچپن ہی سے علماء و فضلا کی صحبت میں رکھا۔لہٰذا تخت نشیں ہوتے ہی امجد علی شاہ نے حکومت کو ایک شرعی اساس پر چلانے کی نہ صرف ایک باضابطہ اور محکم کوشش کی۔ بلکہ اس پر عمل بھی کیا۔سلطنت کے جواز کو شک و شبہ سے بالاتر قرار دینے کے لیے یہ حل تجویز کیا کہ تخت سلطنت سلطان العلماء سید محمد صاحب مجتہد العصر (فرزند غفران مآب مولوی سید دلدار علی) کو سونپ دیا جائے۔مگر قبلہ و کعبہ نے اپنی طرف بڑھتے ہوئے تاج کو اپنے ہاتھ سے ان کے سر پر رکھا اور عہد و پیان لیا کہ حکومت فقہ جعفری کے نظام الٰہی پر ہو۔(تاریخ سلطان العلماء صفحہ ۴۴)

امجد علی شاہ کے اسی عمل کو دیکھ کر مولوی شرر نے امجد علی شاہ کو بادشاہ کی بجائے "ایک ثقہ مولوی" قرار دیا ہے۔اور اس مذہبی رجحان کو کچھ سراہا نہیں۔ بلکہ لکھتے ہیں "عنان حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد ان (امجد علی شاہ) کا جو کچھ حوصلہ تھا یہ تھا کہ وہ اور ان کے ساتھ ساری رعایا جناب قبلہ و کعبہ کی حلقہ بگوش ارادت بن جائے" (گذشتہ لکھنؤ صفحہ ۹۵) ایک شرر تو کیا اکثر مورخین کو بادشاہ کا یہ مذہبی رجحان پسند نہیں آیا۔لیکن تعجب ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو اورنگ زیب کی

سخت گیر مذہبی پالیسی کے قصیدے پڑھتے ہیں انہیں امجد علی شاہ کی مذہب پسندی سے کیوں بیر ہے؟ اگر امجد علی شاہ کے اس عمل سے عوام کا کوئی نقصان ہوتا یا خوش حالی ختم ہو جاتی یا مذہب کی آڑ میں دیگر فرقوں کے ساتھ ظلم و تشدد روا رکھا جاتا' تعصب سے کام لیا جاتا تو یہ امر اعتراض بجا بھی تھا۔لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ امجد علی شاہ تو کیا لکھنو کے کسی نواب کے دور میں مذہبی معاملات میں عوام کے ساتھ کسی قسم کی سختی یا زیادتی نہیں کی گئی۔ بلکہ مذہبی آزادی اور رواداری سے کام لیا گیا (خود شرر بھی اس کے معترف ہیں) تو پھر امجد علی شاہ پر یہ الزام کیوں؟

یہ حقیقت ہے کہ امجد علی شاہ کوئی کام سلطان العلماء سے پوچھے بغیر کرتے ہی نہیں تھے۔لیکن اس بات سے شرر بھی انکار نہیں کرتے کہ یہی وہ سب سے بڑا عنصر تھا جس نے لکھنؤ کی معاشرت میں بہت سے ایسے عناصر کی تشکیل کی جس سے وہ دہلی سے آئی ہوئی معاشرت سے ممیز معلوم ہونے لگی۔عزاداری کی وسیع الذیل تفصیلات نے زندگی کے بہت سے پہلوؤں کو بدل کے رکھ دیا۔(امجد علی شاہ صفحہ ۲۰ لکھنؤ ۱۱)

پھر خود سلطان العلماء کی شخصیت بھی کوئی معمولی نہیں تھی۔ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں "شاہان اودھ کے عہد میں ان کا وہی مرتبہ تھا جو بعض سنّی ممالک میں شیخ الاسلام کا ہوتا ہے۔شاہانِ اودھ کی رسم تاجپوشی کے وقت سلطان العلماء ہی ان کے سر پر تاج رکھتے۔مملکت کے تمام شرعی اور مذہبی امور آپ کی رائے سے طے پاتے۔محکمۂ افتاء آپ کے سپرد تھا اور آپ کی شفارش پر ہی مفتی اور اس محکمہ کے دوسرے ملازم مقرر ہوتے بادشاہ آپ کی رائے کا بڑا پاس کرتے۔" (رود کوثر صفحہ ۳۶۲)

سلطان العلماء کی ساری زندگی دینی کاموں میں صرف ہوئی اور اس دوران اودھ کے عوام کی اخلاقی اصلاح کا فرض انجام دیتے رہے۔انہیں کی تلقین و موعظت سے بہت سی زنانِ بازاری تائب ہو کر اور عقد کر کے گھریلو زندگی بسر کرنے لگیں۔حکیم مرزا محمد کاظم کا بیان ہے۔

"شراب خانے خراب اور منہدم کر دیئے گئے۔ بھنگ کی دکان تاراج' چرس کی چلمیں پامال اور تاڑ کے پیڑ قطع و مستاحل کرا دیئے گئے۔" (سوانح عمری صفحہ ۳۲)

اس کے علاوہ خزانہ شاہی سے زکوٰۃ ہر سال نکالی جانے لگی اس سے قبل کسی بادشاہ کے

عہد میں ایسا نہیں ہوا۔ یہ رقم تین لاکھ روپے سالانہ کی تھی۔ اس کے علاوہ دوسرے طریقوں سے امورِ خیر میں مصارف ہوتے تھے۔ مقدمات کو حسنِ عقیدت اور خلوصِ نیت سے فیصل کرنے کی غرض سے ایک محکمہ، محکمہ مرافعہ شرعیہ قائم کیا گیا۔ (اکرام، اسے محکمۂ اوتی اور ڈاکٹر بھٹناگر محکمۂ مرافعہ بتاتے ہیں) مولوی سید علی اکبر اس کی تفصیل یوں بیان کرتے ہیں۔

''ہر چند (سلطان العلماء مولوی سید محمد) سلاطین اودھ کے زمانے میں تبلیغ دین کرتے تھے۔ اور احکام شرح کی اشاعت کرتے تھے۔ لیکن جنت مکان (امجد علی شاہ) شاہ کے عہد میں یہ ترقی بلند منازل تک پہنچ گئی تھی۔ محکمۂ مرافعہ شرعیہ کا منصب آپ سے وابستہ ہو گیا۔ اس محکمۂ کے لیے مفتی، اہل قلم، دفتر کے اہل کار اور دوسرے ملازم مثلاً عصا بردار و خاص بردار وغیرہ مقرر کیے گئے۔ اسی طرح نشہ بندی کے لیے محکمۂ آبکاری مولوی سید باقر کو سونپا گیا جنہوں نے بڑی تاکید اور شدت سے حکم قطعی صادر فرمایا کہ تمام شراب خانے مملکتِ محروسہ میں توڑ دیئے جائیں اور سب نشہ آور چیزوں مثلاً گانجہ، بھنگ، وغیرہ فروخت روک دی جائے۔ اس کے علاوہ محکمۂ صدر شریعت مولوی محمد ہادی اور مدرسہ شاہی سید تقی کے سپرد ہوا۔ زکوٰۃ اور خیرات کی رقم کی تقسیم کے لیے ایک محکمہ قائم ہوا جو جناب سید علی تقی کو سونپا گیا۔

اس سے صاف اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حکومت کے تمام کاموں میں علماء کا عمل دخل ہو گیا تھا۔ اور وہ مذہبی نقطۂ نظر سے اس کی انجام دہی فرماتے تھے یہی وہ پہلو ہے جسے مورخین تو مورخین عام لوگوں نے بھی بنظرِ استحسان نہیں دیکھا۔ کیونکہ یہ انسانی نفسیات ہے کہ وہ مذہب کی تمام تر اہمیت کو تسلیم کرنے کے باوجود مذہبی پابندیوں سے حتی الامکان دور ہی رہنا چاہتا ہے خصوصاً روزمرہ کی زندگی میں عیش و عشرت کے جو اوقات اسے میسر آتے ہیں انہیں مذہبی پابندیوں کے سبب گنواتے ہوئے انسان کو بڑا دکھ ہوتا ہے اور جب یہ پابندی حکومت کی طرف سے عائد ہونے لگتی ہے تو کبھی قبولیت کی نگاہ سے نہیں دیکھی جاتی۔ آج ایران کی مثال ہمارے سامنے ہے امجد علی شاہ کی بھی اس مذہبی پالیسی کو تاریخ نویسوں اور تذکرہ نگاروں نے زیادہ پسند نہیں کیا۔ انگریز مورخین کو تو چھوڑ دیجئے۔ اس لیے کہ کرنل سلیمن (واجد علی شاہ اور اودھ از ورما صفحہ ۲۱ بحوالہ امجد علی شاہ صفحہ ۲۸۴۔۲۸۳) جیسے بہت سے انگریزوں کو لکھنؤ کا کوئی جشن تہوار اور دھوم اس لیے ناپسند

تھی کہ زبردست ہندو مسلم اتحاد کا یہ بڑا ابھاری ثبوت تھا لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ تمام واقعات کو بھلا دیا۔ جنہوں نے لکھنؤ کو ایک خصوصی اہمیت عطا کی۔

امجد علی شاہ کا سب سے اہم کارنامہ علمی و ادبی سرگرمیوں کی سرپرستی ہے۔ انہیں شروع ہی سے علمی کاموں سے دلچسپی تھی۔ اور ولی عہد کے زمانہ سے ہی وہ علماء کو تصنیف و تالیف کی ترغیب دلاتے رہتے تھے۔ اور اس غرض سے انہوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ایک رصد خانہ تعمیر کیا۔ جہاں مختلف قسم کی کتابوں کا ذخیرہ کیا گیا۔ وہاں متعدد کتابیں شائع ہوئیں اور کچھ ترجمے بھی کیے گئے۔ بادشاہ نے چھ ہزار روپے اشاعت کے لیے عطا کیے۔ اس کے علاوہ مدرسہ سلطانیہ کا قیام عمل میں آیا جو وقف حسین آباد کی بدولت آج بھی موجود ہے اسے ہندوستان میں مذہب امامیہ کی سب سے بڑی درس گاہ کہا جا سکتا ہے۔ اس عہد میں بیشمار کتابیں تصنیف ہوئیں اور تالیف کی تعداد کا تو اندازہ لگانا مشکل ہے حضرت رسالت مآب ﷺ اور ائمہ اطہار کی سوانح عمریاں، تفسیر قرآن، عقائد کی مبسوط کتابیں اس دور کی یادگار ہیں۔ مولانا سید علی (خلف غفران مآب) کی ناتمام تفسیر توضیح مجید تنقیح کلام اللہ الحمید کی تکمیل و اشاعت بھی اسی دور میں ہوئی۔ اس تفسیر کی یہ خصوصیت ہے کہ زبر و بینہ کے حساب سے مدح اہل بیتؑ میں ہم عدد فقروں سے تفسیر کی گئی ہے۔ مولوی امداد علی کیرانوی نے بحر المصائب کی دو جلدیں تالیف فرمائیں۔ (بحوالہ تذکرۂ بے بہا صفحہ ۱۲) علامہ محمد باقر مجلسی کی کتاب حق الیقین امجد علی شاہ کے حکم سے مطبع سلطانیہ میں چھپی۔

(پروفیسر مسعود حسین رضوی) اسی طرح مولوی سید عبداللہ کی کتاب خلاصۃ الاعمال امجد علی شاہ کے حکم سے شاہی مطبع میں چھپی۔ پروفیسر مسعود حسین رضوی نے مرزا امداد علی کے ثابت نامہ نوطرز کے دیباچہ کے حوالے سے انکشاف کیا ہے کہ یہ کتاب عہد امجد علی شاہ میں اردو ترجمہ، نسخہ چہاردہ نور، حسیب نامہ اور مختار نامہ وغیرہ کا اردو ترجمہ کیا۔ (امجد علی شاہ ۱۱۹ تا ۱۲۶) اسی زمانہ میں سلطان العلماء کے ہاتھوں بہادر شاہ ظفر نے مذہب شیعہ قبول کیا لیکن بعد میں عوامی احتجاج پر اس کی تردید کردی۔ (نگارشاتِ ادیب صفحہ ۱۹۶۔ اور ۱۹۸)۔

عہد امجد علی شاہ کا سب سے اہم واقعہ میر انیس کی لکھنؤ آمد اور مستقل سکونت ہے۔ مرزا دبیر تو عہد غازی الدین حیدر ہی سے یہاں موجود تھے۔ انہوں نے شاہی مجلس میں سب سے پہلے

مرثیہ پڑھا تھا۔ اور ملکۂ زمانیہ کی فرمائش پر معراج نامہ بھی نظم کیا تھا۔ خود امجد علی شاہ کی بلند اخلاقی، پاکیزگی کردار اور حسن سیرت سے متاثر ہو کر انھوں نے اپنے مشہور مرثیے

طغرا نویس کن فیکون ذوالجلال ہے

میں امجد علی شاہ کی مدح کی ہے۔ جس کا مقصد بادشاہ کی خوشنودی یا حصول زر نہ تھا بلکہ بقول میر افضل حسین ان دیندار عدالت شعار بادشاہ کو مرزا صاحب اس مدح وثنا کے قابل سمجھتے تھے۔ اس لیے مدح کی کہ دوسروں کو بھی نیک صفات اختیار کرنے کی رغبت ہو۔" (حیات دبیر جلد ۱ صفحہ ۹)

امجد علی شاہ کی بلندی کردار کا یہ عالم تھا کہ وہ ہر اس کام سے پرہیز کرتے تھے۔ جو خلاف شرع ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صفی احمد ایک انگریز لیوپولٹ واں آرلیک کی زبان بیان کرتے ہیں۔

"جیسے ہی ناچ شروع ہوا۔ بادشاہ اٹھ گئے۔"

(Two Kings of Awadh pg.53 اردو ترجمہ)

مسعود حسین رضوی ادیب لکھتے ہیں۔

"اسلامی شریعت رقص وسرود کو حرام اور لہو ولعب کو ناجائز قرار دیتی ہے۔ اس لیے اس عہد مین بھی یہ چیزیں شاہی سرپرستی سے محروم رہیں۔"

(لکھنؤ کا شاہی اسٹیج صفحہ ۔ ۶۵)

بادشاہ کی اس بلندیٔ کردار کا اثر امراء پر بھی پڑا اکثر امراء متقی و پرہیزگار تھے۔ منتظم الدولہ نواب مہدی علی خاں کے متعلق رجب علی بیگ سرور لکھتے ہیں۔

"واقعی مرد نماز گزار، شب زندہ دار، صائم النہار تھا۔ ہزار ہا روپیہ مکہ معظمہ و مدینہ منورہ ونجف اشرف وکربلائے معلیٰ جاتا تھا۔

اس کی بدولت سینکڑوں محتاج آرام پاتے تھے۔" (فسانۂ عبرت صفحہ ۔ ۳۵)

امجد علی کے وزیر اعظم امداد حسین خاں امین الدولہ بھی بڑے دیندار آدمی تھے۔ انھوں نے "اعمال الصالحین" مرتب کروایا۔ نیز اعمال ماہ محرم وصفر اور نوافل پنجگانہ کی اردو تالیف فرمائش کر کے موسوی سید مصطفٰی سے لکھوائیں تاکہ عوام اور عورتیں بآسانی پڑھ اور سمجھ سکیں۔ (بحوالہ

مرثیہ پڑھا تھا۔ اور ملکۂ زمانیہ کی فرمائش پر معراج نامہ بھی نظم کیا تھا۔ خود امجد علی شاہ کی بلند اخلاقی، پاکیزگی کردار اور حسن سیرت سے متاثر ہو کر انھوں نے اپنے مشہور مرثیے

طغرا نویس کن فیکون ذوالجلال ہے

میں امجد علی شاہ کی مدح کی ہے۔ جس کا مقصد بادشاہ کی خوشنودی یا حصول زر نہ تھا بلکہ بقول میر افضل حسین ان دیندار عدالت شعار بادشاہ کو مرزا صاحب اس مدح وثنا کے قابل سمجھتے تھے۔ اس لیے مدح کی کہ دوسروں کو بھی نیک صفات اختیار کرنے کی رغبت ہو۔" (حیات دبیر جلد ۱ صفحہ ۹)

امجد علی شاہ کی بلندی کردار کا یہ عالم تھا کہ وہ ہر اس کام سے پرہیز کرتے تھے۔ جو خلاف شرع ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صفی احمد ایک انگریز لیوپولٹ واں آرلیک کی زبان بیان کرتے ہیں۔

"جیسے ہی ناچ شروع ہوا۔ بادشاہ اٹھ گئے۔"

(Two Kings of Awadh pg.53 اردو ترجمہ)

مسعود حسین رضوی ادیب لکھتے ہیں۔

"اسلامی شریعت رقص وسرود کو حرام اور لہو ولعب کو ناجائز قرار دیتی ہے۔ اس لیے اس عہد مین بھی یہ چیزیں شاہی سرپرستی سے محروم رہیں۔"

(لکھنؤ کا شاہی اسٹیج صفحہ ۔ ۶۵)

بادشاہ کی اس بلندیٔ کردار کا اثر امراء پر بھی پڑا اکثر امراء متقی و پرہیزگار تھے۔ منتظم الدولہ نواب مہدی علی خاں کے متعلق رجب علی بیگ سرور لکھتے ہیں۔

"واقعی مرد نماز گزار، شب زندہ دار، صائم النہار تھا۔ ہزار ہا روپیہ مکہ معظمہ و مدینہ منورہ ونجف اشرف وکربلائے معلیٰ جاتا تھا۔

اس کی بدولت سینکڑوں محتاج آرام پاتے تھے۔" (فسانۂ عبرت صفحہ ۔ ۳۵)

امجد علی کے وزیر اعظم امداد حسین خاں امین الدولہ بھی بڑے دیندار آدمی تھے۔ انھوں نے "اعمال الصالحین" مرتب کروایا۔ نیز اعمال ماہ محرم وصفر اور نوافل پنجگانہ کی اردو تالیف فرمائش کر کے موسوی سید مصطفٰی سے لکھوائیں تاکہ عوام اور عورتیں بآسانی پڑھ اور سمجھ سکیں۔ (بحوالہ

ماہنامہ الواعظ لکھنو ستمبر ۱۹۴۶ء صفحہ ۲۶)

حکیم علی اکبر کا بیان ہے

''موصوف ہر سال اپنے اموال کی زکوۃ اور نذر نیاز کا روپیہ سید العلماء مولانا سید حسین کی خدمت میں روانہ کیا کرتے تھے۔ ہر پنج شنبہ کو سید العلماء کے مختار میر محمد حسین ایک فرد لیکر آتے تھے۔ جس میں مستحقین فقراء کے اسماء ہوتے تھے۔ اور نواب ان کے لیے پانچ سو روپے عطا کیا کرتے تھے۔'' (امجد علی شاہ صفحہ۔۱۶۴)

اس کے علاوہ موضع دریاپور میں ایک امام باڑہ تعمیر کروایا۔ جس کا سنگ بنیاد سلطان العلماء کے ہاتھوں رکھا گیا۔

امجد علی شاہ کا مذہبی جذبہ تعمیرات میں بھی کارفرما نظر آتا ہے۔ اس مین سید العلماء مولوی سید حسین کی کوششیں بھی شامل رہی ہیں۔ انھوں نے تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپیہ عراق و عرب میں نہر آصفی کی تعمیر کے لیے بھیجا۔ پندرہ ہزار تعمیرِ روضۂ حضرت مسلم وہانی، بیس ہزار روپیہ حضرت عباس کے حرم کے دروازوں کی نقرہ کاری اور ایوان کی طلا کاری کے لیے بھیجا۔ (ورثۃ الانبیاء بحوالہ ظل ممدود از مفتی میر عباس)

مولانا آغا مہدی کے سفر نامہ عراق سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ بادشاہ نے پندرہ ہزار روپے روضہ امامین عسکرین کے لیے اور تقریبا دس ہزار روضہ حُر کی تعمیر کے لیے بھی روانہ کئے تھے۔ (ایضاً ۱۱۹ء بحوالہ ماہنامہ الواعظ لکھنؤ یکم اکتوبر ۱۹۵۴ء صفحہ۔۳۱۸)

امجد علی شاہ کے بعد شاہانِ اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ تخت نشین سلطنت ہوئے۔ اور چونکہ زوالِ سلطنت اودھ انھیں کے عہد میں ہوا۔ لہٰذا تاریخ میں انھیں کی ذات کو ہدفِ ملامت بنایا گیا اس میں کچھ انگریزوں کی شرارت تو تھی ہی، بعض ہندوستانی مورخین بھی شامل ہوگئے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ'' جس زمانہ میں ان کی سلطنت کا خاتمہ ہوا ہے۔ ان دنوں ہندوستان کی تمام وطنی قوتیں ٹوٹ رہی تھیں۔ اور بری بھلی سب طرح کی قدیم حکومتیں دنیا سے مٹی جاتی تھیں پنجاب مین سکھوں کا اور دکن مین مرہٹوں کا دفتر کیوں الٹا؟ جو بہادر اور زبردست اور ہوشیار مانے جاتے ہیں؟ دہلی میں مغل شہنشاہوں کا اور بنگال میں نواب ناظم بنگالہ کا...... استیصال

کے لیے دس دن کے اندر انگریزی راج کو اکھاڑ کے پھینک دیا۔ اس سے واجد علی شاہ کی حکومت کی مقبولیت اور کمپنی کی حکومت کی نامقبولیت دونوں ہی کا صاف پتہ چل جاتا ہے۔'' (بھارت میں انگریزی راج) جلد۲۔۸۴۴)

اپنے متشرع باپ کی طرح واجد علی شاہ بھی شرع کے سختی سے پابند تھے کبھی کسی نشہ آور چیز مثلاً افیون شراب وغیرہ کو ہاتھ نہیں لگایا نماز کبھی قضا نہیں کی روزے کی پابندی برابر کرتے رہے کسی پرائی عورت کی طرف دیکھنا تک گوارہ نہ کیا اسی لیے محل میں جتنی عورتیں تھیں وہ سب یا تو منکوحہ تھیں یا ممتوعہ یہاں تک کہ جو بہشتن بادشاہ کے سامنے پانی لاتی تھی اس سے بھی متعہ کرکے اسے نواب آب رساں بیگم کا خطاب دیدیا تھا ایک جوان خاکروبن جو بادشاہ کی خدمت میں آیا کرتی تھی۔ ممتوعات میں داخل ہوکر نواب مصفا بیگم کے خطاب سے متصف ہوئی۔ واجد علی شاہ کی اس متشرع پالیسی کو عیش کوشی کا نام دیا گیا حالانکہ یہ ان کی مذہب پسندی کا ایک ثبوت ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ عورتیں جو بادشاہ کے نکاح یا متعہ میں آجاتی تھیں باقاعدہ خطاب دیا جاتا۔ ان کی تنخواہ بڑھادی جاتی ان کے لیے ایک جداگانہ محل سرا بھی دی جاتی۔ وظیفے مقرر تھے۔ اور وہ ایک باعزت زندگی گزارتی تھیں۔ تعجب ہے کہ بچھڑی ہوئی عورتوں کو سماج میں ایک باعزت مقام دلانے والا بادشاہ تو تاریخ میں اپنی ''عیاشی'' کے لیے بدنام ہوگیا۔ اور ایسے حکمراں خراج تحسین وصول کرگئے جو نازک کلیوں سے اپنی سیج سجا کر انھیں مسل کر چھوڑ دیا کرتے تھے آج بھی شریف اور گھریلو عورتوں کو سوسائٹی گرل بنانے والے مرد باعزت زندگی گذارتے ہیں۔ اور واجد علی شاہ آج بھی تاریخ میں بدنام ہے۔ حالانکہ واجد علی شاہ نے شاید ہی کسی طوائف سے مجرا سنا ہو۔ سوائے موسیقی کے بادشاہ کو اور کوئی ایسا شوق نہ تھا۔ جو خلاف شرع ہو اور موسیقی کو بھی انھوں نے عیاشی کا ذریعہ نہیں بنایا۔ بلکہ ایک فنی درجہ بخشا تھا۔ واجد علی شاہ کے دور میں موسیقی نے بھی عزاداری کا لباس پہن کر سوزخوانوں کے گلوں کو برمانا شروع کردیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں عزاداری کو خاصی ترقی ہوئی۔

خود نواب واجد علی شاہ محرم میں فقیر بنتے سبز کپڑے پہنتے، گلے میں سبز جھولی ڈالتے، چھٹی تاریخ کو تھوڑی دیر کے لیے شدے ہاتھ میں لے کر اور طلائی زنجیر کمر میں ڈال کر گشت کرتے

ساتویں کو مہندی بڑی دھوم سے اٹھتی۔ شاہ اودھ بہ نفسِ نفیس اس کا گشت کرتے۔ اس کی مشایعت کرتے۔ آٹھویں کو حضرت سقائے حرم کی یاد میں لال کھاروے کی لنگی باندھ کر بہشتی بنتے اور شربت کی بھری ہوئی مشک کاندھے پر رکھ کر حاضرین کو شربت پلاتے دسویں تاریخ کو جامع آصفی میں عاشورہ کی نماز پڑھ کر ظہر کے وقت حاضری کے دسترخوان پر نیاز دیتے۔ دسترخوان پر شیر مالیں چنی جاتیں اور شیرمالوں پر کباب، پودینہ، ادرک اور مولی کتر کے رکھی جاتی تھی۔ نجف اشرف قدم رسول امام باڑہ آصفی کے آثار متبرکہ کی زیارت کے لیے تشریف لے جاتے سادات کو پہننے کے کپڑے اور زر نقد فقراء و مساکین کو نیاز کا کھانا مرحمت ہوتا۔ (سرفراز محرم نمبر ۱۴۲۵ھ صفحہ۔ ۱۵ لکھنؤ میں عزاداری از مشیر احمد علوی)

قیصر باغ کی سفید بارہ دری میں جو "بیت الحزن" کہلاتی تھی۔ مجالس عزا برپا ہوتی تھیں جن میں بادشاہ خود اپنے تصنیف کردہ مرثیے پڑھتے تھے۔ شب عاشور تن تنہا غریبوں کے گھر میں جا کر تعزیوں کی زیارت کرتے۔ اور کچھ رقم نذر چڑھاتے۔ ایام عزا میں تاج نہیں پہنتے تھے۔ ہزار ہا خوش گلو مرد و زن شاہی عزاخانہ میں سوز، مراثی، سلام کے ذریعے مصائب اہل بیت بادشاہ کو سناتے تھے۔ روتے اور رلاتے تھے پہلی محرم سے شہر میں ہر طرف مجالس شروع ہو جاتی تھیں اور فرنگی محل ٹکسال میں شب شہادت تک روزانہ مجلسیں ہوتی تھیں۔ ان کے علاوہ شاہی امام باڑوں میں بھی سوگواروں کا ہجوم رہتا تھا۔ جہاں بعد مجلس کھانا تقسیم کیا جاتا تھا ساتویں محرم کو حضرت قاسم کے نام سے مہندی کے دو تاریخی جلوس نکلتے تھے۔ پہلا نخاس سے نکل کر میر واجد علی داروغہ کے امام باڑے میں جاتا تھا۔ دوسرا جلوس آصفی امام باڑے سے نکل کر حسین آباد پر ختم ہوتا تھا۔ آٹھ محرم کو امام باڑہ آصفی، حسین آباد اور شاہ نجف میں روشنی کا منظر دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ ضریح و نقرئی طلائی علموں کی زیارت کے لیے مجمع ٹوٹ پڑتا تھا۔ دس محرم کو ٹھیک آٹھ بجے صبح حسین آباد کے امام باڑہ سے شاہی ضریح کا جلوس نکلتا تھا۔ جو کاظمین پر جا کر ختم ہو جاتا تھا تمام تعزیے تال کٹورے کی کربلا میں جمع ہوتے تھے۔ وہاں چھریوں اور تلواروں کا ماتم ہوتا تھا اس کے بعد سنیوں کے تعزیے چوک سے گزرتے تھے۔ گیارہ محرم کو آٹھ بجے شب امام باڑہ آغا باقر میں مجلس شام غریباں ہوتی۔ ۲ر صفر کو چہلم منایا جاتا جس میں چھوٹی مہارانی کا تعزیہ و دیگر تعزیے نکلتے۔ ۸ر ربیع الاول کو چوک

سے جب تعزیوں کا خاموش جلوس جاتا جو دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔

بہر حال یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ نوابین و شاہان اودھ کے دور میں لکھنؤ عزاداری کا ایک بڑا مرکز بن گیا تھا۔ اور اسی وجہ سے شیعیت کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ ڈاکٹر عمر (مصنف اٹھارویں صدی میں ہندوستانی معاشرت) کا خیال ہے کہ نواب اودھ کی کوشش کی وجہ ہی سے شیعیت کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ اور بعض شہروں میں جہاں شیعہ بالکل نہ تھے یا بہت ہی نا قابل لحاظ تعداد میں تھے۔ ان کی اکثریت ہوگئی مثلاً امروہہ، بلگرام، ہردوئی وغیرہ۔ امروہہ کے قریب ایک بستی نوگانواں سادات کہلاتی ہے جہاں نوے فی صدی مسلمان شیعہ عقائد کے ہیں۔ ان کا سلسلہ نسب بابا فرید الدین شکر گنج کے بھانجے اور داماد سید بدر الدین الحق سے جا کر ملتا ہے۔ ڈاکٹر عمر کا خیال ہے کہ یہ لوگ اسی زمانہ میں شیعہ ہوئے۔ اسی طرح امروہہ میں شاہ ولایت کا خاندان۔ لیکن ڈاکٹر عمر کے اس خیال سے من و عن اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت صرف اتنی سی ہے کہ شمالی ہندوستان کے بہت سے شیعہ جو حاکمان وقت کے عتاب کے ڈر سے تقیہ میں رہتے تھے۔ نوابان اودھ کے دور میں مذہبی آزادی پا کر صرف اعلانیہ شیعیت کا اظہار کرنے لگے بلکہ عزاداری بھی زور وشور سے ہونے لگی۔ البتہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نوابان اودھ کے زیر اثر ہندو اور سنّی امراء بھی اثنا عشری عقائد میں دلچسپی لینے اور عزاداری کرنے لگے تھے۔ مثلاً خواجہ عین الدین انصاری صوبیدار بریلی سنّی ہونے کے باوجود ائمہ اطہار سے دلی عقیدت رکھتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ عشرۂ محرم میں اس کا یہ معمول تھا کہ عاشورہ کے دن وہ اپنا تمام مال و متاع، نقد و جنس، عمارات اور زن و فرزند بلکہ اپنی ذات سمیت جناب سید الشہداء کے نام خیرات کر دیتا تھا۔

(تاریخ اودھ جلد۔ ۳، صفحہ۔ ۱۵۳)

اسی طرح جھاؤلال ایک ہندو امیر بڑے تکلف سے ہمیشہ تعزیہ داری کے رسوم ادا کرتا تھا۔ (تاریخ اودھ جلد۔ ۳ صفحہ۔ ۳۴۴) نواب کے فوجی ملازمین بلا تخفیف شیعہ و سنی سب تعزیہ دار تھے۔ (عماد السعادت: ۱۲۸، ۱۶۸) ہندو عوام بھی تعزیہ رکھتے تھے۔ (ہفت تماشا ۱۵۶، مراۃ الاوضاع ۱۰۱)(Observation pg.27) بہت سے ہندو شب عاشور امام حسینؑ کے پیک بنتے تھے۔ اور ہر گوشہ، ہر مجمع، ہر موقعہ اور ہر محل پر پیک یہ خبر دیتا تھا کہ "حسینؑ شہید شد" بندیل کھنڈ کے

سارے سنّی اب تک تعزیہ دار ہیں۔ (اٹھارھویں صدی میں ہندوستانی معاشرت صفحہ ۱۶۷) مرد، عورتیں بچے سب دل کھول کر عزاداری کرتے تھے۔ چوتھے اور پانچویں محرم کو عورتیں اپنے بچوں کو امام حسینؑ کے حضور میں گروی رکھتی تھیں۔ اور انہیں منت کا ناڑا پہناتی تھیں۔ بعد میں یہ ناڑے عاشور کے جلوس میں تعزیوں کے سامنے ڈال دیے جاتے تھے۔ چھٹی محرم کو بچوں کو امام حسین کا فقیر بنایا جاتا تھا۔ اور ان کے گلے میں سبز جھولیاں ڈالی جاتی تھیں۔ آٹھویں محرم کو حضرت عباس کے علم کے نیچے بچوں کو سقہ بنایا جاتا تھا۔ سات تاریخ کو دودھ اور شربت پر حضرت علی اصغر کی نذر ہوتی تھی اور معصوم بچوں میں سب تقسیم کی جاتی تھی۔ عورتیں چاندرات ہی سے زیورات و سامانِ آرائش سے مبّرہ ہو جاتی تھیں۔ اور گھر گھر میں نوحہ و ماتم ہوتا تھا۔ عورتیں عقائد کے معاملے میں یوں بھی مردوں سے زیادہ پابند ہوتی ہیں۔ لکھنؤ کی عورتیں تو شیعی رنگ میں سرتاپا ڈوبی ہوئی تھیں۔ عام طور پر جب ان کے گھر کا کوئی فرد یا شوہر سفر پر جاتا تھا تو عورتیں اس کے بازو پر امام ضامن کا روپیہ باندھتی تھیں۔ منتیں، مرادیں اور شہیدوں کی قسمیں ان کی روز مرّہ کی زندگی کا ایک جزو بن گئی تھیں۔ رجب علی بیگ سرور فسانۂ عجائب میں اس پہلو کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک موقعہ پر عورتوں کے عقائد کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں۔

"کوئی کہتی تھی ہمارا لشکر اس بلا سے نکل گیا تو مشکل کشا کا کھڑا دونا دوں گی۔ کوئی بولی میں سہ ماہی روزہ رکھوں گی۔ کونڈے بھروں گی صحنک کھلاؤں گی۔ دودھ کے کوزے بچوں کو پلاؤں گی۔ کسی نے کہا میں اگر جیتی چھٹی جناب عباس کے درگاہ جاؤں گی۔ سقائے سکینہ کا علم چڑھاؤں گی۔ چہل منبر کر کے نذر حسینؑ کی سبیل پلاؤں گی۔" (فسانۂ عجائب، صفحہ ۲۷)

ساتویں محرم کو عورتیں خاص طور پر مہندی اٹھاتی تھیں۔ بڑی بڑی سینیوں میں مہندی پیس کر بھری جاتی تھی۔ اور بڑی بڑی رنگین تو غیں جلائی جاتی تھیں۔ ملیدہ اور دودھ پر حضرت قاسم کی نذر ہوتی تھی۔ اسی تاریخ کو تین مہندی کے جلوس بڑے اہتمام سے نکالے جاتے تھے۔ ایک حسین آباد کی مہندی۔ دوسری میر واحد علی کی مہندی اور تیسری نخاس کے کشمیریوں کی مہندی۔ مسز میر حسن علی کا بیان ہے۔

"شادی سے متعلق مہندی کی کشتیوں کے علاوہ وہ مٹھائیاں، میوؤں، چنبلی کے پھولوں

کے ہاروں، دوسری قسم کے پھولوں کے ہار جن کے نیچے آتش بازیاں پوشیدہ ہوتی تھیں۔ کشتیوں میں رکھ کر نکالی جاتی تھیں۔ اس موقع پر ایک تعزیہ بھی نکالا جاتا تھا۔ اس کے ہمراہ چاندی کی پالکیاں اور چنڈول بھی ہوتے تھے۔ ان سواریوں میں شاہی خاندان کی مستورات یا امراء کے گھر کی عورتیں ہوتی تھیں۔ ان سواریوں کے پیچھے کئی عدد بینڈ ہوتے تھے۔ اور بے حد روشنی کا اہتمام ہوتا تھا۔" (Obeservations pg. 843,54)

آٹھ تاریخ کو حضرت عباس کی یاد میں حاضری کی مجلس ہوتی تھی اس دن جو نذر دی جاتی تھی۔ وہ حاضری کہلاتی تھی۔ یہ نذر علم کے نیچے رکھ کر دلائی جاتی تھی۔ عام طور پر اس میں شیر مالیں، پراٹھے اور کباب ہوتے تھے۔ کبھی کبھی تھوڑا سی پنیر اور مولی کے پتے کتر کر رکھے جاتے تھے۔ علموں کے سامنے حلوے بھرے کونڈے بھی رکھے جاتے تھے۔ دوسرے دن یہ حلوہ غریبوں اور یتیموں میں بانٹ دیا جاتا تھا۔

دسویں محرم کو تمام تعزیوں کو بڑی دھوم دھام سے کربلا لے جایا جاتا تھا۔ اس موقع پر تجہیز و تکفین کی ساری رسمیں ادا کی جاتی تھیں۔ (تذکرۂ گلشنِ ہند) تعزیوں کو گڑھے کھود کر معہ کل تحائفِ عروسی، ہار، پھول، عطریات وغیرہ کے دفن کر دیا جاتا تھا۔ (شبابِ لکھنؤ، ۱۰۷، اعماد السعادت ۱۲۶، ۱۲۸، ۱۶۸)

اپنے مکانوں کو واپس آنے کے بعد تعزیہ دار غرباء و مساکین میں کھانا، روپیہ پیسہ اور کپڑے بطور تقسیم کرتے تھے۔ محرم کے زمانہ میں جو لباس پہنتے تھے اسے بھی خیرات دیدیتے تھے۔ (شبابِ لکھنؤ، ۱۵)

چہلم کی رسومات بھی اسی پیمانہ پر ادا کی جاتی تھیں جس طرح کسی عزیز کی وفات بعد ماتم کیا جاتا اور علم نکالے جاتے تھے (obs 1,99,100۔ فسانۂ عجائب ۱۱ رسالہ تعزیہ داری) فرمانروانِ اودھ نے اپنے مذہبی عقیدت مندی کے باعث لکھنؤ کو نہ صرف شیعیت و عزاداری کا مرکز بنا دیا بلکہ ایسی مخصوص تہذیب و تمدن کو بھی سنوارا اور نکھارا جس کے مٹے مٹے نقوش آج بھی لکھنؤ کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے اس عقیدت مندانہ مظاہروں کی وجہ سے عوام الناس نے بھی دلچسپی لی اور عزاداری لکھنؤ کے ہر باشندے کا جزو حیات بن گئی۔ اس کا اثر معاشرت،

معیشت، فنون لطیفہ، آدابِ نشست و برخواست، پکوان، لباس، ادب اور مختلف قسم کے ہنروں پر پڑا جس کے نتیجے میں لکھنؤ معاشی طور پر مالا مال ہو گیا۔

لکھنؤ کی عزاداری نے لوگوں کی معاشرت پر وہ اثر ڈالا کہ لباس اور وضع قطع میں زبردست تبدیلی آئی۔ علمائے شیعہ چونکہ ایرانی علماء کا لباس پہنتے تھے لہٰذا لکھنؤ کے اکثر ثقہ لوگوں نے بھی لباس زیب تن کرنا شروع کیا۔ ٹوپی کی ساخت میں بھی تبدیلی عمل میں آئی جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ پنج گوشہ ٹوپی عام ہو گئی۔ عورتوں نے محرم میں خاص قسم کا زیور پہننا شروع کیا۔ سیاہ اور نیلا رنگ غم اور سوگواری کی علامت سمجھے جانے لگی۔ سارا آرائشی زیور محرم کے زمانہ میں بڑھا دیا جاتا تھا۔ اس کے بدلے چاندی کے طوق نما کڑے یا علی بند پر اکتفا کیا جاتا۔ مجالس میں پان کی بجائے گوٹہ (سونف الائچی اور چھالیا وغیرہ ملا کر) بنایا جاتا جو اہلِ محفل کے سامنے پیش کیا جاتا۔ ان مجلسوں میں شرکت اور ان میں فیاضی کے ساتھ بٹنے والے تبرکات کا نتیجہ یہ ہوا کہ غریبوں اور محتاجوں کے لیے پریشانی نہ رہی۔ شرر کے بیان کے مطابق مجلسیں اتنی کثرت سے ہوتی تھیں کہ اگر کوئی شخص چاہتا اور پتہ لگاتا تو سال بھر بغیر محنت مزدوری کے محض مجالس کی کثرت سے اپنا پیٹ پال سکتا تھا۔ اور فقط فیاض و عقیدت مند شیعوں کی فیاضی پر جی سکتا تھا۔ (گذشتہ لکھنؤ۔ ۴۰۵)

لکھنؤ کی عزاداری کا سب سے بڑا اثر فنونِ لطیفہ پر ہوا۔ مختلف قسم کی فنون اور ہنر کو ترقی ہوئی۔ جس میں سُنّیوں اور اہلِ ہنود کو زیادہ مظاہرے کا موقع ملا۔ یہ حضرات اپنے پیشے کے لحاظ سے تعزیے تیار کرنے لگے۔ مثلاً شیرینی فروش شکر اور بتاشوں کے، بُھر جی جَو اور مٹر کے، درزی کٹاؤ کے، چکن ساز چکن کے، منیہار چوڑیوں کے، کمہار مٹی کے، نداف روئی کے اور نجار لکڑی کے نہایت دیدہ زیب تعزیے تیار کرتے تھے۔ ان پیشہ وروں کے علاوہ اور لوگ بھی نفیس تعزیے بناتے تھے۔ جیسے رانگہ کا تعزیہ، مینا کاری کا تعزیہ، چٹائی کے تعزیے وغیرہ۔

چٹائی کے تعزیے وغیرہ محمد بخش صدر گنج ہیں، رجب سرائے معالی خان میں، رمضانی پینس والی گلی میں، اور خدا بخش اکرام اللہ خاں کے امام باڑے کے پھاٹک میں رکھا کرتے تھے۔ ان تعزیوں کو بنانے میں سب کاریگر کھجور کی پتیوں اور مختلف رنگ کے تاگوں سے بنی ہوئی چٹائیوں کا استعمال کرتے تھے۔ موم کی بنی ہوئی ایک شاندار ضریح جس میں کاغذ پر موم کی فنی خوبصورتی کا

مظاہرہ کیا جاتا تھا۔ حسین آباد میں رکھی جاتی تھیں۔ روئی کے دو تعزیے جن میں ایک سبز منڈی کے میاں سلارو اور دوسرا سعادت گنج کے میاں رجب رکھا کرتے تھے فن میں اپنی مثال آپ تھا۔ ایک مینا کار چپ تعزیہ ٹاٹ پٹی میں غلام علی رنگ ساز کا، دوسرا راجہ بازار میں سرفراز علی کا اور تیسرا حسین آباد میں پکلے سبزی فروش کا بے حد مشہور تھا۔ سرفراز علی کا تعزیہ محمد علی شاہ کے زمانے سے رکھا جاتا تھا۔ محلہ پاٹا نالا کے رہنے والے ایک شخص حکیم نامی چوڑیوں کا تعزیہ بناتے تھے۔ محلہ چوپٹیاں میں رہنے والا ایک کمہار ٹیکا رام مٹی کا تعزیہ بناتا تھا۔ اسی طرح ایک ہندو ہرکا نے ایک لال تعزیہ بنانا شروع کیا تھا۔ اس کے علاوہ جمنا کمہار، گومتی کمہار اور منشی سرجو پرشاد نگم وغیرہ نے بھی لال تعزیہ رکھنا شروع کیا۔ اور ایک مشہور سرخ تعزیہ کسی دوسرے محلہ سے اٹھتا تھا جس میں راجہ مہرا کے خاندان کے ایک شخص لالہ ہر پرشاد لہراتی ہوئی آواز میں دو خاص مرثیے پڑھتے تھے۔

(۱) جب مشک بھر کے نہر سے عباس غازی گھر چلے

(۲) یا رب کسی کا باغ تمنا خزاں نہ ہو

پیتل کا ایک تعزیہ امین آباد کی طرف رکھا جاتا تھا۔ شہر میں سفید تعزیوں کی بھر مار تھی جن میں پاٹا نالا کی ایک مسلمان دائی پھندن اور دوسرا بھوون ٹولہ متصل پھول والی گلی میں ہندو دائی گنیشیہ کا تھا۔ یہ دونوں تعزیے اپنی خوبصورتی کی وجہ سے بے حد جاذب نظر تھے۔ گرز ماروں کی جماعت نے عہد امجد علی شاہ میں ایک کالا تعزیہ رکھنا شروع کیا۔ یہ تعزیہ جلوس کے آخر میں ہوتا تھا اس کو دیکھ کر زائرین یہ سمجھ لیتے تھے کربلائے تال کٹورا میں اب کوئی تعزیہ نہیں آ رہا ہے۔ بیسویں صدی میں یہ تعزیہ ایک رنگریز حسن کے پاس آیا۔ پھر بقر عیدی سبزی فروش نے گول دروازہ میں رکھنا شروع کیا۔ ایک اور مشہور تعزیہ موسلے کی مسجد کے قریب ایک کھلے مقام پر سجا دیا جاتا تھا۔ چونکہ یہ تعزیہ نو گز بلند ضریح کی شکل کا ہوتا تھا۔ لہٰذا نو گزا تعزیہ کے نام سے مشہور ہوا۔ جھبلداروں کا ایک مخصوص فرقہ گانا بجانا جس کا ذریعہ معاش تھا۔ ایام عزا میں اپنے پیشہ کو موقوف کر کے عزاداری کرتے تھے۔ اور ایک تعزیہ بناتے تھے جو جھبلداروں کے تعزیے کے نام سے مشہور ہے۔ اس تعزیے کے سامنے وہی لوگ نوحہ و مرثیہ خوانی کرتے تھے۔ آغا عبدالکریم خاں جو انگریزی فوج میں ملازم تھے اور لکھنؤ کی فتح کے بعد وہیں مقیم ہو گئے تھے۔ ایک تعزیہ بناتے تھے جو رسالدار کا

تعزیہ کہلاتا تھا۔ وہ خود اس تعزیے کے ساتھ سوگوارانہ انداز سے سروپا برہنہ جلوسِ عزا میں شرکت کرتے تھے۔ یوم عاشورہ محمد علی شاہ کی ضریح کے بعد سب سے پہلا تعزیہ انہیں کا ہوتا تھا۔ (ماہنامہ آج کل جنوری ۱۹۷۸ء ۵ تا ۸۔ قدیم لکھنؤ کی تعزیہ داری از جعفر حسین۔ سرفراز محرم نمبر ۱۸۶۵ء صفحہ ۴۱۔ عہد ماضی کے چند نامی تعزیے از شیخ تصدق حسین)

غرضیکہ ایسے متعدد تعزیے تھے جن کی وجہ سے لکھنؤ میں دست کاروں اور فنکاروں کو اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کا موقعہ ملا۔ اور یہی وہ خصوصیت ہے جو شاہانِ اودھ کے علاوہ کسی مسلمان بادشاہ کو نصیب نہیں ہوئی۔

شعر و ادب اور دیگر فنون پر بھی عزاداری اثر انداز ہوئی۔ اور مجالسِ عزا کی وجہ سے واقعہ خوانی، حدیث خوانی، سوز خوانی، مرثیہ خوانی اور نوحہ خوانی کے فن ایجاد ہوئے۔ مجالس ہی کی وجہ سے ذاکری کے فن کو فروغ حاصل ہوا اور مختلف ذاکر جدا جدا عنوانوں سے مصائب سید الشہداء بیان کرتے روتے اور رلاتے تھے۔ اپنے بیان کو زیادہ متاثر کن بنانے کے لیے وہ فصیح و بلیغ زبان و عبارت کا استعمال کرنے لگے۔ حدیث خوان بھی پر درد اور سوز و گداز سے بھرپور انداز میں فضائل اہلِ بیت کرنے لگے۔ واقعہ خوانی کی فصاحت نے داستان گوئی کے فن کو بھی مات کر دیا۔ مرثیہ خوانی تحت اللفظ ہوتی تھی۔ لیکن ایسی فنکاری سے کہ مرثیہ خواں چشم و ابرو اور ہاتھ پاؤں کے اشاروں سے واقعات کی ایسی زندہ تصویر سامعین کے سامنے پیش کرتے تھے کہ حاضرین کی آنکھوں سے اشک جاری ہو جاتے تھے۔ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ نے تو اس فن میں چار چاند لگا دیے۔ سوز خوانوں نے ان مرثیوں اور نوحوں کو فن موسیقی کے اصولوں میں ایسا ڈھالا کہ اس میں درد اور سوز پیدا ہو گیا۔ یہ فن اس سے قبل کہیں نظر نہیں آتا۔ سوز خوانی میں اصلی سوز خوان کے ساتھ چار آدمی آواز ملانے کے لیے ساتھ بیٹھتے تھے اور سازوں کی غیر موجودگی میں ان کی آوازیں بنیادی سر قائم رکھنے میں سوز خوان کی کافی مدد کرتی تھیں۔ چار مصرعے ایک طرز میں کہنے کے بعد سوز خوان بقیہ دو مصرعوں کو عموماً ذرا تیز سُر میں اٹھاتا تھا جس سے سامعین پر بھی اچھا اثر پڑتا تھا۔ اور مرثیے میں مسدس کی ہیئت بھی فائدہ مند ثابت ہوتی تھی۔ اس فن میں بے شمار باکمال پیدا ہوئے۔ میر علی سوز خوان اور ان کے جانشینوں نے تو سوز خوانی کے فن میں بڑا نکھار پیدا کیا۔ ان کا کمال یہ تھا

کہ وہ لوگ جن کا مجموعی تاثر خوشی کا ہوتا تھا۔ وہ بھی سوز میں ڈھل کر غم کی کیفیت ظاہر کرنے لگتا تھا۔ (دبستانِ عشق کی مرثیہ گوئی، صفحہ ۴۹) یہی وجہ ہے کہ مجالس عزا میں سوز خوانی کو خصوصی اہمیت حاصل ہو گئی۔ اور وہ لوگ جن میں علماء مجتہدین اور ثقہ بزرگ شامل تھے۔ جو راگ راگنیوں سے شرعی بنیاد پر پرہیز کرتے تھے سوز خوانی میں دلچسپی لینے لگے۔

شاعری میں مرثیہ کی صنف کو جو غیر معمولی ترقی حاصل ہوئی وہ اسی عزاداری کا نتیجہ ہے۔ اس کے علاوہ سلام، رباعی، نوحہ و ماتم وغیرہ بھی کہے جانے لگے۔ یوں ادب میں اور معیاری شاعری کا اضافہ ہوا۔ شیعیت کے زیر اثر ایک نئی صنف مرثیہ بھی ایجاد ہوئی۔

فنونِ سپہ گری نے بھی شہرت پائی۔ مثلاً تلوار بازی، چھڑی، گتکہ، بانا اور لکڑی چلانے کا فن، ڈھول، تاشے اور نقارے بجانے کا فن اسی زمانے میں ترقی پذیر ہوئے۔ امام باڑوں کی تعمیر اور آرائش و زیبائش نے دستکاروں اور کاریگروں کے لیے بہترین مواقع فراہم کیے۔ لہٰذا علم، پٹکے، نشان، تابوت، ضریح، تعزیے، ذوالجناح اور ان کے متعلقات پر توجہ ہوئی اور نئے نئے انداز سے کمال فن کا مظاہرہ کیا جانے لگا۔ جیسے علم، نہ صرف چاندی اور سونے کے بنتے تھے بلکہ ان میں نقاشیاں، طغرے اور مختلف کٹاؤ کے کام ہونے لگے۔ پٹکوں میں زردوزی کا کام، گوٹا، کناری، بنت، جالی، کرن اور گوکھرو کو طرح طرح سے استعمال کیا گیا۔ نشانوں میں جدتیں کی گئیں۔ (اردو مرثیے کا ارتقاء صفحہ ۳۰۵)

فن تعمیر کی ترقی نے برجیوں اور گنبدوں میں ندرت پیدا کی۔ جھاڑ، فانوس، کنول وغیرہ امام باڑوں میں سجائے جانے لگے جن کی وجہ سے شیشہ گروں کی صنعت کو فروغ حاصل ہوا۔ مجالس عزا میں تبرکات تقسیم ہوتی تھیں ان کی وجہ سے حلوائیوں اور نانبائیوں نے بھی اپنے فن کے مظاہرے کرنا شروع کیے۔ مختلف قسم کی مٹھائیاں، شیرمالیں، پراٹھے اور کباب وغیرہ پکائے جانے لگے۔

غرضیکہ اودھ کے فرمانرواؤں کے عہد میں عزاداری کو وہ فروغ حاصل ہوا جو شمالی ہندوستان کی تاریخ میں کہیں نظر نہیں آتا۔

٤ ۔ اتر پردیش (شمالی ہند) : اتر پردیش یعنی شمالی ہند میں شیعیت ان سادات کے ساتھ آتی گئی جو وقتاً فوقتاً ہندوستان آتے رہتے۔ ان سیّدوں نے کسی خاص صوبہ یا وسیع علاقے کو اپنا مسکن نہیں بنایا بلکہ کچھ تو حکومتِ وقت کی نظروں سے پوشیدہ رہنے کی خاطر اور کچھ سادگی پسند درویشانہ و مذہبی فطرت کے باعث انھوں نے شہروں سے دور جنگلوں اور پہاڑوں میں اپنی بستیاں بسائیں۔ ان چھوٹے موٹے دیہاتوں میں رہ کر یہ لوگ نہ صرف یہ کہ اپنی ضروریات زندگی پورا کر لیتے تھے بلکہ علمی تحقیقات کا کام نیز عزاداری بھی آزادانہ طور پر کر سکتے تھے۔ لہٰذا شمالی ہندوستان میں شیعیت اور عزاداری کے جو مرکز نظر آتے ہیں۔ وہ بڑے بڑے شہروں میں نہیں بلکہ دیہات، گاؤں یا چھوٹی چھوٹی سیدوں کی بستیاں ہیں بہر حال یہ اثرات دھیرے دھیرے شہروں تک پہنچے۔ بعض شہروں پر اس کا گہرا اثر ہوا۔ بعض پر کم۔ یہ بھی ہوا کہ گاؤں کے یہ سادات روزگار کی تلاش میں جب شہروں میں سکونت پذیر ہوئے۔ تو اپنے ساتھ عزاداری بھی لائے۔ ان مختصر سی بستیوں میں قصبہ جائس (اودھ) جوگی پورہ یا احمد پور سادات (بجنور) جونپور، امروہہ، نوگانواں سادات (مرادآباد) ہلور، نیز الہ آباد اور بنارس کے بہت سے قصبہ جات قابل ذکر ہیں۔

جون پور: میں غالباً اٹھارویں صدی عیسویں ہی سے عزاداری کو فروغ حاصل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ لیکن شیعیت نے قدم اسی وقت جما لیے تھے جب ملک اشرف خواجہ جہاں نے دہلی کی قوت کو منتشر پا کر ۱۳۹۸ھ میں اپنی خود مختاری کا اعلان کرتے ہوئے سلطنتِ شرقیہ کی بنیاد رکھی۔ اور جونپور کو پایہ تخت قرار دیا۔ اس وقت جون پور کے ماتحت قنوج، کڑہ، سندیلہ، دلمو، بہرائچ، بہار اور ترہٹ وغیرہ تھے خواجہ جہاں نے تخت نشیں ہوتے ہی ہر سال ایک مخصوص رقم حق امام عصرؑ (خمس) جمع کرنا شروع کی۔ حالانکہ اس نے خود کوئی عزاخانہ تعمیر نہیں کیا۔ لیکن ایام عزا میں اس کے محل میں بھی عزاداری ہوتی تھی۔ اور وہ خود بھی شہر کے مخصوص عزاخانوں کی مجلسوں میں شرکت کرتا تھا۔ محرم کے زمانے میں تمام شیعہ بادشاہوں کی طرح خواجہ جہاں بھی تمام کاموں کو ترک کر دیا کرتا تھا۔

خواجہ جہاں نے اپنی زندگی ہی میں ایران کے دو سیّد زادوں، سیّد مبارک اور سیّد ابراہیم کو اپنا ولی عہد مقرر کر لیا تھا۔ اور انھیں نظامِ حکومت بھی سونپ دیا تھا۔ چنانچہ اس کے انتقال کے بعد جب سیّد مبارک شاہ تخت نشیں ہوا تو اس نے بھی خواجہ جہاں کی طرف خمس اور عزاداری کو ویسے ہی برقرار رکھا۔ سیّد مبارک شاہ کو حکومت کرنے کا بہت مختصر موقع ملا۔ اس کے انتقال کے بعد سیّد ابراہیم شاہ تقریباً چالیس سال تک جونپور کے تخت پر متمکن رہا۔ اور اس دوران اس سے جہاں تک ممکن ہو سکا۔ عزاداری کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ عزاخانہ (خانقاہ نوحہ گراں) اسی کے عہد میں تعمیر ہوا۔ یہ عزاخانہ اس جگہ تعمیر کیا گیا تھا۔ جہاں ملک الشرق خواجہ جہاں اور سید مبارک شاہ شرقی کی قبریں تھیں۔ یہ ایک وسیع و عریض عزاخانہ تھا۔ یہاں شاہی تزک و احتشام کے ساتھ عزاداری ہوتی تھی۔ ابراہیم شاہ کے بعد اس کی وصیت کے مطابق اس کی قبر پر تعزیہ بھی رکھا جاتا تھا۔

ابراہیم شاہ کی مذہب پسندی اور علم پروری کی وجہ سے اکثر صوفیائے کرام دور دراز علاقوں خصوصاً دلی سے جونپور منتقل ہوئے۔ یہ سب عزاداریٔ سید الشہدا میں ایسا ہی انہاک رکھتے تھے۔ جیسا بادشاہ کو بذاتِ خود تھا۔ اسی دور میں حضرت مخدوم سید جہانگیر اشرف سمنانی جونپور پہنچے اور اپنے معمول کے مطابق مسجد میں قیام فرمایا۔ آپ کے دوران قیام میں ہلال محرم نمودار ہوا۔

• آپ نے صحن مسجد میں ایک علم نصب فرمایا اور معتکف ہو گئے عشرہ محرم بھر اعتکاف رہا۔ روزانہ شیرینی نذر کرتے اور حاضرین میں تقسیم کرتے۔ آپ کو سید الشہدا ء کی عزاداری سے خاص تعلق خاطر تھا۔ چنانچہ آپ نے جب فیض آباد ضلع کے اکبر پور علاقے میں مستقل سکونت اختیار کی تو وہاں بھی عزاداری کا اہتمام فرمایا محرم کا چاند دیکھتے ہی آپ لباس عزا پہن کر مریدین کے گروہ کے ساتھ نکلتے۔ اور علم لے کر آبادی کا گشت فرماتے تھے۔ آپ کی وجہ سے جونپور سے لے کر اطراف فیض آباد اس کے علاوہ جہاں جہاں آپ کا گذر ہوا۔ عزاداری کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ (سرفراز محرم نمبر ۱۹۴۲ء۔ علی ضامن ترمذی کے مضمون سے)

سید محمود شاہ شرقی نے بھی عزاداری کو اپنے پیش رو بادشاہوں کی طرح برقرار رکھا اور محلہ بیگم گنج میں ایک عظیم الشان عزاخانہ تعمیر کروایا۔ اس کی ملکہ راجے بی بی بھی بڑی مذہبی خاتون تھی اس نے ملا سید علی داؤد کے لیے مسجد نماز گاہ (لال دروازہ) کے متصل ایک عزاخانہ تعمیر کروایا۔

شرقی بادشاہوں میں عزاداری کو سب سے زیادہ فروغ دینے والا بادشاہ سید حسین شاہ تھا جس نے تقریباً ۲۸ سال تک حکومت کی۔ اور اس دوران ہر ممکن طریقے سے عزاداری کو ترقی دی۔ چنانچہ جامع الشرق کے دکھن پھاٹک کے سامنے ایک عزاخانہ اور تعزیہ رکھنے کا چاک تعمیر کروایا خود جامع الشرق (بڑی مسجد) میں بھی حسین شاہ کی طرف سے حوض کے سامنے ایک تعزیہ رکھا جاتا تھا جسے مولوی کرامت علی جونپوری نے انگریزی دور حکومت میں بند کروادیا۔ وہ تعزیہ اب سید حسین شاہ شرقی کی قبر کے سامنے رکھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے بزرگوں کے تعمیر کردہ عزاخانوں میں عزاداری کو فروغ دیا۔ (تاریخ عزاداری جونپور صفحہ۔ ۲۷)

۱۴۸۶ء میں جب جونپور میں لودھیوں کا اقتدار بڑھنے لگا تو سکندر لودھی نے جونپور کی اکثر خانقاہوں، مدرسوں اور خاص طور پر عزاخانوں کو اس طرح مسمار کروادیا کہ ان میں سے اکثر کی دوبارہ تعمیر ناممکن ہوگئی۔ البتہ شہزادہ حسین خان نے بعد میں ایک معمولی شہ نشین بنا کر نوحہ گراں کی عزاداری باقی رکھی۔

یہ بھی اتفاق ہے کہ لودھیوں کے بعد جونپور کا علاقہ جب مغلوں کے زیر اقتدار آگیا تو اکبر نے اسے منعم خانخاناں کو عطا کیا۔ جو شیعہ اثنا عشری تھا۔ اس نے مسجدیں اور خانقاہ ذاکراں تعمیر کروائی۔ اس دوران اور بھی شیعہ سپاہ گر جونپور میں آئے۔ مثلاً سید احسن اخوند میر جنھیں اکبر نے مالل کا علاقہ بطور جاگیر عطا کیا۔ انھوں نے مالل میں عزاخانہ تعمیر کروایا۔ اور ایران کے رواج کے مطابق ایام عزا میں ذوالجناح کی شبیہ کا جلوس بھی نکالا۔ اس خاندان کے آخری برسر اقتدار راجہ ارادت خان نے موضع انگلی میں عزاخانہ او مسجد تعمیر کی اس کے علاوہ نواب محسن خان نے (جن کو علی قلی خاں کو بغاوت فرو کرنے کے عوض علی قلی ہی کے دیوان کی حویلی بادشاہ کی طرف سے دی گئی تھی) اس حویلی کے عقب میں ایک مسجد تعمیر کرائی۔ اس کے اندر ایک چوک میں محرم اور چہلم میں عزاداری ہوا کرتی تھی۔

حکیم محمد کچال نے بھی دریائے گومتی کے کنارے ایک مسجد اور عزاخانہ تعمیر کروایا۔ اب یہ مسجد شیعہ جامعہ مسجد کہلاتی ہے۔ محمد ہاشم کے آباد کردہ محلہ باغ ہاشم کے اندرونی احاطہ میں ایک خوبصورت گنبد کے اندر نشان قدم مبارک سرور کائنات نصب ہے۔ یہاں ساتویں محرم کو

چراغاں ہوتا تھا لوگ محلہ بارہ دوریہ کے چوک سے ماتم کرتے ہوئے آتے تھے اور یہاں سے مٹی لے جا کر چوک پر نشاں بناتے تھے یہ رسم اب تک جاری ہے۔

جونپور میں عزاداری کا یہ سلسلہ عہد جہانگیر میں بھی جاری رہا۔ اسی زمانہ میں خواجہ میر کے فرزند سید علی زیارت عتبات سے واپسی پر نشان رسول اللہؐ اور نشان کف دست حضرت علی لائے اور ایک احاطہ تعمیر کروا کے اس کے اندر نشان نصب کرایا۔ یہ عمارت پنجہ شریف کہلاتی ہے یہاں خواتین و حضرات کا کافی مجمع رہتا ہے۔ خصوصاً عشرۂ محرم کے پہلے پنج شنبہ کو شہر سے تعزیے اور علم معہ طبل کے آتے ہیں لوگ مسور کی کھچڑی، پلاؤ، زردہ وغیرہ پر نذر دلاتے ہیں۔ ۲۰ رمضان المبارک کو شہادت امیر المومنین کے موقع پر بھی عزاخانہ حدّ دبلوا گھاٹ سے تعزیہ معہ طبل کے جاتا ہے۔ اور ماتم داروں کو یہاں روزہ افطار کروایا جاتا ہے۔

سید احسن اخوند میر کے خاندان کے ایک فرد نے موضع امام پور میں روضۂ امام حسینؑ کی شبیہ یعنی کربلا بنوائی جہاں اکثر مجالس عزا ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ شاہ مرتضیٰ نے حمزہ پور میں عہد شاہ عالم میں ایک زیارت گاہ بنوائی۔ جہاں حضرت امیر المومنین کا نشان دست اور حضرت عباس کے روضہ کی اینٹ لا کر نصب کی گئی ہے۔ یہاں بھی نوچندی جمعرات کو اطراف کے عزاخانوں سے علم اور طبل آتے ہیں۔ اس کے علاوہ جونپور کے متعدد شاہی اور قدیم عزاخانے جو تقریباً ۱۳۸ ہیں موجود ہیں جن میں خانقاہ نوحہ گراں، صدر امام باڑہ، مولانا نصیر صاحب (چھتری گھاٹ) کا عزاخانہ، ذوالقدر بہادر (دریبہ) وغیرہ مشہور ہیں۔ جہاں اپنے مخصوص انداز میں زمانہ قدیم سے عزاداری ہو رہی ہے اور آج بھی وہی شان باقی ہے۔ مولوی خیر الدین عابدی نے اپنی کتاب (تاریخ عزاداری جونپور) میں جونپور کی عزاداری کا بیان بڑی تفصیل سے کیا ہے۔

امروھہ: امروہہ کے متعلق صریحاً نہیں کہا جاسکتا کہ کس وقت مسلمانوں نے اس علاقے کو فتح کیا۔ البتہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جہاں جہاں مسلمان سپاہیوں کے قدم پہنچے ہیں ان میں سے کچھ سیّد یا شیعہ ضرور رہے ہیں اور اسی طرح اسلامی حکومت کے ساتھ ساتھ شیعیت بھی ہندوستان کے کونے کونے میں پہنچتی رہی چاہے وہ اعلانیہ رہی یا خفیہ طور پر امروہہ میں بھی شیعیت

اسلامی عہد کے ابتدائی زمانے سے موجود رہی ہوگی۔ لیکن باقاعدہ طور پر جو سیّد خاندان سب سے پہلے امروہہ آباد ہوا شاہ ولایت ہے۔ محمود عباسی اپنی تالیف تاریخ امروہہ (قصص الاولین لموعظۃ الآخرین) میں اس بات کا اقرار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ان میں (شیعیانِ امروہہ) سب سے قدیم تعداد میں سب سے زیادہ اور معزز و باوقار خاندان اولادِ سیّد العارفین' سیّد حسن الملقب بہ سیّد شرف الدین شاہ ولایت کا ہے۔ حضرت ممدوح کا سلسلۂ نسب حضرت امام علی نقّی سے متصل ہوتا ہے۔ اس ساداتِ نقوی کی سکونت شہر کے اکثر محلوں میں ہے۔'' (صفحہ۔۱۸۱)

حضرت سیّد شرف الدین شاہ ولایت سادات نقویہ کے مورثِ اعلیٰ غیاث الدین بلبن کے عہد میں (۱۲۶۶ء۔۶۶۴ھ تا ۱۲۸۶ء۔۶۸۶ھ) امروہہ تشریف لائے اور یہیں سکونت اختیار کی۔ ان کا قیام اور پہلا مقام اس جگہ بتایا جاتا ہے۔ جواب محلّہ بچدرہ ہے۔ (ماہ نامہ آج کل دسمبر ۱۹۷۹ء صفحہ ۱۳۲ امروہہ کی عزاداری از امام مرتضیٰ نقوی) اور یہی نہیں بلکہ امام مرتضیٰ نقوی کا خیال ہے کہ ان کے عہد میں حیدری اور جلالی فقراء کی وہ جماعتیں جو امروہہ میں موجود تھیں اور جن کے وجود کا ثبوت مشہور سیاح ابن بطوطہ کے آمد کے زمانے میں (۷۴۱ھ) ملتا ہے۔ شاہ صاحب کے ساتھ ملتان سے آئی ہونگی البتہ اس زمانہ میں باقاعدہ عزاداری اس لیے ممکن نہ تھی کہ نہ ہی شیعہ اتنی بھر پور تعداد میں وہاں موجود تھے۔ اور نہ ہی حکومت کی طرف سے کوئی مذہبی آزادی انھیں میسّر آسکتی تھی حالانکہ حسینی خاندان (جو شاہ ولایت کے فرزند اکبر قاضی سیّد امیر علی کی نسل سے ہے) کے علاوہ اس وقت اور بھی شیعہ خاندان موجود تھے۔ مثلاً خاندان نوگیاں جن کا سلسلۂ نسب سیّد عمر اشرف بن امام زین العابدین تک منتہیٰ ہوتا ہے اور شاہ صاحب کے عم محترم سیّد عزیز الدین کی نسل سے ایک بڑا خاندان جو موضع نوگانواں سادات میں آباد ہوا۔ وغیرہ وغیرہ (تاریخ امروہہ۔۱۸۱ عباسی نے سادات نوگاواں کو سیّد عزیز الدین کی نسل سے بتایا ہے۔ حالانکہ ان کا شجرۂ نسب حضرت بدرالدین الحق سے جا کر ملتا ہے جو بابا شکر گنج کے داماد تھے۔ ڈاکٹر محمد عمر نے بھی اس کی تائید کی ہے اور خود سادات نوگاواں بھی اس کو قبول کرتے ہیں۔) لیکن عزاداری کا باقاعدہ سلسلہ عہد اکبری سے شروع ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ امروہے کا قدیم امام باڑہ جو سیّد ناہر اور سیّد فیض سے منسوب ہے

اسی دور کی یادگار ہے۔ اور بقول صاحب تاریخ واسطیہ ''زمانہ ماضیہ میں کل شہر کے سادات و دیگر اشخاص مذہب شیعہ مجتمع ہو کر اسی امام باڑے میں تعزیہ داری اور ماتم داری کیا کرتے تھے۔'' عہدِ جہانگیر میں خاندانِ دانشمندان کے جد بزرگوار مولانا سیّد اشرف دانشمند امروہہ آئے ان کا سلسلۂ نسب سیّد موسیٰ مبرقع بن امام محمد تقی الجواد تک پہنچتا ہے۔ (تاریخ امروہہ صفحہ۔۱۸۱) البتہ جلوس کا باقاعدہ سلسلہ عہد عالمگیر سے شروع ہوا۔ اورنگ زیب کے عہد میں ایک ایرانی شاہ مسکین نامی امروہہ میں وارد ہوئے۔ اور انھوں نے جلوس کی ابتداء کی۔ لیکن مخالفین نے مخالفت کی۔ اور ان کے قتل کا فتویٰ حاصل کر کے انھیں شہید کر دیا۔ (آج کل دسمبر ۱۹۷۹ء صفحہ:۲۳)

عہد عالمگیر میں جلوسِ علم کا ثبوت ۹ محرم کو نکلنے والے نشانوں کے جلوس سے بھی ملتا ہے اس جلوس کے سلسلے میں امام مرتضیٰ نقوی اپنے مضمون میں رقم طراز ہیں۔

> ''سیّد محمد میر عدل کے فرزند شاہ ابوالحسن شہنشاہ اکبر کے یہاں منصب دار تھے۔ امروہہ آتے ہوئے گڑھ مکتیسر میں قیام کیا۔ وہاں میاں الہ بخش گنج بخش سے ملاقات ہوئی۔ موصوف نے ایک تلوار اور ایک نیزہ یہ کہہ کر سیّد صاحب کو نذر کیا۔ یہ تبرکات زید شہید کے ہیں جو ہمارے سلسلہ میں اماناً اور وصیتاً سو سال سے متواتر چلے آتے ہیں''۔

صاحب تاریخ اصغری لکھتے ہیں کہ میاں الہ بخش کو شیخ مبارک بالا دست جھنجھانہ والے سے یہ تبرکات ملے تھے۔ اور ان کو سیّد علی عاشقان سرائے میر والے سے ملے تھے۔ جو بڑے عارف باللہ اور زید شہید کی اولاد میں تھے۔ اس تلوار اور نیزے کو شاہ سیّد ابوالحسن بڑے احترام کے ساتھ امروہہ لے آئے۔ اور ان کی اولاد میں یہ تبرکات محفوظ رہے۔ جب سیّد دوست علی نے محلّہ کٹکوئی پر عزا خانہ تعمیر کرایا تو خاندان کے دوسرے حضرات کو بھی عزاداری سے دلچسپی پیدا ہوتی گئی۔ ایک بزرگ سیّد کھوجی نے تبرکات میں سے زید شہید کے نیزے میں پرچم لگا کر اس کو نشان بنا کر شہر کی گشت کرنا چاہی سیّد دوست علی سے مشورہ کیا تو انھوں نے فرمایا کہ صرف دربار کلاں سے میرے امام باڑے میں لے آؤ۔ چنانچہ اس علم کو نصب کرنے کے لیے ایک اونچا چبوترا بنا کر اس پر علم نصب کر دیا گیا۔''

اس کے علاوہ اس زمانہ میں امروہہ میں اور بھی کئی امام باڑے موجود تھے مثلاً سیّد مظہر علی خاں بن سیّد غلام علی کا امام باڑہ۔ جہاں سے ساتویں محرم کا جلوس نکلتا ہے۔ نورن کا امام باڑہ سیّد امانت علی محلہ کالی پگڑی کا امام باڑہ، عزا خانہ حرمت شاہ محلّہ مچھر ہٹہ، ولیا کا امام باڑہ وغیرہ جہاں زمانہ قدیم سے عزاداری ہوتی چلی آرہی ہے۔ مؤلف تاریخ امروہہ لکھتے ہیں۔

''امروہہ کی عزاداری دور دور مشہور ہے۔ امام باڑے بڑے اہتمام سے آراستہ کئے جاتے ہیں۔ عورت، مرد، بچے، بوڑھے اور جوان سب غم امام میں سراپا برہنہ ماتم کرتے، نالہ و بکا کی آوازیں دور دور تک جاتی ہیں۔ تین محرم سے آٹھ محرم تک حسب ذیل امام باڑوں سے علم و تعزیے نکلتے ہیں۔

(۱) امام باڑہ ولیا (محلّہ پنچدرہ) امام باڑہ حرمت شاہ (مچھر ہٹہ) سقون کا امام باڑہ نورن، امام باڑہ کٹرہ غلام علی، امام باڑہ چاند سورج (قاضی زادہ) ۹ر محرم کو امام باڑہ دربار کلاں سے نشان اٹھ کر امام باڑہ دوست علی واقع محلّہ کنکوئی میں جاتے ہیں۔ اور دسویں محرم کو محلّہ شفاعت پوتہ سے تربت، تخت اور مسند تکیہ معہ روشن چوکی وغیرہ نکلتے ہیں۔ امام باڑہ میراثیاں کے سامنے ہو کر قسائی خانہ محلّہ کو واپس جاتے ہیں۔ محلّہ قاضی زادہ میں تسبیح کی زیارت ہوتی ہے۔'' (صفحہ ۔ ۳۸۴ یہ وہ تسبیح ہے جس کے کچھ دانے امروہے کے ایک بزرگ حاجی سیّد غضنفر حسین کے ہاتھ میں سرخ ہو گئے تھے ڈاکٹر امام مرتضیٰ نقوی کے بیان کے مطابق یہ محلّہ قاضی زادہ نہیں بلکہ محلّہ گذری ہے۔)

مجالس کا سلسلہ ۲۵ر ذی الحجہ سے ۸ر ربیع الاول تک جاری رہتا ہے۔ امروہے میں جلوسِ عزا کی ابتداء ۳ر محرم سے ہو کر ۸ر محرم تک رہتی ہے۔ اس کی تفصیل اور خصوصیت امام مرتضیٰ نقوی یوں بیان کرتے ہیں۔

''علموں کا یہ جلوس دو حصوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلے حصہ کو ''آرائش'' اور دوسرے حصہ کو ''دورہ'' کہتے ہیں۔ جلوس کی ترتیب حسب ذیل ہے۔

(۱) سب سے پہلے جلوس کے آگے اونٹوں کی قطار ہوتی ہیں۔ جن کی تعداد ۲۰، ۲۵ ہوتی ہے۔ سب سے اگلے اونٹ پر نقارہ بجتا ہے اور سیاہ پھریرے کا علم ایک شخص کے ہاتھ میں ہوتا

ہے۔ جو ماتمی جلوس کی نشانی ہے۔ پچھلے اونٹوں پر بیٹھنے والے لوگ روٹی تقسیم کرتے ہیں اور سڑک پر چلنے والے ''توشہ'' کہہ کر مانگتے ہیں۔

(۲) اونٹوں کے پیچھے کچھ لوگ تاشہ، ڈھول اور جھانجھ بجاتے ہیں۔

(۳) اس باجے کے عقب میں روشن چوکی ہوتی ہے۔ ان روشن چوکیوں میں کسی میں نوبت اور کسی میں نفیری بجتی ہے جس میں نوحہ کی آواز نکلتی ہے اور کسی میں پلاؤ تقسیم ہوتا ہے۔

(۴) روشن چوکیوں کے درمیانی فاصلے کے خلاء کو مسندوں سے پر کیا جاتا ہے۔

ان ہی مسندوں کے ساتھ پالکی بھی ہوتی ہے۔ جس میں تکیہ اور قرآن شریف رحل پر رکھا جاتا ہے یہ تمام سامان آرائش کے نام سے موسوم ہے۔

اس کے فوراً عقب میں دوسرا حصۂ جلوس ہوتا ہے۔ اس حصہ جو عرف عام میں ''دورہ'' کہتے ہیں یہ اصل جلوس ہے۔

(۱) اس حصہ میں سب سے پہلے تاشہ نوازوں کی جماعت ہوتی ہے جو بڑے بڑے فوجی انداز سے چلتے ہیں۔ اور تاشے، ڈھول اور جھانجھ بجاتے ہیں۔

(۲) تاشہ نوازوں کے پیچھے تلواروں کے علم ہوتے ہیں۔

(۳) تلواروں کے علموں کے درمیان حضرت ابوالفضل العباس کا علم ہوتا ہے۔

(۴) علموں کے پیچھے تابوت ہوتا ہے جس پر سفید کپڑے کا غلاف ہوتا ہے جس میں تیر بھی پیوست ہوتے ہیں۔

(۵) تابوت کے پیچھے ادھر ادھر بھاٹ ہوتے ہیں جن کے ہاتھوں میں پٹکے کے علم ہوتے ہیں جو سواری پڑھتے ہیں۔

(۶) تابوت سے متصل دلدل ہوتا ہے اور دلدل سے بالکل متصل عقب میں ایک دو صفیں نوحہ خوانوں کی ہوتی ہیں۔ اور ان کے پیچھے تمام ماتم دار ہوتے ہیں۔ (آج کل، دسمبر ۱۹۷۹ء صفحہ ۔ ۳۴ ۔ ۳۵)

جائس: قصبہ جائس سیّدوں کی سب سے قدیم ترین بستی کہی جاسکتی ہے۔ پہلے یہ بھر قوم کا

ایک قلعہ تھا۔ جو محمود غزنوی کے عہدِ حکومت میں سالار مسعود غازی کے ہاتھوں ۴۱۸ھ میں فتح ہوا۔ لیکن یہ قلعہ دوبارہ ہندوؤں کے زیر اقتدار چلا گیا اور ۵۹۰ھ میں محمود غزنوی کے عہد میں سیّد نجم الدین سبزواری نے جو سلطان محمد غزنوی کی فوج میں مقدمۃ الجیش کے کمانڈر تھے۔ اس قلعہ کو فتح کیا۔ سیّد نجم الدین کے بڑے لڑکے سیّد شرف الدین نے اس سرزمین کو جس کا نام برعایت مقدمۃ الجیش جیش پڑا۔ بعض محققین جائس کا اصلی نام "جائے عیش" قرار دیتے ہیں جو قابل قبول نظر نہیں آتا اپنا مسکن بنایا۔ قصبہ کے اکثر سادات انھیں کی نسل سے ہیں۔ اور انھیں کے زمانے سے عزاداری شروع ہوئی۔ بلکہ یہاں تک کہا جاتا ہے۔ کہ تیمور کے حملہ سے بہت پہلے جائس میں عزاداری کا رواج پڑ چکا تھا۔ میر شرف الدین نے قصبہ جائس کو بہت ہی منظم اور باضابطہ طریقہ سے اس طرح آباد کیا کہ ہر قوم وقبیلہ کے جملہ افراد کا ایک مخصوص محلہ کردیا گیا۔ اور ہر محلہ میں ایک امام باڑہ بھی تھا۔ جو بڑا دورا کہلاتا تھا۔ یہ بڑا دورا یا بڑا دروازہ آئمہ اثناعشری مناسبت سے بارہ محلوں میں تھا۔ جہاں اجتماعی طور پر محرم کے ایام میں عزاداری ہوتی تھی۔ (تاریخ جائس مولفہ مولوی عبدالقادر۔ دوحہ ہاشمیہ مصنفہ سلطان العلماء مولوی سیّد محمد)

اس کے علاوہ تاریخ فیروز شاہی سے بھی پتہ چلتا ہے کہ فیروز شاہ تغلق نے ۷۷۱ھ میں جلوس ومحرم وتعزیہ پر بندش عائد کردی تھی۔ اور اپنے ایک فرمان کے ذریعہ اس نے جائس کی کربلائے کڑہ ڈلیہ کو بھی منہدم کرادیا تھا۔ یہ کربلا بارہ سو بارہ ہجری تک سادات جائس ونصیر آباد کی مشترکہ کربلا تھی۔ جہاں تعزیے دفن ہوتے تھے۔

جائس کی عزاداری وہاں کے قدیم ترین امام باڑے محلہ عتبانہ سے بھی ہوتا ہے جہاں آج بھی اسی انداز میں مجلسِ عزا برپا ہوتی ہے یعنی ذکر، خطبہ اور مجلس عربی وفارسی میں پڑھی جاتی ہے۔ عربی میں منبر پر خطبہ پڑھا جاتا ہے اور حاضرین مجلس بیچ بیچ میں یاعلی یاعلی دہراتے ہیں۔ پھر ہر شہید کے متعلق دس روز تک فارسی میں ذکر ہوتا ہے۔

شیر شاہ سوری کے عہد سے لے کر اکبر کے زمانہ تک تقریباً اٹھارہ سال تک سادات جائس خانہ بدوشی اور جلاوطنی کی زندگی گزارتے رہے۔ کیونکہ انھوں نے ہمایوں کا ساتھ دیا تھا اکبر کے زمانہ میں وہ پھر اپنے وطن میں آباد ہوئے۔ (مؤلف تاریخ جائس عابد حسین سہرامی بحوالہ

کاروانِ حیات شہید اعظم نمبر ۱۳۹۱ھ صفحہ ۴۲) جن میں سیّد سادات مخدوم سیّد جلال الدین حسین اور جہانیان جہاں گشت کے پوتے سیّد عبداللہ بخاری کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ (انساب اکبر از سیّد اکبر علی قلمی بحوالہ کاروانِ حیات صفحہ ۴۲)

شاہجہاں کے زمانہ میں جب جائس نور جہاں کے بھانجے احمد بیگ کے تحت آیا تو یہاں کچھ مغل آباد ہوئے۔ مرزا عاشور بیگ جنھوں نے بعہد نواب سعادت علی خاں محلہ تمبانہ سے ساتویں محرم کو جلوس مہندی کی بناء کی تھی۔ انھیں کی نسل سے تھے (مکتوبات سیّد محمد حسن رضوی قلمی، بحوالہ کاروانِ حیات صفحہ ۴۳)

۱۱۹۵ھ میں نواب آصف الدولہ کے عہد میں جب الماس علی خان نے لکھنؤ میں کالا امام باڑہ کے پاس اپنی مسجد تعمیر کرائی اور اس کا سنگ بنیاد جائس کے مولوی میر صادق علی سے رکھوایا۔ تو اس کے صلہ میں انھیں جو ایک لاکھ روپے دیا اسے میر صادق نے جائس میں ایک عالیشان امام باڑے کی تعمیر میں صرف کردیا۔ نواب امجد علی شاہ کے عہد میں میر علی محمد نے بھی اپنا امام باڑہ تعمیر کرایا۔ اور عزاداری کی بناء کی۔ غرضیکہ جائس میں شروع ہی سے عزاداری ہوتی رہی ہے۔ لیکن اس قصبہ کی اہمیت مولوی دلدار علی کی وجہ سے زیادہ ہے۔

ضلع بجنور: بجنور کے ضلع میں بھی سیدوں کی بہت سی بستیاں آباد ہیں۔ جن میں گوولی سادات، میمن سادات، جوگی پورہ (درگاہ نجف ہند) وغیرہ میں عزاداری خاص اہتمام سے ہوتی ہے۔ نہٹور کے محرم کا تفصیلی بیان قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں ملتا ہے۔

گوولی سادات زمینداروں کی بستی ہے۔ یہاں دو مسجدیں اور دو امام باڑے ہیں۔ ایک مردانہ اور ایک زنانہ۔ جہاں چاند رات سے ۸ ربیع الاول تک عزاداری کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جس میں موضع سنگھا اور چاند پور کے سادات بھی حصہ لیتے ہیں۔

ضلع بجنور کی عزاداری کی اہمیت، درگاہ نجف ہند، جوگی پورہ (احمد پور سادات) سے زیادہ ہے۔ یہ زیارت گاہ احمد پور کے رئیس سیّد راجو کے زمانہ سے آباد ہوئی۔ جو شاہجہاں کے دیوان تھے۔ اور آخر عمر میں جب شاہجہاں کو اورنگ زیب سے خطرہ محسوس ہوا تو اس نے سیّد راجو

کی شجاعت کی وجہ سے انھیں اپنے خاص کمرے کی نگرانی سپرد فرمائی۔ اسی لیے عہد عالمگیری میں بادشاہ کے عتاب کے خوف سے سیّد راجو اپنے وطن جوگی پورہ میں آ کر مقیم ہو گئے تھے۔ اور دن رات رو رو کر نادِعلی کا ورد کرتے تھے۔ اور حضرت علیؑ کو مدد کے لیے پکارتے تھے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ایک دن حضرت علیؑ واقعی ان کی مدد کو پہنچے اور ایک غریب برہمن جو وہاں گھاس کھود رہا تھا۔ اس کے ذریعہ سیّد راجو کو جنگل میں تنہا طلب کیا۔ لیکن اس خبر کے ساتھ ہی گاؤں والوں کا ایک جم غفیر راجو کے پیچھے جنگل کی طرف چلا۔ لیکن اس وقت تک حضرت علیؑ تشریف لے جا چکے تھے۔ البتہ ان کے گھوڑے کے سموں کا نشان اور زمین پر جھاگ باقی رہ گیا تھا۔ سیّد راجو نے اسی وقت وہاں پر ایک چوکی بنا کر روضہ کی بنیاد ڈالی اور تب سے یہ جگہ درگاہ نجف ہند کہلاتی ہے۔ یہاں سال بھر باقاعدہ مجلس کا سلسلہ چلتا رہتا ہے عام طور پر ماہ مئی میں درگاہ کی سالانہ مجالس ہوتی ہیں۔ جن میں برصغیر ہند و پاک کے تمام شیعہ اور عقیدت مند سنی اور ہندو شرکت کرتے ہیں۔ اس میں بمعیزہ سادات ضلع بجنور کا جلوس، ذوالجناح، نوگانواں سادات ضلع مراد آباد کا گہوارہ، علی اصغر کا جلوس اور حضرت قاسم کی مہندی کا جلوس جانسٹھ کا قافلہ حسینی اور عماریوں کا جلوس یا کبھی ضلع بلند شہر کا خاموش جلوس سرسی ضلع مراد آباد کا، علموں کا جلوس اور امروہہ ضلع مراد آباد کا تابوت چادر اور دلدل کا جلوس قابل ذکر ہیں۔

رامپور: ریاست رامپور ایک عرصہ تک نوابی دور کی متحمل رہی ہے۔ اور یہاں کے اکثر نواب شیعہ مسلک رکھتے تھے۔ حالانکہ ریاست میں شیعہ آبادی اتنی نہ تھی۔ لیکن ان شیعہ نوابین کی وجہ سے اکثر عوام خصوصاً پٹھانوں کے خاص قبیلے جیسے یوسف زئی وغیرہ عزاداری دلی عقیدت و احترام سے کرتے تھے۔ اور اودھ حکومت کے دوستانہ تعلقات کے باعث لکھنؤ کے شیعہ شعراء و ادباء بھی اس سلطنت میں آ کر ملازم ہو گئے۔ خصوصاً زوال سلطنت اودھ کے بعد رام پور علمی و ادبی تحریکوں کا مرکز بن گیا۔ لہذا غالب جیسا شخص بھی اس طرف رجوع ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ لکھنؤ کے ایک نواب نے رام پور میں ایک شیعہ کالج اور ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ کے قیام کا اقدام کیا۔ یہاں خود نواباں عزاداری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ بیگمات اس میں خصوصی دلچسپی کا مظاہرہ کرتی

تھیں۔ لکھنؤ کے مشہور سوز خوان اور مرثیہ خوان دربار رامپور میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔

جارچہ: ضلع بلند شہر کے سادات بھی عزاداری میں کسی سے کم نہ تھے۔ اور اب بھی چاند رات ہی سے یہاں مجالس کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پانچ محرم سے زیارتوں کا سلسلہ چلتا ہے۔ چھ محرم کو حضرت علی اکبر کا تابوت سات محرم کو حضرت علی اصغر کا گہوارہ اور نشان نو تاریخ کو تعزیوں کا جلوس نکلتا ہے۔ جس میں اہل ہنود اور سنی حضرات بھی شرکت کرتے ہیں صبح عاشور تعزیون اور علم کے جلوس کے ساتھ امام باڑہ پوشی خانہ پہنچ کر بعد مجلس آگ اور زنجیروں کا ماتم ہوتا ہے۔

جلالی ضلع علی گڑھ: زمانہ قدیم سے تعزیہ داری کے لیے مشہور ہے۔ میر کمال الدین حسین ہمدانی نبیرۂ میر سیّد علی ہمدانی شاہان تیموریہ کے ابتدائی عہد میں وارد جلالی ہوئے اور آپ نے جلالی میں عزاداری کی بناء کی۔ پھر قطب العارفین حکیم سیّد شاہ خیرات علی ہمدانی کے عہد میں نواب شجاع الدولہ جلالی تشریف لائے۔ اور جلالی میں عشرہ محرم تک عزاداری کی۔ اسی موقع پر فرخ آباد کے نواب مظہر جنگ جلالی میں باقاعدہ شیعہ ہوئے۔ (ملاحظہ ہو عہد بنگش مولفہ مفتی ولی اللہ فرخ آبادی بحوالہ کاروان حیات صفحہ ۹۷)

جلالی میں متعدد امام باڑے ہیں اور دو کربلائیں بھی۔ ایک بڑی کربلا سیّد علی اوسط نے تعمیر کرائی تھی۔ یہاں حضرت علیؑ کا تابوت دسہرا وغیرہ ہر سال شہادت کے موقعہ پر دفن کیا جاتا ہے دوسری چھوٹی کربلا جو قدیم ہے۔ یہاں تعزیوں کی ترتیبیں عشرہ محرم میں اور چہلم پر ہر سال دفن کی جاتی ہیں۔ جلالی کے محرم کی خاص خصوصیت اس کی مجالس عزا ہیں جن میں روضہ خوانی کو خاص اہمیت حاصل ہے اور وہ تمام قدیم کلام جو عشرہ محرم کے دوران جلالی کے امام باڑوں میں پڑھا جاتا ہے وہ یہ ہے۔

(۱) روضہ خوانی یازدہ مجلس معہ مرثیہ محتشم کاشی بزبان فارسی
(۲) الوداع مصنفہ کانب تصنیف ۱۱۵۹ھ جو عشرہ محرم کے آخر دن صبح عاشور تعزیہ ضریح کے

سامنے ہر امام باڑہ میں پڑھی جاتی ہے۔اس کا مطلع ہے۔

جب حسینؑ رن کو چلے رورو کہا ہے الوداع

(۳) محسن کا تصنیف کردہ سلام جو مہندی کے سامنے پڑھا جاتا ہے۔اس کا مطلع ہے۔

ان پر سلام رن میں جو دولہا دلہن بنے

(۴) مولوی سیّد حیدر بخش حیدری کا سلام جو ۸؍محرم کو صبح میں امام باڑہ مسجد جامع میں صبح کے وقت پڑھا جاتا ہے اس کا مطلع ہے۔

ہے سلام اس پر جو بے کس بے پدر بے یار تھا

ھلّور: متشرع سیدوں کی بستی ہے لہٰذا یہاں ۹؍ذی الحجہ سے عزاداری کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔اور اسی دن سے جنگی نقارے بجنا شروع ہو جاتے ہیں دیہاتی عورتیں پوربی زبان میں واہا (منظوم واقعات کربلا) پڑھتی ہیں۔صبح عاشورا اکثر آس پاس کے دیہاتوں کے مرد واہا اور جھرا پڑھتے ہوئے پیک صغریٰ کی حیثیت سے ہلور آتے ہیں۔

زیدپور : ضلع بارہ بنکی میں بھی زمانہ قدیم سے سادات آباد ہیں۔لہٰذا وہاں عزادری کی تاریخ بھی اتنی ہی قدیم ہے یہاں پانچ عزاخانے خاص طور پر مشہور ہیں۔قدیم امام باڑہ جو کئی سو سال پرانا ہے۔محرم میں یہاں صبح سے شام تک مجالس کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔۶؍محرم کا مہندی کا جلوس میر بنیاد حسن کے امام باڑہ پر ختم ہوتا ہے یہاں بیس صفر کا جلوس مخصوص جلوس ہے اور کافی اہمیت رکھتا ہے۔ختم مجلس پر عماری و ذوالجناح عزاخانے میں آتے ہیں۔اس جلوس میں گھوڑے پر نقارہ، عماری و محمل و کجاوہ، اونٹوں پر شبیہ گہوارہ کئی نقرئی تربتیں اور ذوالجناح وغیرہ ہوتے ہیں۔اس جلوس کے ہمراہ دستۂ حیدری کے نوحہ خواں نوحے پڑھتے ہیں اور سینہ زنی ہوتی ہے۔۲۱؍صفر کو وصی محمد کا تعزیہ اٹھتا ہے۔۲۴؍صفر کو کم سن بچوں کا ایک جلوس ماتم نکلتا ہے ایک اور مخصوص جلوس ۲۸؍رجب کو مدینہ سے حضرت امام حسینؑ کی روانگی کے موقع پر نکلتا ہے جس میں کل سامانِ سفر ہوتا ہے۔۹؍ذی الحجہ کی صبح مجلس عزا کے بعد تابوت جناب مسلم برآمد ہوتا ہے۔اور تمام بستی میں

نوحہ خوانی ہوتی ہے۔

جلال پور : (ضلع فیض آباد) بھی جہاں اہل حرفہ مسلمانوں کی اکثریت ہے عزاداری میں پیش پیش نظر آتا ہے چاند رات سے ہی جلوس نکلنا شروع ہو جاتے ہیں پہلا جلوس موضع نکبور سے ذوالجناح کا۔دوسرا قصبہ جلال پور کا ٹونس ندی کے کنارے واقع امام باڑہ حسن خاں کا جلوس، تیسرا محلہ بازید پور کا جلوس وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔۱۳؍محرم کو مسجد جعفری سے بنی اسد کا جلوس نکلتا ہے۔جو دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔

سندیله : سندیلہ (ضلع ہردوئی) کے محرم کی خصوصیت یہ ہے کہ دوسرے شہروں میں علم، مہندی، دُلدل گہوارہ وغیرہ کے جلوس صرف شیعہ حضرات اپنے گھروں یا امام باڑوں سے نکالتے ہیں اور سنی حضرات اس میں شرکت کرتے ہیں لیکن یہاں یہ سب جلوس اہل سنت اپنے گھروں سے نکالتے ہیں۔اور شیعہ شرکت کرتے ہیں۔

گونڈہ : گونڈہ ضلع میں بھی عزاداری بغیر کسی اختلاف کے شیعہ سنی مشترکہ طور پر کرتے ہیں وہاں کے باشندوں کو ناز ہے کہ آج تک وہاں اس مسئلہ پر کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔

بلرام پور میں مشہور نقاد اور دانش ور علی سردار جعفری کے خاندان میں عزاداری بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منائی جاتی تھی جس کی تفصیل ان کی کتاب "لکھنؤ کی پانچ راتیں" میں ملتی ہے۔

صفی پور : صفی پور بھی سادات کا قصبہ ہے۔جہاں رویت ہلال کے ساتھ ہی عزاخانوں میں مجالس برپا ہونا شروع ہو جاتی ہیں ۱۹۱۲ء تک یہاں ۱۶؍مجلسیں خاص طور پر مشہور تھیں جو شب و روز ہوتی تھیں دن میں تیرہ اور بعد نماز مغربین ۳ مجلسیں رات کے ایک بجے تک ان میں ایک مجلس بڑے اہتمام سے ہوتی تھی جو سید محمد عسکری رئیس صفی پور کرواتے تھے آج بھی وہاں ساتویں شب کو تخت عروسی حضرت قاسم کا جلوس نکلتا ہے

اس کا منظر دیدنی ہوتا ہے۔اس جلوس میں سیاہ و سبز جھنڈیاں، سبیل، شربت اور نوبت

وبقار خانہ، کہاروں، ہاتھیوں اور اونٹوں پر علم کے ہمراہ تخت وغیرہ ہوتے ہیں۔۔(شیعہ ماہ فروری ۱۹۱۲ء صفحہ ۳۱ سید محمد عسکری کا مضمون۔ صفی پور کا محرم)
اس کے علاوہ ردولی اور سیتاپور کے محرم بھی بڑے شان دار ہوتے ہیں۔ قاضی عبدالستار کی تحریروں میں اس کی خوبصورت جھلکیاں ملتی ہیں۔

آگرہ: آگرہ بھی زمانہ قدیم سے عزاداری میں کسی سے پیچھے نہیں۔ نئی بستی کے امام باڑہ میں اہل سنت کی جانب سے پھولوں کا تعزیہ رکھا جاتا ہے۔ صبح عاشور یہ تعزیہ امام باڑہ سے اٹھ کر ایک جلوس کی شکل میں مرثیہ خوانی کے ساتھ کربلا جاتا ہے۔ روز عاشورہ حضرت شہید ثالث (قاضی نوراللہ شوستری) کے مزار پر جلوس تعزیہ و ذوالجناح، علم حضرت عباس، نوحہ اور ماتم کے ساتھ نکلتا ہے۔ آگرے میں شیعوں کے ساتھ ساتھ اہل سنت بھی عزاداری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ مشہور شاعر سیماب اکبرآبادی کے مکان پر خود تعزیہ داری ہوتی تھی۔ اور سیماب بذات خود سلام پڑھتے تھے۔ اسی طرح شب عاشور ہندوستان کے مشہور شاعر عالم فتح پوری اپنے مکان پر بزم مسالمہ منعقد کرتے ہیں۔ (کاروانِ حیات شہید اعظم نمبر)

اسی طرح **الہ آباد** اور **بنارس** کے بیشتر قصبہ جات میں عزاداری کا اہتمام ہوتا ہے۔ خصوصاً وہ قصبہ جات جہاں سیّدوں کی تعداد زیادہ ہے۔ یا صرف سادات آباد ہیں۔ وہاں محرم میں عزاداری کا زور وشور دکھائی دیتا ہے۔ فارسٹر نے الہ باد کے محرم کا ذکر خاص طور پر اپنی کتاب Travels in India میں کیا ہے۔ عزاداری کے سلسلے میں الہ باد کے تین محلے مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ (۱) چوک کا امام باڑہ (۲) سبزی منڈی اور (۳) دریاباد ان تینوں محلوں میں مجلسیں ہوتی ہیں۔ اور جلوس ہائے عزا برآمد ہوتے ہیں۔ عاشورے کے دن سنی بھی بڑی عقیدت سے ایک تعزیہ نکالتے ہیں۔ جلوس ذوالجناح، بال منڈی کے محرم کی چھ کو نکلتا ہے۔ اور سات ربیع الاول کو جلوس عماری بڑا گاؤں سے اور ۸ ربیع الاول کو کراری الہ باد میں جلوس عماری کا اہتمام ہوتا ہے۔ کراری میں بھی عزاداری بڑے اہتمام سے ہوتی ہے۔
بنارس کے دو جلوس مخصوص ہیں۔ (۱) چھٹی محرم کا (۲) دوسرا سات ربیع الاول

کا۔ وداعی جلوس جس میں پدم بھوشن استاد بسم اللہ خاں اپنی شہنائی پر نوحہ سناتے ہوئے چلتے ہیں۔ ایک اور جلوس ہاتھی اور اونٹوں پر نکلتا ہے۔
کانپور اور مچھلی شہر کے محرم بھی بڑے بارونق ہوتے ہیں۔

بہرائچ: بہرائچ میں بھی مشترکہ عزاداری کا رواج عام ہے اس ریاست کے نوابان خاندان قزلباش سے تعلق رکھتے تھے۔ لہٰذا بہرائچ، نواب گنج اور علی آباد وغیرہ کے علاقوں میں خاص طور پر بڑے شاندار طریقے پر عزاداری ہوتی ہے۔ ریاست کا ایک عالیشان امام باڑہ بھی ہے اس کے علاوہ نواب صاحب کا امام باڑہ سیّد اولاد حسین کا امام باڑہ وغیرہ بھی مشہور ہے۔ یہاں کا سب سے اہم جلوس، جلوس ذوالجناح ہوتا ہے۔ جس مکان سے ذوالجناح یا دُلدل برآمد ہوتا ہے اسے دُلدل ہاؤس کہا جاتا ہے۔ یہ جلوس سات محرم کو اٹھ کر تقریباً چوبیس گھنٹے کی گشت کے بعد آٹھ محرم کو کسی وقت کربلا میں بڑھایا جاتا ہے۔ اس میں بلاتخصیصِ مذہب وملت تمام لوگ حصہ لیتے ہیں۔
بہرائچ میں گھروں میں دلدل رکھنے کا عام رواج ہے۔ اسی لیے یہاں کے مکانات کا صدر دروازہ بہت بڑا بنایا جاتا ہے تاکہ دُلدل اندر داخل ہوسکے۔ (کاروانِ حیات، شہید اعظم صفحہ نمبر۔ ۹۰)

۵۔ کشمیر: کشمیر میں یوں تو راجہ سنگرام کے عہد حکومت ہی سے مسلمان موجود تھے لیکن صحیح معنوں میں مذہب اسلام یہاں اس وقت منظر عام پر آیا جب ریخچن بادشاہ نے عارف کامل سیّد شرف الدین (بلبل شاہ) کے ہاتھوں پر اسلام قبول کیا۔ (بحوالہ جان ہالسٹر Shias of India, pg.77) اسی زمانہ میں ایران کا ایک شہزادہ جو اپنے آپ کو حضرت علی کے خاندان سے منسوب کرتا تھا۔ تاجر زادے کی حیثیت سے ۱۳۲۳ء میں کشمیر آیا اور آخر کار ۱۳۳۶ء میں شاہ مرزا شمس الدین کے نام سے بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ یہ سلاطین خاندان کا پہلا بادشاہ تھا۔ اس خاندان کے چوتھے بادشاہ ہندال کے زمانہ میں (۱۳۷۲ء) امیر کبیر سیّد علی ہمدانی کشمیر تشریف لائے۔
آپ کے ساتھ تقریباً سات سو سادات تھے۔ جو مختلف گاؤں اور قصبوں میں اسلام کی

تبلیغ کرتے رہے۔ ۱۳۹۳ء میں سیّد علی ہمدانی کے فرزند سیّد محمد ہمدانی تین سو سادات کے ہمراہ کشمیر پہونچے ان دونوں بزرگوں کے متعلق بعض مورخوں کا خیال ہے کہ شیعہ تھے اور بعض انہیں شافعی مسلک کا بتاتے ہیں بہر حال اس سے انکار نہیں کہ یہ حضرات محبت آلِ رسول کو اپنا فریضہ و ایمان سمجھتے تھے لیکن مدرستہ الواعظین لکھنؤ کی دریافت کردہ کتاب المودت القربیٰ (جسے سیّد علی ہمدانی کی تصنیف ثابت کیا گیا ہے) سے پتہ چلتا ہے کہ آنے والے سادات شیعہ تھے۔ چاہے وہ اسماعیلی رہے ہوں یا امامیہ۔ غرضیکہ شیعیت کشمیر میں بہت پہلے آ چکی تھی۔ لیکن چونکہ وہاں کوئی شیعہ عالم نہ تھا اس لیے لوگ مذہبی امور سے کم واقفیت رکھتے تھے۔ جب مولانا سعید الدین سیّد محمد ہمدانی کے ساتھ کشمیر آئے تو یہاں کے شیعوں کو احکام دینی کی تعلیم دینا شروع کی اور یوں کشمیر میں شیعیت پھیلنے لگی۔ ہندال کے جانشین سکندر شاہ کو فرشتہ کٹر قسم کا شیعہ بتاتا ہے۔ (بحوالہ جان ہالسٹر (Shias of Inida , pg. 144

کشمیر کا ہر دلعزیز بادشاہ زین العابدین بھی شیعہ تھا۔ چونکہ یہ خود عالم، فاضل اور ادب پسند تھا۔ لہٰذا اس کے عہد میں بے شمار علماء و فضلاء ایران سے ہندوستان آئے۔ جن میں سیّد حسین قمی نے کشمیر میں زبردست تبلیغ کی۔ اسی کے عہد حکومت میں چک قبیلہ نے اقتدار حاصل کیا۔ جو غالباً شیعہ (اسمٰعیلی) مسلک رکھتے تھے۔ (شیعیان کشمیر صفحہ۔ ۲۵)

حسن شاہ کے زمانہ میں شیعیت کو اور فروغ حاصل ہوا۔ کیونکہ ملکہ خود سیّد زادی تھی۔ اسی زمانہ میں مرزا حسین والی خراسان نے میر شمس الدین عراقی کو ۸۸۸ھ میں کشمیر روانہ کیا۔ جنھوں نے وہاں نور بخشی مسلک (جو شیعیت کے بہت قریب خیال کیا جاتا ہے) کی تبلیغ کی لیکن بعد میں ایران کے مذہبی اور سیاسی تاثرات سے متاثر ہو کر اکثروں نے شیعہ مسلک اختیار کر لیا۔ (شیعیان کشمیر صفہ۔ ۲۵)

چک خاندان کے عہد میں گو بادشاہ حنفی المسلک تھے۔ لیکن فوج میں اکثریت شیعوں کی تھی۔ کاجی چک نے تو چڈی بل میں ایک امام باڑہ بھی بنایا۔ جو کشمیر کا پہلا امام باڑہ تھا جہاں مجلس عزائے حسینؑ ہوتی تھی۔ ۱۵۵۴ء میں غازی شاہ تخت نشیں ہوا۔ جو کاجی چک کا بیٹا اور شیعہ مذہب کا پیرو تھا۔ اس کے عہد حکومت میں شیعیت نے فروغ پایا۔ ویسے بھی چونکہ اکثر شاہانِ کشمیر خود

شیعہ مسلک رکھتے تھے۔ اس لیے ان کے بہت سے امراء و صوبیدار بھی شیعہ تھے۔ مثلاً مرزا حیدر ملک چغتائی، علی مردان خاں، ابراہیم خاں، برہان الدین (فاضل خاں) کفایت خاں موسوی اور امیر خاں جوان شیر جس نے تند پورہ میں ایک باغ بنایا تھا۔ جہاں ایام محرم میں ایک وسیع خیمہ نصب کیا جاتا تھا۔ جس میں شیعہ مسلمان حضرت امام حسینؑ کا ماتم کرتے تھے۔ یہ باغ، باغ امیر آباد کے نام سے مشہور ہے۔ (شیعیانِ کشمیر صفحہ۔ ۱۴۱)

شیعہ شعراء و ادباء کی بھی کمی نہ تھی۔ شاہ ابوالفتح ملا مظہری، اوجی، حاجی محمد جان قدسی، کلیم ہمدانی، جویا، گویا، حاجی حیدر مغنی، سامع، لامع حکیم حبیب اللہ حبیب وغیرہ شیعہ علماء مثلاً ملا عبد الرشید، مُلّا محمد صادق، مُلّا طالب، مُلّا غالب، مُلّا عبد الغنی، مُلّا محمد جواد، مُلّا عالم انصاری، آغا سیّد مہدی، آغا سیّد محمد حجت الاسلام آقا شیخ علی اصغر وغیرہ اسی لیے کشمیر میں شیعی اثرات جا بجا نظر آتے ہیں۔ شیعوں کی بے شمار خانقاہیں۔ مثلاً خانقاہ سیّد محمد مدنی، خانقاہِ میر شمس الدین عراقی، (خانقاہِ نوربخشیہ) خانقاہِ حسن آباد، خانقاہِ بابا خلیل اللہ شاہی مقبرہ وغیرہ۔ شیعہ مسجدوں میں پتھر مسجد (نور جہاں کی تعمیر کردہ) مسجد حسن آباد، مسجد حاجی عیدی، چڈی بل وغیرہ خاص طور پر مشہور ہیں۔

کشمیر میں عزاداری ہمیشہ ہی سے بڑے زور و شور سے ہوتی رہی ہے۔ اور بادشاہوں نے بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ لہٰذا یہ متعدد امام باڑے موجود ہیں۔ کاجی چک کا عالیشان امام باڑہ چڈی بل، امام باڑہ حسن آباد، بڈگام کا امامباڑہ، احمد پور کا امام باڑہ، وغیرہ۔

٦۔ پنجاب و سندھ: پنجاب و سندھ وہ علاقے ہیں جہاں پہلی مرتبہ باقاعدہ مسلمانوں کا حملہ ہوا۔ اور حکومت قائم ہوئی۔ حجاج بن یوسف کے زمانے میں محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا۔ اور یہاں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی۔ البتہ کہا جاتا ہے کہ خلیفہ عمر بن عبد العزیز کے ایماء پر سندھ کے عرب گورنر نے اعلان کیا تھا کہ اگر سندھ کے لوگ مسلمان ہو جائیں تو انھیں عرب حکمرانوں کے مساوی حقوق ملیں گے۔ بعض سندھی قبائل اور ان کے سرگروہ جن میں راجہ داہر کا بیٹا جے سنگھ بھی شامل تھا۔ مسلمان ہو گئے۔ (آبِ کوثر صفحہ۔ ۲۲)

اسی زمانہ سے اسمٰعیلی داعی بھی ہندوستان آنے لگے۔ پہلا اسمٰعیلی داعی ۲۷۰ھ (۸۸۳ء) میں

سندھ آیا اور اپنے مذہبی اور سیاسی خیالات کی اشاعت میں مشغول ہوگیا۔(تاریخ سندھ مرتبہ مولوی ابوظفر ندوی صفحہ ۱۲۰) اسمٰعیلی شیعوں کا خاص ڈیرا ملتان کے علاقے میں تھا۔اگر چہ مقدسی لکھتا ہے کہ علاقہ ملتان میں امام ابوحنیفہ کے مقلد کثرت سے تھے۔اور مختلف فرقوں میں کوئی جھگڑا نہ تھا۔لیکن صاف نظر آتا ہے کہ اس زمانہ میں (۳۷۵ھ کے قریب) اس علاقے پر اسماعیلی اثرات پوری طرح غالب آچکے تھے۔(آب کوثر صفحہ ۳۲)

تاریخ سندھ جلد ۲ صفحہ ۱۲۳ پر مرقوم ہے۔

''اہل ملتان شیعہ ہیں۔اذان میں حی علیٰ خیر العمل کہتے ہیں۔اور تکبیر دو دفعہ کہتے ہیں۔اور ملتان والوں کا سکہ (مصر کے اسمٰعیلی) فاطمیوں کی شکل ہے۔ملتان میں خلفائے بنی فاطمہ کا خطبہ جاری ہے۔اور یہاں کوئی حکم بغیر ارض مصر کے فاطمی خلیفوں کی منظوری کے اجراء نہیں پایا۔۔۔اور مصر کے اسمٰعیلیوں کا یہاں اس قدر زور ہے کہ بغیر ان کی اجازت کے یہاں کوئی شخص ملتان کے تخت پر نہیں بیٹھ سکتا۔اور گہوارہ برآمد ہوتا ہے۔چوتھا عزاخانہ ہز ہائی نس نواب آف مالیر کوٹلہ کا ہے۔نواب صاحب باوجود سنی المذہب ہونے کے بڑے جوش وخروش سے عزاداری کرتے تھے۔اور معہ اپنی بیگمات کے عشرۂ مجالس میں شریک ہوتے تھے۔۸ر محرم کو بیگمات کی طرف سے علم مبارک چاندی کے ہر سال امام باڑے میں جلوس کے ساتھ ریاست کی پوری پلٹن معہ بینڈ اور ساری پولس فورس کے باقاعدہ سلامی دی جاتی تھی۔ایک امام باڑہ احانیہ ہے۔جہاں روز عاشور مختلف محلوں سے چھوٹے موٹے تعزیے جلوس کی شکل میں آکر جمع ہوتے تھے۔اور بعد میں کربلا میں دفن کردیے جاتے تھے۔''

(سرفراز محرم نمبر ۱۳۵۷ھ صفحہ ۲۵ تا ۱۲)

اسی طرح پشاور، جواب پاکستان میں ہوگیا ہے۔عزاداری کا ایک اچھا مرکز تھا۔پانچویں چھٹی محرم ہی سے شبیہوں کا جلوس نکلنا شروع ہوجاتا تھا۔یہ علم ہر صاحب نذر کے گھر سے اٹھا کر اس امام باڑے میں جہاں نذر مانی جاتی تھی نوحہ خوانی اور سینہ زنی کے ساتھ پہنچایا جاتا تھا۔شب عاشور عزاداران حسین سر و پا برہنہ متعدد گروہوں میں تقسیم ہوکر تمام شہر میں محمدی علم اٹھائے پھرتے اور جب تک سپیدہ سحر نمودار نہ ہوتا آرام نہ لیتے۔امام حسین کا ذکر اردو، فارسی، پشتو، کشمیری اور پنجابی

زبان میں ہوتا۔''(ایضاً صفحہ ۳۵۔۳۶)

۷۔ ہماچل پردیش (شملہ): شملہ جیسے پہاڑی علاقے میں جہاں کے لوگوں کی زندگی موسم کا مقابلہ کرتے کرتے گذرتی ہے۔عزاداری میں کسی سے پیچھے نہیں تھا۔۱۹۴۶ء تک یہ عالم تھا کہ لداخی محلہ سے امام حسینؑ کا تعزیہ برآمد ہوتا تھا۔علم اور شبیہیں نکالی جاتی تھیں۔ہزاروں لوگ سینہ زنی کرتے تھے۔نویں محرم کے جلوس میں کیتھی، مشوبرہ، کفری، سنجوہی، بھراڑی، تارادیوی اور دیگر پہاڑی مقامات کے لوگ بھی شامل ہوجاتے تھے۔جلوس کی لمبائی ۴ر فرلانگ سے کم نہ ہوتی تھی۔اس میں ہندو بھی بڑی عقیدت کے ساتھ شرکت کرتے تھے۔

امر چند کا بیان ہے۔

''محرم کا سب سے پہلا جلوس میں نے سپاٹوں میں دیکھا۔سپاٹوں ہند کا پرانا دار الخلافہ ہے۔شملہ سے تقریباً ۲۰ر میل کے فاصلے پر واقع ہے۔اور میرا عزیز وطن ہے۔مجھے فخر ہے کہ اس چھوٹے سے شہر میں بھی امام مظلوم کا تعزیہ برآمد ہوتا تھا۔سینہ زنی ہوتی تھی اور جلوس کمپنی باغ کی کربلا میں جاکر ختم ہوتا تھا کمپنی باغ حقیر کی میراث ہے۔اور کربلا اس کے اندر ہی واقع ہے۔میں اب بھی ہر سال اس کی صفائی کرواتا ہوں۔اس کی دیکھ بھال کرتا ہوں اور اکثر تنہائی کے عالم میں اپنی جبین اس بارگاہ عالی میں جھکا دیتا ہوں۔جس کا عالم انسانیت پر احسان ہے۔(شملہ کا محرم از امر چند شرما، سرفراز محرم نمبر ۱۳۸۴ھ صفحہ ۸۰)

۸۔ گجرات اور راجستھان: ساحل گجرات کی بندرگاہوں پر مسلمان تاجر زمانہ قدیم سے آتے رہے ہیں۔انھوں نے یہاں مستقل سکونت بھی اختیار کرلی تھی۔ان تاجروں کے علاوہ چند اسلامی مبلغین بھی اس راستے سے ہندوستان آئے جن میں سب سے پہلا نام ایک بوہرہ داعی کا ملتا ہے۔جنھیں بعض کتابوں میں عبداللہ اور بعض کتابوں میں محمد لکھا گیا ہے۔یہ پہلے کھمبایت آئے پھر راجہ سدھ راج جے سنگھ کے زمانہ میں پٹن گئے۔اور وہاں بادشاہ کے علاوہ بہت سی نیچ قومیں مثلاً کنبی، کہار اور کولی وغیرہ کو مسلمان بنایا (آب کوثر صفحہ ۳۷۔۳۷۱) ان نومسلموں میں خوجے، بوہرے اور میمن شامل ہیں اسماعیلیہ مذہب کے داعی نورالدین یا نور شاہ کا نام بھی اس

سلسلے میں خاص طور پر لیا جاتا ہے۔ جو کچھ عرصے کے لیے گجرات کے دارالخلافہ پٹن میں آئے اور پھر ایران چلے گئے۔ آغا خانیوں کے ایک اور داعی صدرالدین کے ہاتھوں پر بھی بہت ہندوستانی مسلمان ہوئے۔ بہاولپور گزیٹیئر کے مطابق سید صدرالدین کا سلسلہ امام حسینؑ سے تیئسویں پشت میں مل جاتا ہے۔ ان کے بیٹے سیّد کبیرالدین حسن عرف حسن دریا کے متعلق مشہور تھا کہ جس ہندو پر ان کی نظر پڑ جاتی تھی وہ مسلمان ہونے کے لیے بے قرار ہو جاتا تھا۔ (ایضاً ۳۹۳ آب کوثر صفحہ ۳۷۰۔۳۷۱)

''حسن دریا'' سہروردی سلسلے کے ذکر و مشاغل میں مصروف رہے۔ اسی کی تلقین اور ارشاد فرماتے رہے۔ مگر آپ کی اولاد کا مذہب اثنا عشری ہے ...... اسی طرح شیعہ بوہرے بھی گجرات میں تجارت کرتے تھے۔ اس وجہ سے گجرات میں عزاداری کے آثار مل جاتے ہیں خصوصاً شہرِ کھمبات گجرات میں عزاداری کا خاص مرکز رہا ہے۔ چونکہ یہاں کے نواب بھی شیعہ مسلک رکھتے تھے۔ لہٰذا محرم کا چاند نمودار ہوتے ہی دو علم' طلائی طغرے اور چار خالص چاندی کے' بارہ تانبے کے نواب مرزا جعفر علی خاں کی جانب سے نکلتے تھے۔ اور ان علموں کو نواب کے شیعہ ملازمین اٹھاتے تھے۔ یہ علم امام باڑے سے نکال کر دیوان خانۂ خاص میں لائے جاتے تھے۔ وہاں ایک بہت بڑی ضریح رکھی ہوتی تھی اس کے سامنے فارسی میں روضہ خوانی ہوتی تھی اور اس کے بعد شربت تقسیم ہوتا تھا۔ پھر علموں کو نواب کی والدہ کے مکان میں لے جایا جاتا تھا۔ وہاں بھی مجلس ہوتی تھی۔ ان علموں کے ساتھ ایک خاص قسم کا علم ہوتا تھا۔ جس میں اکثر تبرکات انبیاء اور آئمہ طاہرین کے نقشے ہوتے تھے۔ اس کو درویش اٹھاتے تھے اور اسکے آگے سینہ زنی ہوتی تھی۔ چوتھی محرم کو نواب ہر امام باڑے میں زیارت کے لیے تشریف لے جاتے تھے اور ہر تعزیہ خانہ میں تبرک رکھتے تھے۔ پانچویں کو خود نواب دیوان خانے میں تشریف لاتے اور مجلس عزا میں شریک ہوتے سات محرم کو مہندی اٹھتی تھی۔ آٹھ کو نواب سیاہ پوش ہو کر پابرہنہ اپنی والدہ کے مکان پر تشریف لاتے جہاں عربی و فارسی میں مجالس ہوتیں۔ ۹ ر تاریخ سے نواب علموں کے ہمراہ چلتے تھے۔ اور تمام شرکائے جلوس سیاہ پوش ہوتے صبح عاشور تمام شیعہ اپنے اپنے اما[illegible]ں میں الوداع پڑھ کر نارنگ سیر کے تالاب پر تعزیے دفن کر دیتے۔'' (ماہنامہ شیعہ فروری ۱۹۱۲ء)

راجستھان میں بھی عزاداری کا یہی عالم تھا۔ مہارانا والئی میواڑ جو ہندوا سورج کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ شب عاشور سر و پابرہنہ نکلتے اور ہر تعزیے پر نقدی چڑھایا کرتے تھے۔ مہارانا فتح سنگھ اور میواڑ کے تمام راجپوت جاگیردار نقد و شربت اور کھانا پکوا کر تعزیے کی نذر کرتے تھے۔ (ماہنامہ شیعہ۔ مئی ۱۹۱۲ء صفحہ۔ ۲۱)

بڑودہ : بڑودہ بھی عزاداری کی تاریخ میں قابل ذکر سمجھا جا سکتا تھا۔ بڑودہ کے ہندو راجہ بذات خود اس میں دلچسپی لیتے تھے۔ یہی حال جے پور کا تھا۔

۹۔ مدھیہ پردیش : بھوپال، گوالیار، جھانسی اور برھانپور وغیرہ

چونکہ **بھوپال** کے نواب مذہب اہل سنت والجماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ لہٰذا بھوپال کی قدیم تاریخ میں شیعیت اور عزاداری کے آثار کہیں دکھائی نہیں دیتے البتہ ۱۷۲۲ء میں ایک افغان سردار دوست محمد خاں نے قلعہ فتح گڈھ کی بنیاد رکھتے ہوئے جو شہر پناہ تعمیر کروائی تھی۔ اسی شہر پناہ کی فصیل کے مختلف دروازوں میں سے ایک دروازے کو جو قلعہ سے متصل تھا ''امامی دروازہ'' کہا جاتا تھا۔ جس کے متعلق مشہور ہے کہ اس دروازے پر ہر سال دسویں محرم الحرام کو اس نئی بستی کی مختصر آبادی کے لوگ اپنے اپنے تعزیئے لا کر جمع کرتے تھے اور یہاں سے کربلا جاتے تھے یہ کربلا بھوپال کے مغربی حدود پر تالاب کے کنارے تعزیہ سرائے کے نام سے مشہور تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بھوپال مین عزاداری ہوتی ضرور تھی۔ البتہ شیعوں کے امام باڑے بہت کم تھے۔ صرف ایک امام باڑہ جو خیر اللہ حسینی کے امام بارے کے نام سے مشہور ہے کا ذکر ملتا ہے۔ یہ غالباً ۱۸۱۲ء میں محاصرہ بھوپال کے معرکے میں موجود تھے۔ اور شیخ امان اللہ حسینی کے بیٹے تھے۔ جو ۱۸۰۰ء میں گلبرگہ سے آئے تھے۔ اس کے علاوہ ۱۸۱۵ء کے قریب میر غلام علی کا تعزیہ دھوم سے نکلتا تھا جسے ریاست کے وزیر خاص حکیم شہزاد مسیح سر و پابرہنہ اپنے ہاتھ سے ڈوری پکڑ کر امامی دروازے تک لاتے تھے۔ اس کے بعد حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ ایک عرصۂ دراز تک بھوپال میں عزاداری نہ ہو سکی۔ اور اگر ہوتی بھی تو چوری چھپے۔ یہاں تک کہ ۱۹۵۷ء میں بھوپال میں جمہوری

حکومت قائم ہوگئی۔تب پہلا جلوس عزا نکالا گیا۔(کاروانِ حیات شہید اعظم نمبر صفحہ۔۲۸۱) لوگوں نے اسے پہلے تو حیرت سے دیکھا پھر اس پیغام پر لبیک کہہ دیا۔

گوالیار: گوالیار کے ہندو مہاراجہ اہل بیتِ رسول اور خصوصاً امام حسینؑ سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔اس لیے ہر سال عشرۂ محرم بڑی دھوم دھام سے ریاست بھر میں منایا جاتا تھا مہاراجہ بہ نفس نفیس جلوس محرم میں حصہ لیتے مجالس عزا برپا کرتے اور تبرک تقسیم کرواتے۔

جھانسی کی رانی لکشمی بائی بھی یوم عاشور کو ہر سال بڑے خلوص، عقیدت و احترام کے ساتھ مجلس عزا برپا کرتی تھیں مہارانی لکشمی بائی کی قائم کردہ مجلس اب تک جھانسی پولس کوتوالی میں منعقد کرتی ہے۔جہاں پہلے اس بہادر رانی کا محل تھا۔جس نے امام حسینؑ سے حق پر ڈٹے رہنے کا سبق حاصل کیا تھا۔

مدھیہ پردیش کے ایک اور علاقے گونڈوانہ کے ضلع بیتول میں بھی بلگرامی سیّدوں کے آباد ہونے کی وجہ سے عزاداری کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔خصوصاً او بھاریہ نامی قصبہ میں ہریجن اور دیگر ہندو حضرات امام حسینؑ سے بے پناہ عقیدت و محبت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اور اپنے اہم اور ضروری کاموں میں کامیابی کے لیے حسینؑ بابا کا تعزیہ اٹھانے کی منت مانتے ہیں۔او بھاریہ میں سیّدوں کا ایک امام باڑہ بھی ہے۔جہاں دو علم کربلائی ہیں۔ایام محرم میں باقاعدہ دس دن مجالسِ عزا برپا ہوتی ہیں۔جن میں ہریجن اور آدیباسی کثرت سے شرکت کرتے ہیں۔۷ر محرم کو مہندی اٹھائی جاتی ہے۔۸ر محرم کی صبح تمام تعزیے علم اور مہندی وغیرہ امام باڑے کے صحن میں سجائے جاتے ہیں۔عاشور کو جلوس عزا برآمد ہوتا ہے۔دوران گشت میر انیس کا مرثیہ پڑھا جاتا ہے۔یہ جلوس کربلا گھاٹ پہنچتا ہے۔تو سادات بعدِ نماز نوحہ خوانی اور ماتم کے بعد علم بڑھا دیئے جاتے ہیں۔

بھرت پور کی ریاست میں سادات کی آبادیوں کے باعث محرم میں عزاداری کا خاص اہتمام ملتا ہے۔خصوصاً پہرسر کے سادات جعفری اس ضمن میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔

۱۰ ۔ بنگال و بہار: بنگال و بہار کے علاقے میں اسلام شیخ جلال الدین تبریزی کے ساتھ پہنچا۔یہ بزرگ ایرانی النسل تھے۔اور سیر العارفین کے مصنف کے مطابق حضرت نے اس جگہ بہت سے غیر مسلموں کو مسلمان کیا لیکن مذہب شیعہ نے وہاں اٹھارویں صدی میں فروغ پایا۔جب اورنگ زیب کے معتمد اور محبوب دیوان بنگالہ مرشد قلی خان نے خود مختاری کا اعلان کردیا۔اور بنگال، بہار، اڑیسہ خصوصاً مرشد آباد، عظیم آباد، جہانگیر نگر (ڈھاکہ) وغیرہ کے علاقے اس کی حکومت میں شامل ہوگئے۔(رود کوثر صفحہ۔۶۰۱) اس علاقے کے اکثر نواب شیعہ مسلک رکھتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ بنگال اور بہار میں ایک عرصہ سے عزاداری کا رواج عام ہے۔بنگال میں شیعیت اور عزاداری کے فروغ کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ شیعوں کا تجارتی کاروبار میں بڑا عمل دخل تھا۔بالخصوص سورت اور ہگلی کی بحری تجارت میں انکا زبردست حصہ تھا۔سورت میں بوہرے اور خوجے تجارت میں پیش پیش تھے تو بنگال میں شیرازی اور اصفہانی تاجر خاندانوں کی کمی نہ تھی۔جنھوں نے وہاں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔اٹھارویں صدی کے ان تاجروں میں حاجی محمد محسن جو ایرانی تھے کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ان کی فیاضی اور مخیرانہ کارگزاریوں نے بنگال میں شیعیت کو کافی تقویت پہنچائی۔انھوں نے اپنی جائداد جو تقریباً ۴۵ر ہزار کی سالانہ آمدنی رکھتی تھی۔تمام کی تمام امور خیر کے لیے وقف کردی تھی۔حاجی محمد محسن نے جائداد وقف کرتے وقت اس کی سالانہ آمدنی کے نو حصے کیے تھے۔ان میں سے تین حصے امام باڑہ ہگلی کی نگہداشت، مجالس محرم اور دوسرے مراسم کے اخراجات اور فاتحہ خوانی کے لیے تھے۔(رود کوثر صفحہ۔۲۰۴۰ تا ۲۰۶)

حاجی محمد محسن کی وجہ سے بنگال کے اکثر سنی شیعہ ہوگئے۔جس کا اعتراف کرتے ہوئے صاحب طبقات محسنیہ رقم طراز ہے۔

"در عقائد مذہبی طبعش بسوئے مذہب جعفری خیلی متوجہ بود۔اکثرے سنیاں
کہ ملازم او بودند۔حسب ہدایت و فرمائش مذہب امامیہ اختیار کردند۔ازاں
گروہ رجب علی خاں، و شاکر خاں متولیان سابق بودند کہ شیعہ شدند"۔

لکھنؤ کے فروغ سے پہلے جب دہلی نادر اور درانی حملوں کا شکار ہوئی تو اہل علم کے لیے اس علاقے نے ایک زبردست جائے پناہ کا کام دیا۔خصوصاً مرشد آباد کو شمالی ہندوستان میں اہم

شیعہ ثقافتی مرکز کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ ناظم بنگال میر قاسم نے بہت سے شیعہ علماء کو وظائف اور زمینیں عطا کی تھیں جن میں شیخ محمد حسن کا نام سرفہرست ہے۔

اس کے علاوہ غلام حسین خان طباطبائی نے بہت سے شیعہ علماء و مشائخ کا تذکرہ کیا ہے۔ مثلاً علیم اللہ طباطبائی شاہ حیدری جنھوں نے ایک رئیس محمد غوث خاں کو شیعہ کیا۔ سید محمد علی جنھوں نے منطقی عربی میں قدیم محققین عرفاء کے طریقے پر حضرت پنجتن پاک کے حالات لکھے۔ اور مُلّا محسن کاستی مولوی نصیر داؤد علی خاں محمد حسین خاں، قاضی غلام مظفر، (داروغۂ عدالت علی وردی خاں) (رود کوثر صفحہ ۶۰۲)

خود علی وردی خاں مذہبی امور میں خصوصی دل چسپی رکھتا تھا۔ اور اپنے نظام اوقات میں اس نے علمی مجالس کے لیے بھی کچھ وقت مقرر کر دیا تھا۔ جب وہ عصر کی نماز سے فارغ ہوتا تو علمی اور دینی مجلس برپا ہوتی جس میں اس دور کے ممتاز شیعہ علماء شرکت کرتے۔ مولف سیر المتاخرین نے ان میں سے سید محمد علی نقی قلی خاں، کلیم ہادی خاں مرزا محمد حسین مغوی وغیرہ کا خاص طور پر ذکر کیا ہے شیخ محمد اکرام سید المتاخرین کے حوالے سے اس مجلس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"سید محمد علی کا اس محل میں جو احترام ہوتا وہ دیکھنے کی چیز ہے دیوان خانہ میں ناظم کی مسند کے بالمقابل ان کے لیے مستقل مسند رکھی تھی۔ جس پر ایک بڑا تکیہ پڑا رہتا۔ جب وہ باہر کے دروازے میں داخل ہوتے اور چبوترے پر قدم رکھتے، علی وردی خاں اپنی مسند پر کھڑا ہو جاتا اور جب وہ چبوترے اور صحن کا فاصلہ طے کر کے وسیع ایوان عمارت میں داخل ہوتے تو بعد و فاصلہ کے باوجود علی وردی خاں مسند سے اتر کر ان کو باادب سلام کرتا۔ وہ جواب دیتے اور اپنی مسند معینہ پر جا بیٹھتے اس وقت علی وردی خاں اپنے پہلو سے ایک تکیہ کو چک ان کی خدمت میں پیش کرتا۔ پھر علماء کے لیے حقے لائے جاتے اور ابتدائی مراسم ختم ہو جاتے تو فاضل ملتانی...... (جس کا نام مولف کو یاد نہیں رہا) کے سامنے ایک نہایت اہم کتاب رکھی جاتی۔ وہ اس میں سے چند اجزاء پڑھتے جن کی تشریح و تفہیم سید محمد علی قائم کرتے رہے پھر سید محمد علی رخصت ہوتے اور اسی احترام و مراسم کے ساتھ جن سے ان کا خیر مقدم ہوا تھا علی وردی خاں انھیں خیر باد کہتا۔ آہستہ آہستہ دوسرے علماء تشریف لے جاتے اور یہ مجلس

ختم ہوتی۔" (رود کوثر صفحہ ۶۱۳)

عظیم آباد: اسی طرح مرشد آباد کے بعد عظیم آباد شیعی مرکزیت کا حامل ہوگیا۔ یہاں بھی کئی شیعہ خاندان آباد ہوگئے۔ نامور شیعہ ادباء و شعراء مثلاً نواب علی ابراہیم خاں عظیم آبادی شاد عظیم آبادی، غلام حسین طباطبائی، (سیر المتاخرین) راسخ عظیم آبادی، صفیر بلگرامی، میر وزیر علی عبرتی، شاہ فرزند علی صوفی، سیّد شاہ امین، احمد فردوسی شوق، حسین علی عاشق (مؤلف تذکرۂ نشتر عشق) وغیرہ اسی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں۔ (ایضاً)

تقسیم ہند تک عزاداری کا یہ سلسلہ بڑے اہتمام سے جاری رہا۔ قیام پاکستان کے بعد جب اکثر شیعہ ہجرت کر گئے تو بہار و بنگال میں شیعوں کی تعداد گھٹ گئی۔ لیکن اس کے باوجود بھی عزاداری کی شان باقی رہی۔ خاص طور پر ضلع مونگھیر کے بعض قصبہ جات میں جہاں سیّدوں کی آبادی ہے اب بھی محرم کی تقریبات میں جوش و خروش پایا جاتا ہے محرم کا چاند دیکھتے ہی لوگ سیاہ پوشی اختیار کر لیتے ہیں۔ شیخوپورہ نامی قصبہ میں علم اٹھنے سے قبل شیعہ اپنے اپنے گھروں سے سروپا برہنہ آستین چڑھی ہوئی، گریبان کھلا ہوا، سوگوانہ انداز سے نکلتے ہیں عورتیں خدا حافظ کہہ کے بوڑھے، جوان، سب ہی کو رخصت کرتی ہیں۔ یہ ماتم دار کشتری میدان سے علم حضرت عباس بلند کر کے جلوس کی شکل میں مختلف راستوں سے گزر کر امام باڑہ نواب تفضل حسین خاں تک پہونچتے ہیں۔ درمیان راہ جگہ جگہ پر اردو، ہندی، اور بنگلہ وغیرہ میں واقعات کربلا بیان کیے جاتے ہیں۔ ہندو بڑی عقیدت سے ماتمی دستوں کو کیوڑہ اور گلاب پیش کرتے ہیں۔

(کاروان حیات صفحہ ۶۳)

قصبہ کھجوہ: قصبہ کھجوہ کے شیعوں کی دینی خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں سے شیعوں کا ایک مستقل رسالہ "اصلاح" نکلتا ہے جس نے فقہ و ادب میں اپنی خدمات سے جو اضافہ کیا ہے وہ قابل قدر ہے۔

پٹنہ اور گیا میں بھی شیعوں کے ساتھ ساتھ سنی بھی عزاداری میں شریک ہوتے ڈھاکہ!

مرشد علی خاں کے زمانے ہی سے شیعیت اور عزاداری میں شریک ہوتے ہیں ویسے عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سترھویں صدی کے آخر میں میر محمد مقیم (صوبیدار امیر پل نوارہ ۱۶۶۰ء ۱۶۶۳ء) نے ایک وسیع و عریض کٹرہ تعمیر کروایا تھا۔ جو آج بھی مقیم کٹرہ کے نام سے مشہور ہے۔ ڈھاکہ میں عزاداری اسی وقت سے شروع ہوئی بعضوں کا خیال ہے کہ انھوں نے حسینی دالان تعمیر کرایا تھا۔ جو کسی زمانہ میں مجالس محرم کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ (ایضاً۔ ڈھاکے کا محرم الحرام صفحہ ۵۸)

ڈھاکہ: (جو کبھی اکھنڈ ہندوستان کا ایک حصہ تھا) کے محرم کی یہ خصوصیت تھی کہ پورے عشرہ محرم کے دوران نوجوان لڑکوں کے گروہ سبز لباس پہنے اور چاندی کے چمکیلے بٹن لگائے مختلف فرائض ادا کرتے دکھائی دیتے ہیں یہ نوجوان ''دستا'' کہلاتے ہیں یعنی وقف کیے ہوئے نوجوان، ان نوجوان کو ان کے ماں باپ عزاداری کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔

کلکتہ: کلکتہ صوبہ بنگال کا دوسرا اہم شہر ہے جو زمانہ قدیم سے (غالباً سراج الدولہ کے عہد سے) ہر سال محرم میں عزاداری کا مرکز رہا ہے

کلکتہ میں عزاداری ان ایرانی تاجروں کا طفیل ہے جو بغرض تجارت یہاں آئے اور مستقل سکونت پذیر ہو گئے حاجی حسن جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے کے یہاں ایک حسینیہ کی بنیاد رکھی اور اس کے علاوہ اور امام باڑوں کی تعمیر بھی کی جس کے نتیجے میں حاجی کربلائی محمد کا عالی شان امام باڑہ اور اصفہانی کا امام باڑہ معرض وجود میں آئے ایرانیوں کے علاوہ ہندوستانی مسلمانوں نے بھی امام باڑے تعمیر کیے۔ گول کوٹھی اور نذر علی خاں کے اوقاف اور امام باڑہ بی بی انارو اس کا ثبوت ہیں۔

نواب واجد علی شاہ معزولی کے بعد جب مٹیا برج میں مقیم ہوئے تو یہ علاقہ بھی عزاداری میں دوسرا لکھنؤ بن گیا۔ سبطین آباد کے علاوہ متعدد امام باڑے تعمیر ہوئے اودھ کے شاہی خاندان کے ایک فرد قمع قدر نے حضر پور میں ایک حسینیہ تعمیر کرایا تھا۔ جو ٹیٹو کے امام باڑے کے نام سے مشہور ہے۔ انگریزوں کے عہد میں بھی عزاداری بڑی شان و شوکت سے ہوتی تھی۔ کلکتہ میں جلوس ہائے عزا میں تین ماتمی حلقے ہوتے تھے۔ پہلا ایرانی یا مغلوں کا اپنے طرز کی مخصوص نوحہ خوانی اور ماتم کرتے ہوئے، دوسرا کشمیریوں کا اور تیسرا مقامی شیعوں کا جن میں لکھنؤ فیض آباد، جونپور اور نوگانواں سادات کے شیعہ شامل ہوتے تھے۔ (انجمن شمشیر عباسی کا رسالہ حضرت ابوالفضل العباس

نمبر ۱۳۹۱ھ صفحہ ۹۷۱)

جلوس ہائے عزا کی بنیاد مرزا مہدی مشکی کے ہاتھوں پڑی۔ ویسے عشرہ بھر کئی جلوس نکلتے رہتے ہیں۔

۱۱۔ اڑیسہ اور جھار کھنڈ: اڑیسہ جو کسی زمانے میں صوبہ بہار ہی کا ایک حصہ خیال کیا جاتا تھا عزاداری میں پیش پیش تھا۔ خاص طور پر جھاڑ کنڈ کا علاقہ (جو اب ایک الگ ریاست میں تبدیل ہو چکا ہے۔) جہاں کے مہاراجہ شری راجہ ویر وکرم کو گولکنڈہ کے سلطان ابوالحسن تانا شاہ نے ۱۰۵۰ھ میں یہ جاگیر برائے عزاداری بطور معافی عطا کی تھی۔ یہاں ۱۶۳۷ء سے ۱۹۵۱ء تک ریاست کی جانب سے عزاداری ہوتی رہی اور آج بھی جاری ہے۔ اس دوران وہاں بہت سے عاشور خانے تعمیر ہوئے۔ جھاڑ کنڈ ضلع اڑیسہ کی عزاداری کے متعلق سید محمد رضا مدنی تحریر کرتے ہیں۔

''غرۂ محرم سے قبل مستقل امام باڑوں کی صفائی اور قلعی ہوتی تھی۔ چاند رات کو راجہ کے نوبت نقارے، قلعہ کے دروازے کی شہ نشین سے اتار کر ڈیوڑھی کے عاشور خانے میں رکھ دیئے جاتے تھے۔ چاند کا اعلان توپوں کی سلامی سے ہوتا تھا۔ اور راجہ صاحب خود دیوستھان کے نگراں کی معیت میں امام باڑے میں معائنے اور سلامی کے لیے تشریف لاتے تھے فاتحہ خوانی کے بعد علم کا صندوق نکلتا تھا۔ اور چاندی، لوہے، تانبے اور صندل کے پنجے معہ پٹکوں کے جن پر اعلیٰ کار چوبی کا کام ہوتا تھا۔ مختلف عاشور خانے میں رکھے جانے کے لیے دیوستھان کے نگراں کی موجودگی میں تقسیم کر دیئے جاتے تھے۔ اور سونے کا علم قطب شاہی سلطان کی دی ہوئی تلوار اور خود ڈیوڑھی کے عاشور خانے میں جو قلعہ کے پھاٹک ہی سے متصل ہیں رکھے جاتے تھے۔ تقسیم علم کے بعد یہ ساری چیزیں بڑے ساگر میں غوطے کے لیے جلوس کی صورت میں لے جائی جاتی تھیں۔ اور وہاں سے اپنے اپنے عاشور خانے پہنچائی جاتی تھیں۔ دس دن تک مجلسیں اور فاتحہ خوانیاں ہوتی تھیں۔ ان کے لیے تبرک، شکر، اگربتی، موم بتی، گیس کے ہنڈے اور مشعلیں ریاست طرف سے فراہم کی جاتی تھیں۔ ہر عاشور خانے کے لیے ایک امانت دار دو رضا کار جن کو یہاں کی اصلاح میں تمبا کہا

جاتا ہے۔ معیّن کئے جاتے تھے۔ان کا فرض اثار مقدسہ اور زندانوں کی نگرانی ہوتا تھا۔ یہ سلسلہ تین سو سال تک برابر جاری رہا۔" (کاروانِ حیات شہید اعظم نمبر ۱۳۹۱ھ)

سیّد محمد رضا مدنی اس بات کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ عزاداری کا یہ طریقہ دکنی تھا۔ چھٹی محرم سے جلوس کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ ساتویں شب کو جسے وہاں ساتواں خون کہتے ہیں۔ جلوس نکلتے وقت توپیں داغی جاتی تھیں۔ عموماً جلوس ڈیوڑھی کے عاشور خانہ سے برآمد ہوتا۔ یا وہاں شاہی طمطراق کے ساتھ قیام کرتا۔ جلوس کے آگے آگے نشان کا ہاتھی ہوتا تھا۔ ہر جلوس میں نوحہ خوانی و ماتم لازم تھا۔ راجہ صاحب کی طرف سے علم اُٹھانے والوں، تعزیہ اُٹھانے والوں، دُلدل پکڑنے والوں اور نوحہ خوانوں کو ایک دھوتی اور ایک انگوچھا دیا جاتا تھا۔ اس طرح محرم میں سینکڑوں دھوتیاں اور انگوچھے تقسیم ہوجاتے تھے۔ صبح عاشور جلوس کی روانگی سے قبل مہاراجہ اور ان کے خاندان کے افراد ستیہ دھوج کو سلامی دینے آتے۔ علم پر گلاب پاشی کرتے۔ اور نوحہ خوانی اور ماتم شروع ہوتا۔ کربلا پہنچ کر سارے علموں کو الگ الگ چادروں میں میت کی صورت میں لپیٹ دیا جاتا تھا۔ سارے چراغ بجھا دیئے جاتے۔ اور تین سو سالہ پُرانا قطب شاہی نوحہ الوداع اے الوداع شاہِ شہیداں الوداع دہراتے ہوئے اپنی منزل کی طرف جاتے۔

۱۲ ۔ میسور : ریاست میسور جو ۱۶۸۶ء میں مغلیہ اقتدار کے بعد سے ایک نئے صوبے کی تشکیل سے مختلف پرگنوں میں تقسیم ہوگئی۔ ان پرگنوں میں ڈوڈ بالا پور خاص طور پر شیعیت کا مرکز بن گیا۔ کیونکہ اس کے اکثر نواب شیعہ مسلک رکھتے تھے۔ ان نوابوں کے اثر سے میسور میں عزاداری کی روایات کو کافی تقویت پہنچی۔ ڈاکٹر رشید موسوی نے ایک نواب عباس قلی خان ۱۷۱۹ء کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ جس نے سرا میں ایک امام باڑہ تعمیر کرایا تھا۔ (دکن میں مرثیہ اور عزاداری صفحہ ۸۲) اس کے بعد جب حیدر علی نے ۱۷۶۱ء میں سلطنت خداداد کی بنیاد رکھی تو چونکہ وہ خود اور اس کا بیٹا ٹیپو سلطان شیعہ مسلک رکھتے تھے۔ لہٰذا ان کے دربار میں کئی ایرانی علماء ملازم ہوگئے۔ جن میں نواب میر غلام علی خاں مشہدی 'وزیر و سفیر' میر محمد صادق، وزیر اعلیٰ میر سجاد علی فیاضی، میر غضنفر علی فیاضی، اور میر عسکر علی فیاضی مشہور ہیں۔ ان تینوں نے سرنگاپٹن میں امام باڑے

بنوائے تھے۔ جن کا خرچ شاہی خزانے سے ملا کرتا تھا۔ (بحوالہ مولوی نذیر احمد میسور)

میسور میں آباد ایرانی خاندانوں میں عام طور پر شہادت نامے پڑھے جاتے اور روضہ خوانی کا رواج عام تھا۔ جس میں ولی کی روضۃ الشہداء پڑھی جاتی تھی۔ بعد میں اردو مرثیے بھی پڑھے جانے لگے۔

میسور کی موجودہ عزاداری کے متعلق ڈاکٹر رشید موسوی لکھتی ہیں: "موجودہ زمانے میں ہر سال محرم میں حضرت قاسمؑ کا علم ایستاد کیا جاتا ہے۔ اور ساتویں محرم کو علم کی سواری اُٹھائی جاتی ہے جس میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ شریک ہوتے ہیں۔ امام حسینؑ کے گھوڑے ذوالجناح کے نام سے ایک گھوڑے کو موسوم کرکے دسویں محرم کو گشت کرایا جاتا ہے۔ عام طور پر محرم کا چاند نظر آتے ہی تمام عزادار عاشور خانوں سے اپنے سروں پر علم مبارک کے صندوقچے اُٹھائے درد بھرے انداز میں سوز پڑھتے ہوئے نکلتے ہیں۔ اور گشت کرتے ہیں پانچویں محرم کو حضرت علی اکبرؑ کی سواری نکلتی ہے۔ اور علم کا گشت ہوتا ہے۔ ساتویں کو سبیلیں پڑھتے ہوئے جلوس ماتم نکلتا ہے۔" (دکن میں مرثیہ اور عزاداری صفحہ ۸۸۔۸۹)

۱۳ ۔ مہاراشٹر: ریاست مہاراشٹر کی تشکیل سے قبل اس کے اکثر علاقے یا تو آصف جاہی سلطنت میں شامل تھے یا پھر کرناٹک یا مدھیہ پردیش کا حصہ تھے۔ مثلاً اورنگ آباد، برار اور خاندیش اور احمد نگر یا بیجاپور کا علاقہ جہاں قطب شاہی، نظام شاہی، عادل شاہی اور برید شاہی حکومتوں کے زمانے سے ہی عزاداری بڑی دھوم دھام سے کی جاتی تھی۔ خصوصاً احمد نگر اور بیجاپور میں۔ البتہ اورنگ آباد میں اورنگ زیب کے تسلط کے بعد اس کا زور کم ہوتا دکھائی دیتا ہے کیونکہ یہاں اکثر شیعہ شاہی عتاب کے خوف سے یا تو برہان پور اور احمد آباد کی طرف ہجرت کر گئے یا پھر تقیہ میں چلے گئے۔ کوکن کے مسلمانوں میں وہ اہلِ کوفہ شامل تھے جو مختار ثقفی کے دور میں کوفہ سے ہندستان آکر پناہ گزین ہوئے اور پھر یہیں آباد ہوگئے یا پھر کچھ اہلِ ہنود جنھوں نے ذات پات کے نظام سے بے زار ہوکر اسلام قبول کرلیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں عزاداری نہ ہونے کے برابر ہے۔ البتہ وہ سنی کوکنی مسلمان جو محبانِ آلِ رسولؐ تھے اپنے گھروں میں دس دن تک روضۃ الشہدا

کی مجالس خوانی کرتے تھے اور یوں امام حسین کا غم مناتے تھے۔ اور آج بھی چند ایسے گھرانے موجود ہیں۔ ان میں کچھ تعزیہ داری بھی کرتے ہیں اور سبیلیں بھی لگاتے ہیں۔ ناگپور علاقہ پہلے مدھیہ پردیش میں شامل تھا۔ البتہ یہاں بھی اور خاص طور پر اس کے نواح کامٹی میں چند شیعہ سادات اور خصوصاً حیدری برادران نہ صرف یہ کہ مسالمے اور مقاصدے منعقد کرتے ہیں بلکہ اسی عقیدت واحترام کے ساتھ مجالسِ عزا بھی برپا کرتے ہیں۔ اور دیگر مراسمِ عزاداری کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ پونے اور اس کے قصبات مثلاً منچر، جنیر وغیرہ میں شیعہ سادات جعفری کے چند محلے آباد ہیں جو زور شور سے عزاداری کرتے ہیں۔ پونہ میں ایرانیوں اور شیعہ بلوچیوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے اور یہاں بھی عزاداری عقیدت کے ساتھ کی جاتی ہے۔ مگر جو تزک واحتشام اور جوش وخروش عروس البلاد ممبئی میں نظر آتا ہے اسے دیکھتے ہوئے اس شہر کو لکھنؤ کے بعد عزاداری کا سب سے بڑا مرکز کہا جاسکتا ہے۔

ممبئی:

یوں تو ممبئی میں عزاداری شروع سے ہی کی جاتی رہی ہے گجرات کی تاجر پیشہ قومیں مثلاً بوہرہ، خوجہ اور شیعہ چلیا شروع ہی سے عزاداری کرتے رہے ہیں لیکن شمالی ہند کے مختلف شہروں اور ہندستان بھر سے آکر آباد ہو جانے والے شیعہ سادات کی وجہ سے یہاں عزاداری نے گزشتہ پچاس برسوں میں کافی ترقی کی ہے۔ عزاداری کے فروغ کا سہرا خطیب اہلِ بیت مولانا عباس رضوی کے سر باندھا جاسکتا ہے۔ جنھوں نے سیاسی وسماجی سطح پر اتحاد بین المسلمین کی کوشش عزاداری کے وسیلے سے کی اور سنی اور شیعہ دونوں کو اس میں شریک کرنے میں کامیاب ہوئے۔ لکھنؤ اور دیگر شہروں کے ممتاز اور جید شیعہ علما اور ذاکرین ہر سال بمبئی آتے رہے ہیں۔ جن میں مولانا سید محمد دہلوی، مولانا شمس الحسن گوولی سادات، مولانا ابنِ حسن جارچوی، مولانا فیاض حسین ولید پوری، کفن صاحب، مولانا غلام عسکری، مظفر حسین طاہر جرولی، مولانا فیروز حیدر نوگانوی کے علاوہ فی الحال آقا رضا اور مولانا مرزا محمد اطہر، مولانا شوکت عباس، مولانا جعفر عباس وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ مجلسوں کا یہ سلسلہ مختلف مساجد اور امام باڑوں میں اوقات

کی تقسیم کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ امامیہ مسجد جو شیعہ اثنا عشری حضرات کے چندوں سے تعمیر کی گئی ہے اور مسجد فنڈ بھی کہلاتی ہے۔ اس کے علاوہ مسجد ایرانیان یا مغل مسجد، اثنا عشری خوجہ حضرات کی تعمیر کردہ خوجہ مسجد اور محفلِ خراسان، اختر رضوی بلڈر کا تعمیر کردہ امامباڑہ زینبیہ جس کا پرانا نام امامباڑہ ببر علی تھا، شوستری کا امام باڑہ، باقریہ امام باڑہ، یعقوب گلی اور امین کا امامباڑہ وغیرہ وہ مراکز ہیں جہاں مجالس وماتم کا بھرپور انتظام کیا جاتا ہے۔ ان مجالس کا سلسلہ چہلم تک جاری رہتا ہے۔ دس دن تک مذکورہ امامباڑوں میں مجلس ہوتی ہے۔ پھر ذاتی طور پر شیعہ حضرات اپنے گھروں میں بھی علم سجاتے ہیں۔ تابوت اٹھاتے ہیں۔ تعزیے اور ضریحیں رکھتے ہیں او رمجالس منعقد کرتے ہیں۔ ساتویں کو بی۔ آئی۔ ٹی بلاکس بھنڈی بازار سے سابق صحافی اقبال ناطق کے گھر سے مہندی کا جلوس اٹھتا ہے جس میں تمام ماتمی انجمنیں شرکت کرتی ہیں۔ آٹھویں محرم کو شوستری کے امامباڑے میں مخصوص مجلس ہوتی ہے۔ نویں کو ایک شان دار جلوسِ عزا نکالا جاتا ہے۔ شب عاشور میں امین کے امام باڑے میں زبردست ماتمی مظاہرہ ہوتا ہے اور ایرانی حضرات کربلا کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ عاشور کو پھر پورے شہر کی ماتمی انجمنیں ایک بہت بڑا جلوس نکالتی ہیں جس کا اختتام رحمت آباد پر ہوتا ہے۔ جہاں مولانا مرزا محمد اطہر شام غریباں کی مجلس پڑھتے ہیں اور شہیدانِ کربلا کے غم میں زبردست ماتم ہوتا ہے۔ بیرولین پٹھان باڑی سے بھی ایک جلوس نکلتا ہے۔

شیعہ گلی محلوں کے علاوہ سنی حضرات اور بوہرہ حضرات وغیرہ بھی جگہ جگہ سبیلیں لگاتے ہیں اور شربت اور تبرک تقسیم کرتے ہیں۔ شہر کے مختلف مضافات مثلاً گھاٹ کوپر، کرلا، وکرولی، چمبور، سانتا کروز، اندھیری، جوگیشوری، ملاڈ، کھار، باندرہ، ممبرا وغیرہ سے ماتمی دستے جلوس کی شکل میں علم اٹھائے ہوئے نکلتے ہیں۔ اس شہر میں بہت سی ماتمی انجمنیں بھی ہیں۔ مثلاً انجمن جاں نثارانِ خدام حسینی، انجمن عزادارانِ حسینی، انجمن معصومین، انجمن ساداتِ جعفری، منچر وجنیر، انجمن نوگانواں سادات وغیرہ وغیرہ۔ غرضیکہ ممبئی کا محرم اپنی جگہ پر ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے اور وہ دن دور نہیں جب آنے والے وقت کا مورخ لکھنؤ کے بدلے تاریخ میں ممبئی کو ہندستان میں عزاداری کا بڑا مرکز تحریر کرے گا۔

۱۴۔ مدراس : شہر مدراس میں شروع ہی سے شیعوں کی اچھی خاصی آبادی موجود ہے۔ سترھویں صدی کی ابتداء میں جب کرناٹک مغلوں کی سلطنت کا جزو بنا اور ۱۱۰۰ھ سعادت اللہ خاں یہاں کے صوبیدار مقرر ہوئے تو اسی زمانے سے مرثیہ گوئی اور عزاداری نے فروغ پایا وہاں بھی مجالس عزا میں زیادہ تر روضۃ الشہداء ہی پڑھی جاتی تھی۔ کہیں کہیں فارسی میں روضہ خوانی بھی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی مقامی شاعروں کے مرثیے بھی پڑھے جاتے تھے۔ مراسم عزاداری عام طور پر دکنی طرز پر ہی ہوتے تھے۔ (دکن میں مرثیہ اور عزاداری صفحہ۔ ۸۹۔ ۸۸)

یہاں محرم کا سب سے اہم جلوس ساتویں محرم کو نکلتا ہے۔ جو آستانۂ قاسمیہ کوچہ اکبر صاحب سے بعد ظہر علم مبارک کے ساتھ نکل کر مشہور سڑکوں پر سے گزرتے ہوئے دوبارہ وہیں واپس آتا ہے۔ روز عاشور تمام شیعہ آستانۂ حضرت عباسؑ میں جمع ہوتے ہیں۔ ایک ماتمی جلوس امام آباد کوچہ جان جہاں خاں سے صبح دس بجے سے نکل کر اسی آستانے میں پہنچتا ہے۔ گیارہ محرم کی شب میں حسینی ٹرسٹ مدراس کی جانب سے یوم الحسین منایا جاتا ہے۔ اس میں انگریزی، تامل اور اردو میں واقعات کربلا بیان کئے جاتے ہیں۔ جس میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو اور عیسائی بھی شرکت کرتے ہیں۔ (کاروان حیات صفحہ۔ ۹۹ شہید اعظم نمبر)

غرض کہ ایرانیوں کے ہندوستان میں قدم رکھتے ہی شیعیت نے بھی ہندوستان میں داخلہ لے لیا تھا۔ اور پھر ایران میں تہذیبی اثرات کا ہندوستانی سماج پر جو غلبہ دیکھا گیا ہے۔ وہ کسی ایک شہر تک محدود نہ تھا۔ بلکہ جہاں جہاں ایرانیوں کے قدم گئے وہاں شیعیت بھی گئی۔ ایرانی اثرات ہندوستانی سماج پر دو ہی صورتوں میں ظاہر ہوئے۔ ایک تصوف دوسرے شیعیت۔ شیعیت کی فروغ کی وجہ یہ تھی کہ مغلیہ دربار کے با اقتدار امراء اکثر اسی مسلک کے تھے جو عزاداری سے دلچسپی رکھتے تھے۔ مسلمان بادشاہوں کے سپاہی بھی اکثر شیعہ تھے۔ نیز نوابانِ اودھ، شاہانِ جونپور اور سلاطینِ کشمیر اور فرمانروایانِ دکن نے اس طرف خوب توجہ دی۔ لہٰذا ہندوستان میں شیعیت تیز رفتاری سے پھیلتی چلی گئی۔ دوسرے یہ کہ اس زمانہ میں جو صوفی حضرات تھے۔ ان میں بھی اکثریت سادات کی تھی اور سب ہی خانوادۂ رسول ﷺ سے عقیدت رکھتے تھے۔ ان میں سے بہت سے صوفی تو شیعہ تھے۔ مگر تقیہ میں تھے۔ بہر حال عزاداری اہل بیت ان کا مسلک تھا۔ اور اس کی تشہیر

و تبلیغ ہر حال میں انھوں نے کی۔ اور یوں تصوف کے سہارے بھی حضرت علیؑ سے عقیدت اور اہل بیت سے محبت کا چلن جو شیعیت کی روح ہے باقی رہا۔ بعد میں آگے چل کر جب تصوف نے اسلامی شریعت کا دامن چھوڑا تو اس میں خرافات آگئی۔ جس کی وجہ سے تصوف سے لوگ بدظن ہونے لگے۔ اور اس کا اثر یوں بھی دیرپا ثابت نہ ہو سکا۔ کیوں کہ جب تک سماج انتشار کا شکار رہا۔ اور مایوسی لوگوں کے دلوں میں بسیرا کئے ہوئے تھی۔ تو عوام کا ایک طبقہ تصوف کی طرف راغب ہوا۔ اور دنیا کی بے ثباتی کے احساس نے اسے تصوف میں دلچسپی لینے پر مجبور کیا۔ لیکن جب وقت کے ساتھ ساتھ حالات بدلتے گئے۔ سیاسی انتشار میں ٹھہراؤ آتا گیا۔ تو مایوسی اور نا آسودگی کا احساس بھی لوگوں کے دلوں سے مٹنے لگا اور تصوف سے دلچسپی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج مشکل ہی سے کوئی صوفی ایسا نظر آتا ہے جو عوامی ذہن کو اس طرف راغب کر سکے۔ البتہ شیعیت اب بھی آہستہ آہستہ اپنے اثرات قائم کئے ہوئے ہے۔ اور اٹھارویں صدی میں تو شیعیت اتنی تیزی سے پھیلنے لگی تھی کہ علماء اہل سنت کو خطرہ ہو گیا تھا اسی لیے دانستہ ایسی کتابیں لکھی گئیں جو ردِ شیعیت میں تھیں۔ تاکہ نہ صرف لوگوں کے ذہنوں سے شیعیت کا اثر زائل ہو جائے بلکہ تنفر بھی پیدا ہو۔ محدث دہلوی کی تحفہ اثنا عشری اسی ضمن میں اور اسی ارادہ سے لکھی گئی۔ خود شاہ صاحب کے خاندان کے ایک فرد قمر الدین منت (بقول شیخ محمد اکرام) شیعہ مسلک اختیار کر چکے تھے۔ شاہ صاحب خود اس کتاب کے دیباچہ میں وجہ تالیف پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"اس رسالے کی تالیف و تصنیف کی غرض یہ ہے کہ ان شہروں میں جن میں ہم اقامت پذیر ہیں۔ اور اس زمانہ میں جس میں ہم بقید حیات ہیں مذہب اثنا عشریہ کا رواج اور اس کی شہرت اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ مشکل سے کوئی گھر ایسا ہوگا جس میں ایک یا دو آدمی اس مذہب کے حلقہ بگوش نہ بن گئے ہوں۔ یا وہ اس کے عقیدے کی طرف مائل نہ ہوں۔"

(تحفۂ اثنا عشریہ صفحہ۔ ا دیباچہ)

اس تحریر سے صاف ظاہر ہے کہ یہ کتاب کس مقصد سے لکھی گئی تھی مصنف کا مدعا ہی یہ تھا کہ شیعیت جو اس وقت تیزی سے پھیلتی جا رہی تھی اس کی تبلیغ و تشہیر کو روکا جا سکے اور اہل سنت کو اس بات سے روکنے کے لیے جو کچھ بھی لکھا گیا۔ اس میں مصنف کی تحقیق سے زیادہ ارادہ کو دخل

تھا۔ چنانچہ مولانا الطاف حسین حالی بھی شیعہ سنی مناظروں کا ذمہ دار خاندان ولی اللہی کو قرار دیتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

"ہندوستان کے سنی شیعوں میں مذہبی مناظرے کی ابتدا کچھ شک نہیں کہ اہل سنت کی طرف سے ہوئی تفضیل الشیخین ازالتہ الخفا اور تحفہ اثنا عشریہ سے پہلے جہاں تک ہم کو معلوم ہے کوئی چھیڑ چھاڑ شیعوں کی جانب سے نہیں ہوئی ان کتابوں کی اشاعت سے پہلے دونوں فریق ایک موقع پر شیر و شکر رہتے تھے۔ سنی مجالس عزا میں برابر شریک ہوتے تھے۔ سنیوں کی لڑکیاں شیعہ لڑکوں سے، اور شیعوں کی لڑکیاں سنی لڑکوں سے بیاہی جاتی تھیں سنی قاضی شیعوں کے نکاح پڑھتے تھے۔ دونوں فریق کے آدمی ایک مسجد میں نمازیں ادا کرتے تھے۔ مگر جب سے مذکورہ بالا کتابیں شائع ہوئیں اور مذہبی مناظرے دونوں فرقوں میں شروع ہوئے۔ تب سے وہ میل جول جاتا رہا اور باہمی اتحاد و یگانگت نفرت اور مغایرت کے ساتھ بدل گئی۔" (مقالات حالی حصہ اول ۲۸۰ مطبوعہ جامعہ پریس دہلی ۱۹۳۴ء)

اسی طرح مولوی کرامت علی جونپوری کی دینی خدمات کو بھی دراصل شیعیت کے خلاف پروپگنڈہ سمجھنا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ دونوں حضرات اپنے مقصد میں بہت حد تک کامیاب ہوئے اس کا اعتراف شیخ محمد اکرام نے بھی کیا ہے۔ اور ایسے ہی علماء کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج ہندوستان میں شیعہ مسلمانوں کی تعداد سنیوں سے کم ہے۔ بہر حال جہاں کہیں بھی شیعہ موجود ہیں عزاداری اب بھی موجود ہے۔ کیونکہ شیعیت اور عزاداری لازم و ملزوم ہیں۔ بعض اہل سنت بھی بے شک عزاداری کے قائل ہیں۔ لیکن اسے شیعیت کا اثر ہی کہا جا سکتا ہے۔

ہندوستان میں

شیعیت اور عزاداری

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی

شیعیت اور عزاداری

HINDUSTAN MEIN SHIAT AUR AZADARI

پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی

PROF. RAFIA SHABNAM ABIDI

مصنفہ کی دیگر کتابیں

۱۔ نظر نظر کے چراغ (تنقید)

۲۔ موسم بھیگی آنکھوں کا (شاعری)

۳۔ حرف حرف چہرے (تنقید)

۴۔ انوار سہیلی کی کہانیاں (فارسی سے ترجمہ)

۵۔ ملا وجہی اور انشائیہ (تحقیق و تنقید)

۶۔ سردار جعفری فن اور شخصیت (تنقید)

۷۔ انمول کہانیاں (فارسی سے ترجمہ)

۸۔ اردو شاعری میں تذکرۂ فاطمۃ الزہرہؓ (تحقیق)

۹۔ فارسی ادب کا مطالعہ (فارسی سے ترجمہ)

۱۰۔ میری درس گاہ (مراٹھی سے ترجمہ)

۱۱۔ سلام (مراٹھی سے ترجمہ)

۱۲۔ کرشن چندر ممبئی اور اردو کہانیاں (تحقیق و تنقید)

۱۳۔ معاصر اردو ناول (ترتیب و تالیف)

۱۴۔ نوائے سروش (ترتیب و تالیف)

۱۵۔ مراٹھی ادب۔ ایک مطالعہ (مراٹھی سے ترجمہ)

۱۶۔ علی سردار جعفری۔ ایک مطالعہ (تحقیق و تنقید)

۱۷۔ خواجہ حافظ شیرازی۔ احوال و آثار (تحقیق و تنقید)

۱۸۔ اگلی رت کے آنے تک (شاعری)

۱۹۔ بچوں کے سردار جعفری (بچوں کا ادب)

۲۰۔ بچوں کے یوسف ناظم (بچوں کا ادب)

۲۱۔ اردو شاعری پر شیعی اثرات (زیر طبع)